گیتا اور

شیخ تصدق حسین بی اے ایل ایل بی

بیگماتِ اودھ
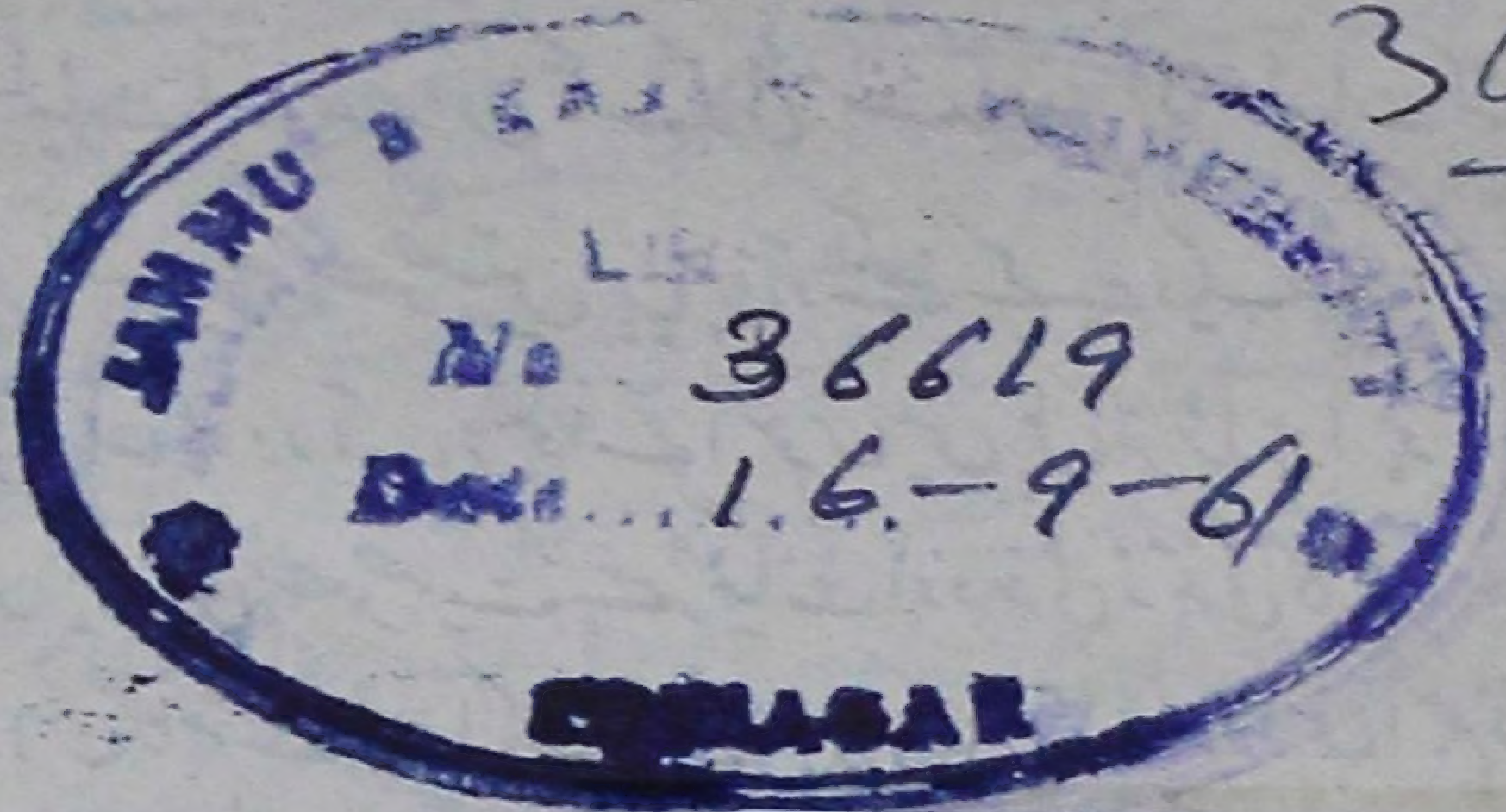
از
شیخ تصدّق حسین
بی اے، ال ال بی

پبلشر
کتاب نگر، دین دیال روڈ
لکھنؤ

پیش لفظ

شیخ ممتاز حسین صاحب جونپوری
مصنف تلمیحات، خطاب اعز، خون شہیداں وغیرہ

دہلی اور بنگال کی بیگمات کے حالات و سرگزشت پر ملک کے مقتدر اہل قلم
بہت کچھ لکھ چکے ہیں لیکن بیگمات اودھ پر آج تک کوئی مستند اور پُر از معلومات کتاب
نہیں لکھی گئی، ان کے حالات میں بعض ایسی خصوصیتیں ہیں جن کو لکھنے کے لیے ایک ایسے اہل قلم کی
ضرورت تھی جو سرزمین لکھنؤ کی فضا اور آب و ہوا کے آغوش میں پل کر بڑا ہوا ہو، اور اس
نے اودھ کی تاریخ کا اور اس میں بھی خصوصیت سے بیگمات اودھ کی زندگی کا گہرا مطالعہ
کیا ہو، قدرت نے شاید اس کام کے لیے ایک وقت معین کیا تھا، اور اس اہم ذمہ داری
کی خدمت انجام دینے کے لیے شیخ تصدق حسین صاحب ایڈوکیٹ لکھنؤ کو منتخب کیا
تھا، موصوف سالہا سال سے اس موضوع پر تاریخی مواد فراہم کرتے اور مضامین شایع
کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے جلد باز مصنفوں کی طرح سے سُنے سُنائے واقعات کو بے سمجھے
بوجھے اکٹھا نہیں کر دیا ہے، نہ اِدھر اُدھر کی لکھی ہوئی باتوں پر بغیر تحقیق کیے ہوئے یقین کر لیا ہے
بلکہ جو کچھ سنا اور دیکھا اُس کی مدتوں مختلف ذرائع سے تصدیق کی ہے۔ جن خاندانوں سے
ان بیگمات کا تعلق تھا اُن کے معمر افراد سے مل کر مستند حالات دریافت کیے ہیں علاوہ

جہاں تک ہو سکا چشم دید گواہوں کے بیانات حاصل کیے ہیں، موصوف کا یہ کارنامہ مہینوں
کا نہیں برسوں کا ریاض ہے۔

اس کتاب کے مصنّف ایک ذی علم، صاحب فہم اور مُسن بزرگ ہیں، انھوں نے اپنی
قیمتی زندگی کا بڑا حصّہ اودھ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے اور اس کے صحیح واقعات اسی خاک
اودھ سے چھان کر نکالنے میں صرف کر دیا ہے، کوئی غیر مقامی مصنّف اودھ کی بیگمات
کی پُر تکلف زندگی، اُن کی خاص سج دھج، چال ڈھال، لب لہجہ اور ہزاروں باتیں جو بیان میں نہیں
آسکتیں جن سے اُن کے کردار و اطوار کا سانچہ بنا تھا، بخوبی سمجھ نہیں سکتا، اور اُن کے
اُصول زندگی کا ڈھانچہ اور اُن کی سیرت کا خاکہ مرتب نہیں کر سکتا۔

شیخ صاحب موصوف کی تحریر میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ نہ تو کسی غرض سے کسی
صحیح واقعے کو نظر انداز کرتے ہیں، نہ اس پر جذبات کا رنگ چڑھا کر اُسے کسی اور طرح پیش کرتے
ہیں، تاریخی واقعات کے بیان میں مصنّف کی سیرت و طبیعت کو بڑا دخل ہوتا ہے، میں کوئی بیس برس
سے اودھ پر موصوف کے تاریخی مضامین دیکھتا اور پڑھتا رہا ہوں، اُن سے اکثر تبادلۂ خیال ہوتا
رہا ہے، تاریخی مضامین کو بے لاگ اور بے کم و کاست پیش کرنے کی جو للک ان کو ہے، اس سے
برابر واقفیت ہوتی رہی ہے، تاریخی مواد کی تصدیق اور جانچ کے لیے جو دوا دوش وہ کرتے ہیں
میں اس سے بھی اکثر باخبر رہا ہوں، ان سب حالات کے مجموعی اثرات کے سلسلے میں جب ان کی اس تصنیف
پر نظر کرتا ہوں تو کہنا پڑتا ہے کہ بیگمات اودھ پر اتنی مفید اور اتنی جامع کتاب لکھنا انھیں کا
حصّہ تھا۔

شیخ صاحب موصوف کا طرز نگارش صاف واضح اور عام فہم ہے، موصوف کو لکھنؤ کی
ٹکسالی زبان میں مطالب ادا کرنے کا خاص سلیقہ ہے، مشہور ہے کہ ٹکسالی اردو بیگمات کی
زبان میں صحت کے ساتھ محفوظ ہے، اور اُن کے مخصوص کلمات اور محاورات کے پردے میں

تمدنی اور معاشرتی زندگی کے بہت سے پہلو پنہاں ہیں، اودھ کی خاص بیگمات اُردو زبان کی محافظ اور شریفانہ کلچر اور تمدن کی نگہبان رہی ہیں، اس کتاب میں ایسی متعدد بیگمات کا ذکر ہے جو اُردو نظم و نثر پر غیر معمولی قدرت رکھتی تھیں مثلاً حضرت واجد علی شاہِ اودھ کی بیگم عالم آرا بیگم صاحبہ کے حالات بھی ہیں جو خود شاعرہ تھیں شمس النسا بیگم کے حالات ہیں جو نواب آصف الدولہ صاحب کی بیگم تھیں۔ ان کی نظموں کے نمونے بھی درج ہیں۔

اس کتاب میں ایسے واقعات بھی درج ہیں جن سے شاہی زمانے کے لکھنؤ کی تہذیب و تمدن پر روشنی پڑتی ہے مثلاً یہ کہ سلطان واجد علی شاہ کی والدہ معظمہ نواب ملکہ کشور صاحبہ اپنی حق رسی کے لیے جب ولایت تشریف لے گئیں تو سفر میں اور جہاز سے اُترتے وقت پردے اور قناتوں کا کس طرح انتظام کیا گیا تھا، بیگمات کی سواری کا کیا اہتمام ہوتا تھا، ملاقات و بازدید میں کیا اصول مدنظر رہتے تھے، اوقات کی تقسیم اور رسوم و قیود کی پابندی کے کیا اثرات تھے، ایسے واقعات بھی لکھے گئے ہیں جن سے مفید اخلاقی اور معاشرتی سبق حاصل ہوتے ہیں۔

حضرت مصنف نے اس کتاب میں جہاں یہ خیال رکھا ہے کہ ضروری باتیں تلاش کرکے لکھ دی جائیں وہاں غیر ضروری باتوں کو نظر انداز بھی کر دیا ہے۔ موصوف کے ریاض اور خوش سلیقگی کی جتنی تعریف اور قدر کی جائے وہ کم ہے۔

تبصرہ

پنڈت برج ناتھ شرغہ صاحب ایم اے ال ال بی

مصنف اُترا کھنڈ کی جاترا، بھارت کے سوربیر، سوانح عمری مہاتما گاندھی، ڈی ولیرا و سوامی رام تیرتھ وغیرہ

انگریزی میں ایک مثل ہے :—

"The hand that rocks the cradle rules the world."

یعنی جس ہاتھ میں پالنے کی ڈوری ہوتی ہے اُسی میں حکومت کی باگ ڈور ہوتی ہے۔

تاریخ خصوصاً تاریخ اودھ اس کی صداقت کی شاہد ہے۔ لیکن اب تک بیگمات اودھ کے کارناموں کی طرف مؤرخین نے توجہ نہیں کی تھی، شیخ تصدق حسین صاحب بی، اے۔ ال، ال، بی، جن کے نام نامی سے اردو ادب کے شائقین بخوبی واقف ہیں، پہلے شخص ہیں جنھوں نے بیگمات اودھ کے حالات اور ملکی سیاست پر ان کے اثرات ہمارے پیش نظر کر دیے ہیں۔

اودھ کی سلطنت کو انگریزی چالبازی کا شکار ہوئے ابھی پوری ایک صدی بھی نہیں ہوئی ہے، پھر بھی اس کی مسلسل اور مستند تاریخ ملنا دشوار ہو گیا ہے مختلف مؤرخین

نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے تاریخی واقعات پر روشنی ڈالی ہے، جس سے کہیں کہیں تضاد واقع ہو گیا ہے۔ یہ تصنیفات بھی اب کمیاب ہو رہی ہیں، ان سب دقتوں کا شیخ صاحب نے بڑی خوبی سے سامنا کیا ہے اور سچائی کی تہ تک پہنچنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے اگر کہیں مجبور ہو گئے ہیں تو مختلف الخیال مورخین کے اقتباسات بجنسہٖ درج کر دیے ہیں۔

یہ کتاب محض تاریخ اودھ پر صحیح اور کافی روشنی نہیں ڈالتی ہے بلکہ جس طرح علم الابدان کا ماہر سوکھی ہڈیوں سے رنگ روپ اور عمر کا اندازہ کر لیتا ہے، یہ کتاب بھی بھولی ہوئی بیگموں کی بولتی چالتی تصویر ہمارے سامنے پیش کر دیتی ہے۔

اس وقت جب کہ ثقیل الفاظ کا استعمال فیشن میں داخل ہو گیا ہے اس کتاب کی سادی اور بامحاورہ روزمرہ کی زبان بہت لطف دیتی ہے، اور کتاب میں خاص ادبیت پیدا کر دیتی ہے۔

فہرست

نواب سعادت خاں برہان الملک

(۱۷۲۰ - ۱۷۳۹)

محمد امین نام کے ایک نیشاپوری باشندے ۱۷۰۸ء میں تلاش روزگار کے لیے مملکت ایران سے کشور ہندستان میں وارد ہوئے اور یہاں مختلف منصبوں پر اپنے فرائض متعلقہ نہایت تندہی، سرگرمی اور دیانت داری سے انجام دے کر اپنے آقاؤں کے دل میں جگہ کرلی اور بعد میں ترقی کی منزلیں جلد جلد طے کر کے بڑا نام و نمود پیدا کیا۔ بارگاہِ خسروی سے بھی پہلے "نواب سعادت خاں" اور بعد میں "برہان الملک" کا خطاب ملا۔ ۱۷۲۲ء میں حضرت محمد شاہ شہنشاہ دہلی نے موصوف کو صوبہ اودھ کے نظم و نسق کی چولیں درست کرنے کو یہاں کا صوبہ دار مقرر کیا اپنی نوابی کے سات سال انھوں نے زیادہ تر اجودھیا میں گزارے جہاں انھوں نے ایک قلعہ بھی تعمیر کرایا۔ لکھنؤ میں انھوں نے "پنج محل" اور "مبارک محل" کی عظیم الشان عمارتیں شیخ زادوں کو مغلوب کر کے کرایہ پر حاصل کیں۔ ایک شادی انھوں نے ایران میں کی تھی اور تین شادیاں یکے بعد دیگرے ہندوستان آکر رچائیں۔ ۱۷۳۹ء میں بمقام پایہ تخت جہاں وہ بسلسلہ حملہ نادر شاہ مقیم تھے دنیا سے [illegible]

مخاطب بہ نواب بیگم نے حکیم مرزا بھجو کی معرفت کربلائے معلیٰ روانہ کر دیں اور وہاں روضہ مقدسہ کی پشت پر دفن کر دی گئیں۔

نواب سعادت خاں برہان الملک

کی

ایرانی اور ہندوستانی بیویاں

میر محمد امین (برہان الملک) پسر میر محمد نصیر نیشا پوری (ایران) کے باشندے تھے میر محمد امین کی گراں قدر خدمات سے خوش ہو کر اعلیٰ حضرت محمد شاہ شہنشاہ دہلی نے اُن کو "سعادت خاں برہان الملک" کا خطاب عطا کیا تھا۔

میر محمد امین امامیہ مذہب کے پیرو تھے اُن کی پہلی شادی اُن کے وطن میں میر محمد یوسف جاگیردار کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ اُن کے مورث اعلیٰ سید شمس الدین محمد تھے جن کا سلسلۂ خاندان امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے صاحبزادے سے ملتا ہے۔ موصوف نجف اشرف میں مقیم تھے اور بہت سی صاحب علم و فضیلت تھے شاہ اسمٰعیل صفوی والی ایران نے ان کو طلب کر کے قاضی القضاۃ کا عہدہ عطا کیا تھا اور بطور قدر افزائی بہت سی املاک اور جاگیر بھی نیشاپور میں عنایت کی تھی۔ سید محمد جعفر سید شمس الدین کے بڑے بیٹے سید محمد امین و سید محمد نامی تھے۔

پورا شجرۂ خاندان درج ذیل ہے

سید شمس الدین محمد

سید محمد جعفر

سید محمد امین — سید محمد

میر محمد یوسف جاگیردار

میر محمد نصیر (منسوب بہ دختر رضا قلی بیگ خاں وزیر ایران)

میر شاہ میر

دختر منسوبہ بہ جعفر خاں بیگ

دختر منسوبہ بہ میر شاہ میر (سعادت خاں) پسر محمد یوسف

میر محمد باقر داماد محمد علی خاں بیگ وزیر ایران

میر محمد امین (سعادت خاں برہان الملک) داماد خویش میر محمد یوسف

مرزا محسن عزت الدولہ — مرزا محمد مقیم (صفدر جنگ)

نثار محمد خاں شیر جنگ

محمد علی خاں

پسر فوت در صغر سنی — صدر جہاں بیگم منسوبہ بہ محمد مقیم ابو المنصور خاں صفدر جنگ — نور جہاں بیگم منسوبہ بہ نصیر الدین حیدر پسر میر محمد باقر — بادشاہ بیگم معروف بہ بندی بیگم۔ منسوبہ سعادت خاں۔ پسر مرزا محسن — محمدی بیگم منسوبہ بہ محمد علی خاں مقتول۔ — آمنہ بیگم منسوبہ بہ مرزا یوسف

سید محمد امین کے صرف ایک بیٹے میر محمد یوسف نامی تھے۔ میر محمد یوسف و میر محمد یوسف دونوں چچازاد بھائی شاہ عباس صفوی کے ہم عصر تھے۔

شاہ ایران کے یہاں دستور تھا کہ سفر اور شکار میں کئی اشخاص اُن کی سواری کے آگے آگے گھوڑوں پر چلتے تھے اور سادہ المشکر پیچھے ہوتا تھا۔ میر محمد یوسف شاہ موصوف کے

دربار میں اسی خدمت پر مامور تھے کہ جب کبھی بادشاہ شکار کو جائیں تو یہ سواری کے آگے گھوڑے پر چلیں۔ ایرانی دستور کے موافق یہ منصب سوائے سادات کے اور کسی کو نہیں ملتا تھا۔ ہندوستان میں بھی مغل بادشاہوں کے امام اور فیل بان ہمیشہ سیّد ہوتے تھے کیونکہ اور کسی فرقے کا آدمی بادشاہ کی طرف پشت کر کے نہ بیٹھ سکتا تھا نہ کھڑا ہو سکتا تھا۔

ایک روز شاہ ایران کی سواری جنگل کی طرف جا رہی تھی کہ اچانک ایک شیر جھاڑی سے نکل کر حملہ آور ہوا۔ بادشاہ پشت زین سے نیچے آ رہے۔ میر محمد یوسف نے جان پر کھیل کر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ پلک جھپکاتے بادشاہ کے پاس پہونچ کر گھوڑے سے کود پڑے اور پیش قبض نکال کر شیر کا کام تمام کر دیا۔ شاہ عباس اس وقت زرہ بکتر زیب تن کیے تھے۔ ان کا ایک بال بھی بیکانہ ہوا مگر انھوں نے اس وفا شعاری اور جاں نثاری کے صلے میں میر محمد یوسف کو خلعت وزارت سے سرفراز کرنا چاہا لیکن وہ وزیر ہی کی سفارش سے دربار کجکلاہ میں ملازم ہوئے تھے ان کو اپنے محسن کی دل شکنی اور آزردگی کسی طرح منظور نہ ہوئی چنانچہ انھوں نے دست بستہ عرض کیا کہ میں سیّد ہوں مجھ سے سیاست نہ ہو سکے گی اور بغیر سیاست نظم و نسق سلطنت محال ہے حضور والا اس خدمت گراں سے فدوی کو معاف ہی رکھیں تو بہت مناسب ہے۔ مگر ایک عرض یہ ہے کہ میر محمد نصیر میرا بھتیجا اور بھانجا اب تک بن بیاہا ہے اُمیدوار ہوں کہ اس کی شادی خانہ آبادی رضا قلی بیگ وزیر سلطنت کی دختر نیک اختر سے کر دی جائے یہی امر میرے واسطے باعث صد افتخار ہوگا یہ سُن کر بادشاہ نے وزیر سے فرمایا محمد نصیر میرا بیٹا ہے اس کو اپنی فرزندی میں لے لو تاکہ میرے اور تمھارے درمیان رشتہ قائم ہو جائے۔ وزیر نے جو بادشاہ ترکمان مرزا یوسف قرا شاہ بداغ کی نسل سے تھے ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ فدوی کو تعمیل ارشاد میں کوئی عذر نہیں ہے مگر اتنی گزارش ضرور ہے کہ اس رشتہ سیدی سے لڑکی پیدا ہو تو میری قوم قزلباش ہی کے کسی فرد سے منسوب کی جائے اور یہ دستور ہمیشہ قائم رہے

بادشاہ نے اُن کی شرط منظور کر لی اور میر محمد یوسف کو نیشاپور میں بہت سی جاگیر اور املاک بھی عنایت کی مابعد میر محمد نصیر کی شادی وزیر ایران کی دُختر سے ہو گئی اور دونوں میاں بیوی مسرّت و شادمانی کی زندگی بسر کرنے لگے۔

اس شادی کے نتیجے میں دو بیٹے محمّد باقر اور محمّد امین اور دو بیٹیاں عالمِ وجود میں آئیں محمّد امین ایک بہن سے چھوٹے اور دوسری سے بڑے تھے۔ جب میر نصیر کی اولاد سنِ شعور کو پہونچی تو اُن کی رفیقہ حیات پچھلے قول و قرار کے ایفاء کی خواستگار ہوئیں اور بیان کیا کہ میرے ماموں زاد بھائی محمد قلی بیگ خاں کا لڑکا جعفر بیگ خاں موجود ہے اُس کے ساتھ بڑی بیٹی کی شادی کر دو انھوں نے یہ رشتہ بندی اس شرط سے منظور کی کہ محمد قلی بیگ خاں بھی اپنی بیٹی میرے بڑے بیٹے محمّد باقر سے منسوب کر دیں چنانچہ جانبین کی رضامندی سے یہ دونوں شادیاں بخیر و خوبی انجام پا گئیں اس کے بعد دوسری بیٹی کو میر محمد یوسف کے بیٹے میر محمّد شاہ میرسے بیاہا اور اپنے چھوٹے بیٹے میر محمّد امین کی شادی میر محمّد یوسف سے رچائی چونکہ میر محمّد یوسف عطیہ شاہی کی وجہ سے امیر کبیر ہو گئے تھے اس لیے محمّد امین انھیں کے دولت کدہ میں بیوی کے ہمراہ زندگی بسر کرنے لگے۔

بوجہ خانہ دامادی میر محمّد امین کی زندگی پھولوں کی سیج پر گزرتی تھی۔ عیش و آرام کے سب سامان مہیا تھے۔ رنج و غم پاس نہ پھٹکتے تھے مگر اُن کی بیوی نے ایک روز انکو کوئی طعن آمیز دل خراش بات کہی جو نوکِ سناں کی طرح دل میں چُبھ گئی۔ کباب میں یہ ہڈی کا ریزہ سوہان روح ہو گیا۔ رنگ میں بھنگ دیکھ کر اور بیوی کی تیغ زبان کا چرکا کھا کر تلملا اٹھے صبر و ضبط کا یارا نہ رہا اس لیے بخت آزمائی کے لیے آوارہ وطنی پر کمر باندھی تاکہ غم کی پھانس دل سے نکلے اور سسرال کی روٹیاں توڑنے کا بدنما داغ پیشانی سے دور ہو چنانچہ [illegible] مطابق [illegible] میں تن بہ تقدیر گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور خدمات

[illegible]

اور نواب ناظم بنگالہ کی زیر سرپرستی زندگی بسر کر رہے تھے بعضوں کے نزدیک انھوں نے
نیشاپور میں کوئی ٹھیکہ لیا تھا جس میں بہت خسارہ ہوا چنانچہ مرزا یوسف کی ماں کا زیور فروخت
کر کے زر نقصان ادا کیا اور شرم کے مارے ہندوستان چلے آئے۔ ہندوستان آکر موصوف
کا نصیب جاگ اٹھا وہی مثل ہوئی کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے۔ ہندوستان پہونچ کر
موصوف تھوڑے زمانہ تک نواب سربلند خاں صوبہ دار گجرات کی مصاحبت میں رہے۔
انھوں نے بالآخر ستر ۷۰ روپیہ ماہوار پر اپنے خیمہ نصب کرنے کو انھیں میر منزل کی خدمت
پر مامور کر دیا۔ ایک دن نواب شکار کو گئے۔ خیمہ ایک نشیبی مقام پر استادہ کیا گیا اتفاق سے
اس روز موسلا دھار بہت شدت کی بارش ہوئی جس سے جل تھل بھر گئے اور نواب کے خیمہ
میں بھی پانی ہی پانی ہو گیا۔ انھوں نے ایک رتھ میں بیٹھ کر تمام شب آنکھوں میں کاٹی۔ صبح کو
میر محمد امین کو بلا کر بہت ناراض ہوئے اور فرمایا آپ کا دماغ تو ہفت ہزاریوں کا سا معلوم
ہوتا ہے۔ اپنے کام میں دل ہی نہیں لگاتے۔ محمد امین کو یہ کلمات بہت ناگوار گزرے عرض کیا
حضور سید ہیں آپ کی زبان میں تاثیر ضرور ہوگی ارشاد عالی کو اپنے حق میں فال نیک سمجھ کر
ملازمت سے دستبردار ہوتا ہوں تاکہ ہفت ہزاری منصب کے لیے جا کر کوشش کروں چنانچہ
نوکری چھوڑ کر دہلی چلے آئے جہاں اس وقت قطب الملک نواب عبداللہ خاں کا طوطی بول
رہا تھا۔ ان کے دیوان رائے رتن چند سے راہ و رسم پیدا کر کے اول بزمانہ حضرت فرخ سیر
منصب یک ہزاری و نائب کروڑی حاصل کیا پھر ۱۱۳۰ھ میں شہزادوں کی جاگیر ہنڈول
دبیانہ کا ٹھیکہ ۱۰ لاکھ روپیہ سالانہ پر لیا اور ۱۹ اکتوبر ۱۷۱۸ء سے لے کر ۱۷۲۰ء تک فوجدار
دعامل بھی رہے۔ مابعد حضرت محمد شاہ شہنشاہ دہلی کو سادات بارہہ کے آہنی چنگل سے
چھڑایا جس کے صلہ میں ۱۱۳۰ھ میں سعادت خاں کے خطاب سے ممتاز ہو کر آگرہ کے گورنر اور
قسم خاصان شاہی ہوئے جب اودھ سے راجاؤں کی سرکشی و تمردی اور متنفذین کی بدوضعی اور
بدانتظامی کی خبریں گوش ہمایوں تک پہونچیں تو سعادت خاں کو صوبہ داری اودھ کا خلعت

مرحمت کر کے ۱۱۳۲ھ میں برہان الملک کے خطاب سے سربلند فرمایا المختصر یہی محمد امین جو بخت رسا اور طالع سکندری لے کر دنیا میں آئے تھے۔ بانی مبانی خاندان ذیشان فرمانروایان اودھ ہوئے جن کی نسل میں ان کے علاوہ ابتداً ایسا پانچ صوبہ دار یا نوابین سلطنت ہوئے جن کے ہاتھوں میں ۱۷۲۰ء سے لے کر ۱۸۱۹ء تک یعنی ۹۹ سال صوبہ داری اودھ کی عنان حکومت اور ۱۸۱۹ء سے لے کر ۱۸۵۶ء تک اسی دودمان والاشان کے پانچ شہر یاروں کے سروں پر ۳۷ برس تک تاج شاہی جگمگاتا رہا بالفاظ دیگر ۱۳۶ برس کی طویل مدت تک اس خانوادہ کے گیارہ اراکین برسر اقتدار رہے۔ جان عالم واجد علی شاہ اس سلسلہ کے آخری تاجدار تھے جن کو خداوندان ایسٹ انڈیا کمپنی نے فروری ۱۸۵۶ء میں اورنگ شاہی سے محروم کر کے ملک اودھ کو مقبوضات انگلشیہ میں شامل کر لیا۔

کتب تواریخ سے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ برہان الملک کی ایرانی بیوی کا کیا حشر ہوا کیونکہ موصوف نے ہندوستان آکر پھر کبھی ایران کی طرف رخ نہ کیا۔

برہان الملک کی ہندستانی بیویاں

ہندوستان آکر برہان الملک نے تین عقد کیے۔ پہلی شادی نواب کلب علی خاں کی بیٹی سے کی جو دہلی کے ایک معزز باشندے اور شاہی عہدہ دار بھی تھے۔ یہ بیوی شادی کے بعد ہی چل بسیں مگر اس مناکحت سے میر محمد امین نے بہت اثر اور شہرت حاصل کی۔

دوسری شادی سید طالب محمد خاں آصف جاہ کی دختر سے اُن بیوی سے چار لڑکیاں، صدر جہاں بیگم، بینگا بیگم، ہما بیگم، محمدی بیگم اور ایک لڑکا پیدا ہوا جو سن طفولیت ہی میں چیچک کی نذر ہو گیا۔ برہان الملک نے صرف صدر جہاں اور بینگا بیگم کی شادیاں اپنی حیات میں کیں باقی لڑکیوں کی شادیاں اُن کے بعد ان کے جانشین اور داماد نواب صفدر جنگ نے کیں۔

(۱) امینگا بیگم عرف نور جہاں بیگم نصیر الدین حیدر خاں کو منسوب ہوئیں جو برہان الملک کی چھوٹی بہن کے بیٹے تھے۔ نصیر الدین میر شاہ میر کے بیٹے تھے جو بنگشوں کی پہلی جنگ میں کام آ گئے تھے۔

(۲) ہما بیگم عرف بندی بیگم برہان الملک کے بڑے بھائی میر محمد باقر مخاطب بہ سعادت خاں کے بیٹے نثار محمد خاں مخاطب بہ نواب شیر جنگ کو بیاہی گئیں جن کا باغ موسومہ" باغ شیر جنگ" لکھنؤ سٹی اسٹیشن کے قریب واقع ہے اور تا حال اسی نام سے مشہور ہے۔

(۳) محمدی بیگم محمد قلی خاں سے منعقد ہوئیں جو برہان الملک کے داماد و بھانجہ محمد مقیم مخاطب بہ صفدر جنگ کے بڑے بھائی عزت الدولہ مرزا محمد محسن کے بیٹے تھے محمد قلی خاں کو نواب شجاع الدولہ نے اپنا حریف خیال کر کے بمقام قلعہ جلال آباد قتل کرا دیا تھا اور لاش ایک کنوئیں میں ڈلوا دی تھی۔

(۴) آمنہ بیگم سید محمد خاں کو بیاہی گئیں جو برہان الملک کے بھانجہ تھے

عقد بزمانہ ٹھیکہ ہنڈون دبیانہ نواب محمد تقی خاں صوبہ دار اکبر آباد کی دختر سے کیا۔ اس شادی میں برہان الملک کو جہیز میں ایک کنیز بھی ملی جس کا نام خدیجہ خانم تھا۔ بیوی تو شادی کے تھوڑے ہی دنوں بعد ملک عدم کو سدھار گئیں۔ مگر خدیجہ خانم نواب کے تصرف میں آئیں اُن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام صدر النسا رکھا گیا۔ صاحب عمادت السعادت لڑکی کی عمر کے متعلق تحریر کرتے ہیں کہ ۱۱۲۷ھ میں نواب سعادت خاں نے علاقہ ہنڈون دبیانہ کا ٹھیکہ لیا اس وقت صدر النسا کا سن پانچ سال یا اس سے کچھ زیادہ تھا۔ اس حساب سے صدر النسا کی ولادت ۱۱۲۲ھ یا ۱۱۲۳ھ میں ہوئی۔

صدر النسا کی ماں کے متعلق موصوف لکھتے ہیں:۔

ولادت آں دُرِ دریائے سیادت از بطنِ عفیفہ مخدرہ خانم صاحبہ اتفاق افتادہ
مقبرہ اش در لکھنؤ در باغ کہ شہرت بباغِ بڑا ئن دارد تعمیر پذیرفت
...... اشرف علی خاں بہادر گل رنگین آں بہارستان اند

اس مصنف نے خانم صاحبہ کا نام و نشان ظاہر نہیں کیا ہے۔ سید کمال الدین حیدر مصنف قیصر التواریخ نے بھی خانم صاحبہ کے نام و نسب پر روشنی نہیں ڈالی ہے بلکہ اُن کی تحریر ظاہر کرتی ہے کہ انھوں نے عماد السعادت کی عبارت کو صرف اُردو کی پوشاک پہنا دی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ حکومت مذکور میں (یعنی بزمانہ ٹھیکہ منڈول دبانہ) نواب بیگم صاحبہ یعنی والدۂ نواب شجاع الدولہ کی عمر ۵ یا ۶ برس کی تھی اور اپنے باپ کے ساتھ تھیں۔ اُن کی ولادت خانم صاحبہ سے ہوئی جن کا مقبرہ و باغ امین آباد میں بڑائن کا باغ مشہور ہے۔ خدا بھلا کرے مرزا ابو طالب کا جنھوں نے اس طلسم کو توڑ کر رازِ سربستہ پر سے پردہ اٹھا دیا ہے چنانچہ وہ اپنی تصنیف "تفضیح الغافلین" میں تحریر کرتے ہیں۔

"سعادت خاں (برہان الملک) کی بیٹی نواب مرحوم (شجاع الدولہ)
کی والدہ ایک جاریہ کے بطن سے تھیں ..... جو بوقت شادی نواب
سعادت خاں کو جہیز میں ملی تھی۔

برہان الملک اپنے جیتے جی اس خاندان کے ساتھ بہت اخلاق اور حُسن سلوک سے پیش آتے رہے اور اُن لوگوں کے ممنون احسان رہے مگر صفدر جنگ (شوہر صدر النسا) ان لوگوں سے دور ہی دور رہے کیونکہ وہ لوگ اُن کی بیوی کو کنیز زادی ہونے کے باعث نظر حقارت سے دیکھتے تھے۔ بندہ علی خاں ابراہیم علی خاں اور اشرف علی خاں آج تک لکھنؤ ہی میں موجود ہیں۔ یہ لوگ کلب علی خاں کے چچاؤں سے پیدا ہیں۔ مرزا ابو طالب کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ عماد السعادت کا یہ جملہ کہ "اشرف علی خاں بہادر گل رنگین آں بہارستان اند" بہت ہی بلیغ اور معنی آفریں ہے اور جو مفہوم مرزا ابو طالب نے واضح اور

صریح الفاظ میں ادا کیا ہے اس کو مصنف عمات السعادت نے صرف چند الفاظ میں در پردہ خوب صورتی سے ظاہر کر دیا ہے۔

صدر النسا معروف بہ صدر جہاں بیگم کی شادی نواب سعادت خاں نے اپنے بھانجے مرزا محمد مقیم مخاطب بہ نواب ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کے ساتھ کی تھی جن سے ۱۱۴۴ھ میں صرف ایک صاحب زادے پیدا ہوئے جن کا نام جلال الدین حیدر اور خطاب نواب شجاع الدولہ تھا صدر النسا نے ۱۷۹۶ء میں وفات پائی۔ انکا خطاب نواب عالیہ تھا بہت ذی فہم۔ پاک دامن اور نیک طینت تھیں۔

نواب صفدر جنگ

۱۷۳۹ء ۔ ۱۷۵۶ء

ان کا نام "محمد مقیم" اور خطاب "نواب ابوالمنصور خاں صفدر جنگ" تھا۔ یہ نواب برہان الملک کے بھانجے اور داماد تھے۔ اودھ کی صوبہ داری کے علاوہ ۱۷۴۸ء میں یہ شہنشاہ دہلی حضرت احمد شاہ کے وزیر اعظم بھی مقرر ہوئے اور "نواب وزیر" کے لقب سے مشہور ہوئے۔ بوجہ قیام دہلی اودھ میں ان کی نیابت راجہ نول رائے کرتے تھے۔ صفدر جنگ نے "فیض آباد" کی بنیاد ڈالی اور لکھنؤ کے جنوب میں قلعہ جلال آباد تعمیر کرایا اور شیخوں سے عمارت پنچ محل لے کر انھیں سات سو ایکڑ آراضی اس کے معاوضہ میں بمقام دوگادال قریب رکاب گنج دیدی اور پنج محل کا نام تبدیل کر کے "مچھی بھون" رکھا۔ انھوں نے برعکس دوسرے والیان ریاست کے صرف اپنی بیاہتا بیوی صدر النسا بیگم پر قناعت

کی۔ نیول رائے نے پکے پل کی کوٹھیاں گلوائیں۔ مگر عمر نے زمانہ اِس کی تکمیل نواب آصف الدولہ کے زمانہ فرمانروائی میں ہوئی۔

صفدر جنگ نے سنہ ۱۷۵۴ء میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ نعش دہلی بھیج کر اسی سرزمین میں قریب درگاہ شاہ مرداں دفن کی گئی۔ قبر پر اُن کے فرزند نواب شجاع الدولہ نے ایک عظیم الشان مقبرہ سنگِ سُرخ و سفید وغیرہ سے بصرف ۳ لاکھ روپیہ معرفت بلال محمد خاں تعمیر کرا دیا جو مغلی طرزِ تعمیر کا بہترین نمونہ خیال کیا جاتا ہے۔

نواب صدر جہاں بیگم

صدر النسا جو بعد میں صدر جہاں بیگم کے نام سے مشہور ہوئیں۔ میر محمد امین نیشاپوری کی دختر ہمایوں اختر تھیں جو ترقی کر کے صوبہ دار اودھ ہو گئے تھے اور سعادت خاں و بُرہان الملک کے خطابات سے بھی سرفراز ہوئے۔

میر محمد امینؔ کی پہلی شادی ایران میں میر محمد یوسف جاگیردار کی بیٹی سے بطور خانہ دامادی ہوئی تھی جس کی وجہ سے جملہ سامان عیش و عشرت مہیا تھے اور زندگی پھولوں کی سیج پر گزرتی تھی مگر ایک روز اُن کی بیوی نے کوئی طعن آمیز دل خراش بات کہی جو نوکِ سناں کی طرح دل میں چُبھ گئی اور کباب میں یہ ہڈی کا ریزہ سوہانِ روح ہو گیا۔ آدمی شرم و حیا کے پتلے تھے رنگ میں بھنگ دیکھ کر اور زوجہ کی تیغِ زباں کا چرکا کھا کر تلملا اُٹھے۔ صبر و ضبط کا یارا نہ رہا۔ بخت آزمائی کے لیے آوارہ وطنی پر کمر باندھی تاکہ غم کی پھانس دل سے نکلے اور سسرال کی روٹیاں توڑنے کا بدنما داغ پیشانی سے دور ہو چنانچہ سنہ ۱۷۰۸ء مطابق سنہ ۱۱۲۰ھ میں تن بہ تقدیر گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور ہندوستان کی راہ لی جہاں میر محمد نصیر ان کے والد اور میر محمد باقر ان کے بڑے بھائی دو سال قبل سے مقیم تھے

ہندوستان پہونچ کر موصوف تھوڑے زمانہ تک سر بلند خاں صوبہ دار گجرات کی مصاحبت میں رہے جنھوں نے بالآخر ان کو سترہ روپیہ ماہوار پر اپنے خیمے نصب کرنے کو میر منزلی کی خدمت پر مامور کردیا۔ ایک دن نواب شکار کو گئے خیمہ ایک نشیبی مقام پر استادہ کیا گیا۔ اتفاق سے اس روز تل دھار اور دھار بہت شدت کی بارش ہوئی جس سے جل تھل بھر گئے اور نواب کے خیمہ میں بھی پانی ہی پانی ہوگیا۔ انھوں نے ایک رتھ میں بیٹھ کر تمام شب آنکھوں میں کاٹی۔ صبح کو میر محمد امین کو بلا کر بہت خفا ہوئے اور فرمایا آپ کا دماغ تو ہفت ہزاریوں کا ایسا معلوم ہوتا ہے۔ اپنے کام میں دل ہی نہیں لگاتے۔ محمد امین کو یہ کلمات سخت ناگوار گزرے۔ عرض کیا حضور سید ہیں آپ کی زبان میں تاثیر ضرور ہوگی اس لیے ارشاد عالی کو اپنے حق میں فال نیک سمجھ کر ملازمت سے دست بردار ہوتا ہوں تاکہ ہفت ہزاری منصب کے لیے جا کر کوشش کروں۔ چنانچہ نوکری چھوڑ کر دہلی چلے آئے جہاں اس وقت قطب الملک نواب عبد اللہ خاں کا طوطی بول رہا تھا۔ اُن کے دیوان رائے رتن چند سے راہ و رسم پیدا کر کے اوّل بزمانہ حضرت فرخ منصب یکہزاری و نائب کروری حاصل کیا پھر ۱۱۲۸ھ میں شہزادوں کی جاگیر ہنڈون بیانہ کا ٹھیکہ اٹھارہ لاکھ روپیہ سالانہ پر لیا۔ اور ۱۷ اکتوبر ۱۷۱۹ء سے لے کر ۱۴ اکتوبر ۱۷۲۰ء تک فوجدار (عامل) بھی رہے مگر اپنے فرائض منصبی اتنی دیانت داری اور عرق ریزی سے انجام دیے کہ ہر شخص کے دل میں ان کی جگہ ہوگئی اور بارگاہ خسروی تک بھی رسائی ہوگئی۔ مابعد حضرت محمد شاہ شہنشاہ دہلی کو سادات بارہہ قطب الملک عبد اللہ خاں حسن علیخاں و حسین علیخاں کے آہنی پنجہ سے چھڑانے کی سرتوڑ کوشش کی جس کے صلہ میں ۱۱۳۰ھ میں سعادت خاں کے خطاب سے ممتاز ہو کر آگرہ کے گورنر اور مہتمم خاصان شاہی ہوئے۔ اُس کے بعد اودھ سے جب رعایا کی سرکشی و زبردستی اور منتظمین کی بدعنوانی اور بدانتظامی کی خبریں دہلی پہونچیں تو سعادت خاں کو صوبہ داری اودھ کا خلعت مرحمت کر کے ۱۱۳۲ھ برہان الملک کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ خدا دینے پر آتا ہے تو چھپر پھاڑ کے دیتا ہے۔ وہی محمد امین جو ۱۱۲۰ھ میں یک بینی و دوگوش تلاش روزگار میں طول طویل سفر برداشت کر کے ایران سے ہندوستان آئے تھے۔ ۱۱۳۲ھ میں خدا کے فضل و کرم سے فلک اوج

پر بدر کامل کی طرح جگمگا رہے تھے۔ دولت و ثروت قدم چوم رہی تھی اور اعزاز و اکرام کی کوئی حد اور انتہا نہ تھی، ہندوستان آکر برہان الملک نے تین شادیاں کیں۔ پہلی شادی نواب کلب علی خاں کی بیٹی سے ہوئی جو اکبر آباد (آگرہ) کے ایک شاہی عہدہ دار تھے۔ اس شادی میں اُن کو سسرال سے ایک کنیز بھی ملی جس کا نام خدیجہ خانم[1] تھا۔ بیوی تو شادی کے بعد ہی لاولد ملک بقا کو سدھاریں مگر خانم موصوفہ سعادت خاں[2] کے تصرف میں آئیں جن سے ایک لڑکی صدر النسا پیدا ہوئی جس کو گھر والے پیار سے منی بیگم[2] بھی کہتے تھے۔

سنہ ۱۱۲۸ء[3] میں جب سعادت خاں نے جاگیر شہزادگان ہنڈون و بیانہ کا ٹھیکہ لیا تو اس وقت اس لڑکی کی عمر چھ برس کی تھی۔ اس کی ولادت کے وقت سے انھوں نے ترقی کی

---

(۱) نوٹ:۔ خدیجہ خانم کی قبر امین الدولہ پارک لکھنؤ میں ایک بلند ہشت پہل چبوترہ پر واقع ہے جس کو عوام ناواقفیت سے شہید مرد کی قبر سمجھ کر ہار پھول چڑھاتے ہیں اور روشنی بھی کرتے ہیں۔ خدیجہ خانم نے اس مقام پر ایک باغ لگا کر اس میں ایک مسجد اور حمام سماۃ جے کنور کی معرفت تیار کرایا تھا جو قوم کی پنڈتائن دیپ اٹن تھیں مگر آغوش اسلام میں آگئی تھیں جس سال مسجد بن کر تیار ہوئی اسی سال خدیجہ خانم کا دنیا سے کوچ ہو گیا۔ انھیں کا باغ اُن کی دائمی آرام گاہ قرار پایا مگر مسجد پڑائن کی مسجد مشہور ہو گئی اب اس کو لوگ جنوں کی مسجد بھی کہنے لگے ہیں اور جب سے وہاں منتیں مرادیں بھی مانگتے ہیں۔ خدیجہ خانم کی قبر پر پہلے ایک مقبرہ بھی تعمیر تھا جو تخمیناً سنہ ۱۹ء میں منہدم ہو گیا۔ اور سڑک سرکاری کے نکلنے سے مسجد جو قبر کے مغرب جانب واقع تھی سڑک کے اُس پار پڑ جانے سے قبر سے بالکل جدا ہو گئی۔ امجد علی شاہ بادشاہ نے یہ کل املاک اپنے وزیر اعظم مولوی امداد حسین خاں امین الدولہ کو عطا کر دی تھی جنھوں نے باغ کا نام اپنے نام پر "امداد باغ" رکھا مگر سنہ ۱۹۱۴ء میں میونسپل بورڈ نے اُن کی یہ کل املاک لے کر ایک باغ بنوا دیا جس کا نام نواب امین الدولہ کی یادگار میں امین الدولہ پارک رکھ دیا گیا۔

منزلیں اتنی جلد جلد طے کیں کہ وہ اس کو بہت مبارک قدم خیال کرنے لگے اسی وجہ سے وہ اُن کی آنکھوں کا تارا ہو رہی تھی۔ کسی دم نظر سے اوجھل نہ ہونے دیتے تھے چنانچہ جو لاڈ پیار اس لڑکی کا ہوا وہ اس کی بہنوں ہینگا بیگم، ہما بیگم، محمدی بیگم اور آمنہ بیگم کا نہ ہوا جو سعادت خاں کی دوسری بیوی دختر سید طالب محمد خاں سے تھیں۔

جب صدر النسا نے بارہویں سال میں قدم رکھا تو سعادت خاں نے اپنی بہن کو نیشاپور سے بلوا کر اُن کی شادی ۱۱۳۴ھ میں اپنے بھانجہ مرزا محمد مقیم سے کر دی اُس وقت سے وہ صدر جہاں بیگم کے نام سے موسوم ہوئیں اور سسرال سے "نواب بیگم" خطاب ملا ــــ پہلے سعادت خاں کا ارادہ تھا کہ صدر النسا کا ہاتھ اپنے بڑے بھائی میر محمد باقر المخاطب بہ سیادت خاں کے بیٹے نثار محمد خاں شیر جنگ کے ہاتھ میں دیں مگر اُن کے بعض اطوار ناپسند تھے اس لیے اپنی رائے تبدیل کر دی۔

اس تقریب کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد سعادت خاں اپنے صوبہ کا انتظام و انصرام مرزا محمد مقیم کے سپرد کر کے خود اطمینان و فارغ البالی سے زندگی بسر کرنے لگے۔ تھوڑی ہی مدت گزرنے کے بعد شہنشاہ دہلی نے محمد مقیم کو "جماعت الملک ابو المنصور خاں بہادر صفدر جنگ" کا خطاب عطا فرمایا۔

صدر النسا کی شادی مرزا محمد مقیم کے ساتھ نہایت مبارک ثابت ہوئی۔ میاں بیوی میں بہت پیار و اخلاص تھا۔ دونوں ایک جان دو قالب ہو رہے تھے۔ صدر جہاں نہایت نیک سرشت۔ وفا شعار اور مطیع و فرماں بردار بیوی تھیں صفدر جنگ نے بھی باوجود دولت و حشمت، برخلاف دیگر اکابر صرف صدر جہاں ہی پر قناعت کی نہ کوئی دوسرا محل کیا نہ کسی دوسری عورت کی طرف کبھی نظر اٹھا کر دیکھا چنانچہ مصنف عماد السعادت اس بارہ میں تحریر کرتے ہیں:۔

"حیا و آدمیت او مقتضی نہ شد کہ سوائے عفیفہ جلیلہ با دیگر زنے سر و کار بہم رسانید"

یعنی اُن کی حیا و انسانیت نے یہ گوارا نہ کیا کہ سوائے اپنی نیک بخت بیوی کے کسی دوسری عورت سے سروکار رکھیں ۱۱۴۴ھ مطابق ۱۵ جنوری ۱۷۳۲ء میں صفدر جنگ کو خدا نے ایک فرزند عطا کیا۔ یہ ولادت باسعادت محل شہزادہ دارا شکوہ[1] میں واقع ہوئی جو شہنشاہ دہلی نے سعادت خاں کو برائے قیام عطا فرمایا تھا۔ صاحبزادہ کا نام جلال الدین حیدر رکھا گیا۔ ان کی ولادت پر بہت جشن منایا گیا۔ جب صاحب زادہ کی عمر ۱۴ سال کی ہوئی تو اُن کی شادی اُمۃ الزہرا کے ساتھ ہوئی جو محمد اسحاق خاں موتمن الدولہ کی نور نظر مرزا محمد خاں المخاطب بہ محمد اسحاق خاں نجم الدولہ کی ہمشیرہ اور شہنشاہ دہلی حضرت محمد شاہ کی منہ بولی بیٹی تھیں اُمۃ الزہرا کے باپ شادی سے پہلے انتقال کر چکے تھے اس لیے اُن کے سب سے بڑے بھائی نجم الدولہ نے بحیثیت ولی رسومات شادی انجام دیں۔ شہنشاہ دہلی بھی بہ نفس نفیس اس شادی میں مع اراکین دولت و عمائدین سلطنت رونق افروز تھے۔ ۱۷۴۵ء کے آخری حصہ میں یہ شادی بھی یادگار زمانہ ہوئی جس میں مصنف عماد السعادت کے نزدیک چھیالیس لاکھ روپیہ صرف ہوئے اور بہو کو سسرال سے "بہو بیگم" خطاب عطا ہوا۔

شجاع[2] الدولہ کے علاوہ نواب بیگم کے کوئی[3] اور اولاد نہ ہوئی مگر حسن علی خاں کی ایک لڑکی کو جو بی بی عاشورن سے تھی اُنھوں نے اپنی بیٹی بنا کر بڑے ناز و نعم سے پالا تھا جب وہ سن شعور کو پہنچی تو اس کی شادی مرزا محمد نصیر کے ساتھ کر دی ۱۷۵۰ء میں صفدر جنگ نے احمد خاں بنگش نواب فرخ آباد پر یورش کی تو شومی قسمت سے لڑائی بگڑ گئی

---

[1] سنار یوراہ First 2 Nawabs of Oudh [2] دنی ٹ ۔ نثار محمد خاں کو شیر جنگ کا خطاب شہنشاہ دہلی نے عطا کیا تھا۔ اُن کا ایک باغ موسومہ باغ شیر جنگ

بندوق کی ایک گولی صفدر جنگ کی گردن پر لگی جس سے وہ بیہوش ہو کر ہاتھی کے ہودہ میں گر گئے۔ راجہ جگت نرائن برادر راجہ لچھمی نرائن دیوان صفدر جنگ نے بجائے فیل بان ہاتھی پر بیٹھ کر اُس کو میدانِ کارزار سے نکال کر دہلی کی راہ لی اس شکست کے بعد نواب احمد خاں کے بیٹے نواب محمود خاں نے اودھ پر اپنا قبضہ جما لیا۔ میدان سے صحیح و سلامت واپسی پر نواب بیگم سجدۂ شکر بجا لائیں اور بطور اظہار شکر خزانہ کا منھ کھول دیا اور جن ملازمین نے اپنی جان کو جوکھم میں ڈال کر ایسے آڑے وقت میں نواب کا ساتھ دیا تھا اُن میں سے بعضوں کو خلعت اور بعضوں کو گراں بہا تحائف تقسیم کیے۔ جب صفدر جنگ نے نواب فرخ آباد پر چڑھائی کی تو دہلی میں قائم مقام اُن کے بیٹے شجاع الدولہ تھے۔ نواب بیگم بھی اپنے بیٹے کے پاس مقیم تھیں۔ اس اثنا میں جاوید خاں خواجہ سرا نے جو شہنشاہ دہلی کا بہت منھ چڑھا تھا۔ سخت کوشش کی کہ شجاع الدولہ کو برطرف کرا دے اور نواب بیگم کی توہین و تذلیل کا بھی درپے ہوا مگر موصوفہ کے مشورہ سے شجاع الدولہ نے دس ہزار سپاہیوں کا ایک لشکر جرار تیار کیا اور ماں بیٹے دونوں مقابلہ پر ڈٹے رہے جس سے جاوید خاں کا سارا نشہ ہرن ہو گیا پھر کچھ عرصہ کے بعد موقع پاکر صفدر جنگ نے اس کو اپنے مکان پر دعوت کے حیلہ سے بُلا کر موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

جب صفدر جنگ نواب احمد خاں بنگش سے شکست کھا کر دہلی واپس آئے تو نہایت افسردہ خاطر اور ملول رہتے تھے۔ ایک روز اسی حالت میں مسند پر دراز ہو گئے اور دیر تک آرام کرتے رہے جب ہوشیار ہوئے تو نواب بیگم نے کہا آج خلاف معمول بہت دیر تک سوتے رہے جواب دیا رنج و الم کی حالت میں نیند کہاں۔ آج کل کوئی ملکی و مالی کام تو ہے نہیں اسی لیے بیکار بیٹھے بیٹھے طبیعت گھبراتی ہے۔ بیگم نے کہا تو پھر کچھ تدبیر کرنا چاہیے۔ خالی خولی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے کیونکر کام چلے گا۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ جنگ میں لوگوں نے ہزیمت اُٹھائی مگر ہمت[1] نہیں ہارے اور دوبارہ

[1] عمادت السعادت

فوج جمع کر کے دشمن کا مقابلہ کیا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اس رنج و غم سے کوئی فائدہ نہ ہوگا اگر روپیہ کی ضرورت ہو تو گیارہ لاکھ روپے اور چار ہزار اشرفیاں میرے پاس موجود ہیں انھیں لے کر اپنا کام نکالو۔ یہ نوید جاں فزا سُن کر نواب کا دل باغ باغ ہو گیا۔ دوسرے ہی روز صبح کو راجہ ناگر مل۔ راجہ لچھمی نرائن۔ راجہ سورج مل۔ محمد اسمٰعیل خاں کابلی و چند دیگر ہوا خواہوں کو طلب کر کے بعد مشورہ سامان جنگ درست کیا اور حریف سے مقابلہ کر کے بصورت صلح نامہ اودھ پر دوبارہ قبضہ حاصل کیا۔

نواب بیگم[1] نہایت سیر چشم، دل کی غنی، عاقل و فرزانہ تھیں بیکس غریبوں کو فائدہ پہونچانے کو بھولی بنتی تھیں۔ اُن کی ایک لونڈی سُکھ چین نامی جس کے پاس خزانہ کی کنجیاں رہتی تھیں۔ جب کبھی اُس کو روپیہ کی ضرورت ہوتی تو بیگم سے عرض کرتی حضور حکم ہو تو روپیوں کے توڑوں کو دھوپ دکھا دوں بیگم کی اجازت سے تھیلیوں کو دھوپ میں رکھ دیتی اور بقدر ضرورت روپیہ نکال لیتی پھر خزانہ میں رکھ کر بیگم سے عرض کرتی حضور آج اس قدر روپیہ دھوپ میں خشک ہو گیا بیگم فوراً بات کی تہ کو پہونچ جاتیں مگر کبھی باز پرس نہ کرتیں

سنہ ۱۷۳۹ء میں بزمانہ حکومت محمد شاہ شہنشاہ دہلی نادر شاہ والئی ایران ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور دہلی میں آکر بوجوہ وہاں کی رعایا کا قتل عام بھی کرایا۔ ۱۹ مارچ سنہ ۱۷۳۹ء کو برہان الملک[2] نے نادر شاہ کے ہاتھوں اپنی توہین و تذلیل کے اندیشہ سے بمقام دہلی خود اپنے ہاتھوں اپنے سفینۂ حیات کو بحر فنا میں غرق کر دیا۔ لاش اولاً دہلی میں دفن کی گئی پھر نواب بیگم نے اُن کی ہڈیاں حکیم مرزا بھچو[3] کی معرفت عراق بھجوا کر اوسی ارض مقدس میں دفن کرا دیں۔

برہان الملک[2] کی وفات پر یہ سوال پیدا ہوا کہ اُن کا جانشین کون ہو مرحوم کے بھتیجے

---

[1] تاریخ اودھ جلد سوم [2] FIRST TWO NAWABS OF OUDH

[3] قیصر التواریخ

نثار محمد خاں شیر جنگ اور بھانجہ اور داماد صفدر جنگ میں سخت مقابلہ تھا۔ شیر جنگ کہتے تھے بروئے شریعت مجھے مسند نشین ہونا چاہیئے۔ صفدر جنگ کہتے تھے میں اُن کا داماد اور بھانجا ہوں سند صوبہ داری مجھے ملنا چاہیے۔ آخر کار صفدر جنگ کی چال چل گئی۔ انھوں نے سب سے بڑی اور زوردار سفارش یعنی دو کروڑ روپیہ کی پیش کش نادر شاہ کی خدمت میں حاضر کی چنانچہ قرعہ انتخاب بھی انھیں کے نام پڑا اور خلعت صوبہ داری سے سرفراز ہو گئے۔

سنہ ۱۷۴۸ء میں جب احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر حملہ کیا تو شہنشاہ دہلی محمد شاہ نے شہزادہ احمد کو مع اعتماد الدولہ نواب قمر الدین خاں وزیر اعظم۔ نجم الدولہ محمد اسحاق خاں اور ابو المنصور خاں صفدر جنگ مقابلہ کے لیے بھیجا۔ جنگ میں وزیر اعظم اور نجم الدولہ کام آ گئے۔ صفدر جنگ کی بائیں آنکھ میں ایک تیر لگا جس سے آنکھ جاتی رہی مگر نہایت دلیری اور بے جگری سے مقابلہ کرتے رہے۔ بالآخر فتح و فیروزی سے ہمکنار ہوئے اور پرچم ظفر مندی لہراتے ہوئے دہلی واپس ہو رہے تھے کہ بمقام پانی پت شب کو اطلاع ملی کہ محمد شاہ نے بتاریخ ۲۵ اپریل ۱۷۴۸ء قضا کی اس پر ۲۸ اپریل ۱۷۴۸ء کو شہزادہ احمد نے "مجاہد الدین احمد شاہ بہادر غازی" کا لقب اختیار کر کے اپنی تخت نشینی کا اعلان کر دیا اس موقع پر صفدر جنگ نے ایک معمولی ٹوکرے پر زردوزی کپڑا منڈھ کر اس میں موتیوں کی جھالر لگائی اور بطور چتر شاہی احمد شاہ کے سر پر اپنے ہاتھوں سے بلند کر کے تخت نشینی پر مبارک باد دی۔ احمد شاہ نے موتیوں کا ایک ہار اپنے گلے سے اُتار کر اُن کے زیب گلو کر دیا اور فرمایا مجھ کو تخت نشینی اور آپ کو وزارت مبارک ہو۔ نواب نے نذر پیش کی اور آداب شکریہ بجا لائے۔ چوں کہ نواب قمر الدین خاں وزیر اعظم کا انتقال ہو چکا تھا اس لیے صفدر جنگ اُن کے بجائے کام کرتے رہے اور بتاریخ ۱۹ جون ۱۷۴۸ء احمد شاہ نے اُن کی وزارت کا باقاعدہ اعلان بھی کر دیا اور ۱۰ جولائی ۱۷۴۸ء کو اُن کے بیٹے جلال الدین حیدر کو بھی

خطاب "شجاع الدولہ" مرحمت فرمایا۔ اب صفدر جنگ کی صوبہ داری کی پگڑی میں وزارت کی کلغی بھی لگ گئی۔ سعادت خاں کو زندگی بھر وزارت کی حسرت رہی مگر یہ سعادت نصیب نہ ہوئی۔ صفدر جنگ کے لیے غیب سے سامان پیدا ہو گئے اب وہ بجائے صوبہ دار کے "نواب وزیر" مشہور ہوئے۔ صفدر جنگ کی ترقی سے نواب بیگم کی قدر و منزلت میں بھی اضافہ ہو گیا کیونکہ جو لوگ نواب وزیر کی دل جوئی اور خوشنودی طبع کے لیے قیمتی قیمتی تحائف پیش کرتے تھے وہ اُن کی بیگم کے لیے بھی گراں تمایہ اشیاء حاضر کیا کرتے تھے۔

صفدر جنگ بسلسلہ انتظام و انصرام صوبہ اودھ پاپہ گھاٹ میں مقیم تھے کہ احمد شاہ بادشاہ دہلی نے بعض امرا سلطنت و مخالفین سے تنگ آکر اُن کو خفیہ طور پر رقعہ بھیج کر مع فوج طلب فرمایا۔ مگر بدقسمتی سے اسی زمانہ میں نواب کے ایک دنبل نکل آیا جس کے اثر سے انھوں نے بتاریخ ۵ راکتوبر ۱۷۵۴ء[۱] بمقام سلطان پور اس دارِ بے مدار سے کوس رحلت بجا دیا۔ نواب بیگم نے جو سفر و حضر میں نواب کے ہمراہ رہتی تھیں اس واقعہ کو اس خیال سے کہ مبادا کوئی فتنہ عالم غربت میں اٹھ کھڑا ہو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیا اور دوسرے روز صبح کو لاش ہاتھی کی عماری میں رکھ کر سوار ہوئیں اور اُسی روز فیض آباد پہونچ گئیں۔ جب محل سرا میں داخل ہوئیں تو یہ سانحہ سب پر آشکار ہوا۔ جنازہ بڑی دھوم سے اُٹھایا گیا۔ لاش گلاب باڑی میں سونپی گئی پھر دہلی بھیج کر درگاہ حضرت نظام الدین اولیا رح سے تھوڑے فاصلہ پر سپرد خاک کی گئی جس پر شجاع الدولہ نے تین لاکھ روپیہ اور بقولے[۱] دیگر بیس لاکھ روپے کی لاگت سے ایک نہایت رفیع الشان سنگی مقبرہ معرفت شیدی بلال خاں تعمیر کرادیا جو مغلی طرز تعمیر کا ایک بہترین نمونہ تصور کیا جاتا ہے۔

صفدر جنگ[۱] کی رحلت پر نواب بیگم کے اکلوتے بیٹے نواب شجاع الدولہ مسند ریاست پر متمکن ہوئے۔ مسند نشینی کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد شجاع الدولہ اجودھیا میں ایک

---

[۱] آفتاب اودھ

کھتری کی اٹھارہ سال کی پری جمال لڑکی کو کوٹھے پر دیکھ کر ایسے فریفتہ ہوئے کہ دامن صبر و قرار ہاتھ سے چھوٹ گیا اور امراؤ گری وانوپ گری المخاطب بہ ہمت بہادر وناگوں کی معرفت لڑکی کو تاریکیٔ شب میں مکان سے اُٹھوا منگایا اور اپنی آتشِ ہوس بجھا کر کرن پھوٹنے سے قبل ہی پھر اس کو مکان بھجوا دیا۔ لڑکی کے اعزّہ نے راجہ رام نراین دیوان سے فریاد کی اور دس بارہ ہزار کھتریوں کی ایک جماعت اسمٰعیل بیگ خاں کابلی سپہ سالار فوج کے پاس بھی گئی جو چاہتے تھے کہ نواب کے بجائے نواب[1] محمد قلی خاں کو مسند نشین کر کے خود صاحب اختیار ہو کر رہیں۔ چنانچہ اس واقعہ کا حیلہ پکڑ کر انھوں نے سرداران مغلیہ کو مطلع کر کے تجویز کیا کہ اگر نواب گسائیں ہمت بہادر اور اُس کے بھائی کو برائے سزایابی حوالہ نہ کریں تو نواب محمد قلیخاں کو الہ آباد سے بُلا کر مسند نشین کر دیا جائے چنانچہ حسب قرارداد نواب بیگم کو پیغام بھیجا گیا کہ ہمت بہادر اور اُس کے بھائی کو بھیج دیجیے نواب نے جواب دیا کہ اپنے فعل کا ذمہ دار میں خود ہوں نہ کہ ہمت بہادر اور میرے جیتے جی کسی کی مجال نہیں جو ہمت بہادر کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ سکے جب یہ خبر نواب بیگم کے کانوں تک پہونچی تو راجہ رام نرائن۔ اسمعیل بیگ خاں اور دوسرے افسران مغلیہ کو در دولت پر بلوا کر کافی فہمائش کی اور کہا کہ صفدر جنگ نے تم لوگوں کی پرورش کیا اسی دن کے لیے کی تھی کہ اُن کے دشمنوں کے شریک ہو۔ یہ نہ معلوم تھا کہ اس گھر کی خرابی کے باعث تمھیں لوگ ہو گئے۔ محمد قلی خاں بُرہان الملک کے عزیز قریب ضرور ہیں مگر خاندان کا نام تو بیٹے ہی سے چلتا ہے اس کے بعد بغرض تالیف قلوب بعضوں کو خلعت اور باقی ماندہ کو پاندان عنایت کیے۔ غرض کہ نواب بیگم کی معاملہ فہمی، دور اندیشی اور حسن تدبیر سے یہ آئی ٹل گئی۔ دشمن دوستی کا دم بھرنے لگے ورنہ قیامت خیز ہنگامہ برپا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

نواب بیگم اتنی بلند حوصلہ اور اولوالعزم خاتون تھیں کہ سنہ ۱۷۶۴ء[2] میں جب شجاع الدولہ

---

[1] محمد قلی خاں مرزا محمد مقیم عرف مرزا کوچک کے بڑے بھائی مرزا محسن عزت الدولہ عرف مرزا بزرگ کے بیٹے تھے

[2] مقدمہ وارن ہیسٹنگز Impeachment of Warren Hastings

جنگ بکسر کو جانے لگے تو بیگم نے اُن سے فرمایا کہ چاہے سب انگریزوں کو جڑ بنیاد سے نیست نابود کر دینا مگر میری پالکی اٹھانے کو بارہ انگریز افسر ضرور لیتے آنا۔ شدہ شدہ یہ خبر انگریزوں کے کانوں تک پہونچ گئی چنانچہ یہ بات ہمیشہ اُن کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی اور اُن کے دل بیگم کی طرف سے کبھی صاف نہ ہوئے۔

شجاع الدولہ اپنی ماں نواب بیگم کا اتنا پاس و لحاظ اعزاز و احترام کرتے تھے کہ مولوی فیض بخش کاکوروی مصنف "فرح بخش" نے تحریر کیا ہے کہ "عالم آخرت میں اگر نواب کی نجات ہوگی تو صرف اسی سعادت مندی کے طفیل میں ہوگی" شجاع الدولہ ایک نہایت عالی شان عمارت لبِ دریا تعمیر کرا رہے تھے مگر بدقسمتی سے اُسی زمانہ میں پیامِ اجل آپہونچا اور عمارت ادھوری رہ گئی۔ شجاع الدولہ کی ران کی جڑ میں ایک دانہ نکلا تھا جو کسی صورت سے اچھا نہ ہوا آخر کار ایک ماہ تک شدید تکلیف اٹھانے کے بعد ۲۴ ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ کو بعمر چوالیس سال ۴ ماہ بوقت دو بجے شب اس عالمِ فانی سے کوچ کر گئے۔ گلاب باڑی واقع فیض آباد میں سپردِ خاک کیے گئے۔

مصنف فرح بخش نے شجاع الدولہ کی عمر کے متعلق ایک عجیب و غریب خواب کا تذکرہ کیا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:۔

"جب شجاع الدولہ شکم مادر میں تھے اور حمل کو چھ ماہ گزر چکے تھے تو انھوں نے عالم رویا میں ایک بزرگ کو جو بی تختی پر کچھ تحریر کرتے دیکھا۔ بیگم کے دریافت کرنے پر کہ آپ کون ہیں اور کیا لکھ رہے ہیں انھوں نے جواب دیا تمھارے بطن میں ایک لڑکا ہے اس کا نصیب دیکھ رہا ہوں کہ اس کو زندگی میں کون کون واقعات پیش آئیں گے۔ بیگم نے دریافت کیا کہ بچہ کی عمر کتنی ہوگی جواب ملا چالیس برس کی بیگم نے کہا یہ تو بہت کم ہے اس میں کچھ اور اضافہ ہونا چاہیے۔ انھوں نے جواب دیا

---

[1] فرح بخش مصنفہ مولوی فیض بخش کاکوروی

خیر تمھاری خاطر سے دو سال اور بڑھائے دیتا ہوں۔ اس پر بیگم اُن کی منت خوشامد کرنے لگیں مگر وہ نظروں سے غائب ہو گئے۔ اتنے میں بیگم کی آنکھ کھل گئی۔

اس خواب نے نواب بیگم کے دل پر بہت گہرا اثر کیا چنانچہ جب شجاع الدولہ کی عمر چالیس سال سے زائد ہو گئی اور وہ روہیلوں کی مدد کے لیے بمقام رام گھاٹ خیمہ زن تھے تو بیگم نے چاہا کہ ہجرت کر کے مکّہ معظمہ چلی جائیں اور وہیں قیام کریں تاکہ اُن کو وہ روزِ بد جس کا اندیشہ تھا اپنی آنکھوں سے نہ دیکھنا پڑے۔ اسی غرض سے انھوں نے ایک خط شجاع الدولہ کو بھیج کر سفر کا ارادہ ظاہر کیا۔ انھوں نے جواب دیا میں بھی ہمراہ چلوں گا مگر یہ تجویز دل کی دل ہی میں رہی شرمندۂ عمل نہ ہوئی۔

شجاع الدولہ کے انتقال پر نواب بیگم کے پوتے نواب آصف الدولہ مسندِ ریاست پر جلوہ گر ہوئے۔ اپنا نائب الریاست سیّد مرتضیٰ خاں مختار الدولہ کو مقرر کیا۔ مختار الدولہ کے بہکانے سے آصف الدولہ نے اپنی والدہ بہو بیگم سے کئی بار بہ حیلہ متروکۂ پدری لاکھوں روپے اینٹھے جب اُن سے بہت کچھ لے چکے تو اپنی دادی نواب بیگم پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہا مگر وہ اپنے باپ کی بیٹی تھیں آصف الدولہ کو کب خاطر میں لا سکتی تھیں اور اُن کی دھمکیاں بھلا اُن پر کیا اثر کر سکتی تھیں وہ فوراً تاڑ گئیں کہ یہ بس مختار الدولہ کا بویا ہوا ہے چنانچہ قرب و جوار کے زمین داروں اور راجاؤں کے نام قطعی حکم جاری کر دیا کہ کل صبح کو میری کمک کے لیے کمربستہ ہو کر درِ دولت پر حاضر ہو۔ ملک اودھ میرے باپ کا ہے آصف الدولہ کے باپ کا نہیں ہے مختار الدولہ نے جب رنگ بےڈھنگ دیکھا تو مارے دہشت کے صبح کو منھ اندھیرے پالکی میں سوار ہو کر فیض آباد سے کھسک گئے۔

نواب بیگم کی جاگیر میں بہار (و نکوش) علی گنج واقع لکھنؤ تھانہ قریب سلون بیگم گنج قریب فیض آباد اور رائے گنج کے پرگنہ جات تھے۔ اس کے علاوہ ان کو ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر حضرت محمّد شاہ شہنشاہ دہلی نے عطا فرمائی تھی۔ آصف الدولہ نے بہو بیگم کی جاگیر کے ساتھ نواب بیگم کی جاگیر بھی ضبط کر لی تھی جس پر انھوں نے امیر الامرا مرزا نجف خاں کو دہلی میں داد فریاد کا عریضہ

لکھا اگر وہ اسی زمانہ میں عالم آخرت کو رخصت ہو گئے۔ بیگم خون کا گھونٹ پی کر خاموش ہو رہیں جب آصف الدولہ اپنی والدہ بہو بیگم پر دباؤ ڈال کر اور اُن کے خواجہ سراؤں جواہر علی خاں و بہار علیخاں کو قید کر کے بہت کچھ روپیہ جبر و تعدی سے وصول کر چکے تو آخری بار مختار الدولہ فیض آباد بھیجے گئے کہ باقی ماندہ روپیہ بھی وصول کر لائیں چنانچہ جب وہ کل نقد و جنس اپنے قبضہ میں کر چکے تو بذریعہ محرم علی خاں ناظر نواب بیگم کی خدمت میں یہ پیغام[۱] بھیجا کہ یہ کل روپیہ و اسباب تو بہو بیگم صاحب نے اپنے لخت جگر کو عطا کیا ہے اب بیگم صاحب کو جو ہم دونوں کی بزرگ ہیں اس وقت کی یادگار میں کچھ انعام دے کر فدوی کو بھی افتخار بخشنا چاہیے۔ نواب بیگم بوجوہ مختار الدولہ کو اپنے خاندان کا سخت مخالف و معاند تصور کرتی تھیں مگر آصف الدولہ سے مجبور تھیں چنانچہ انھوں نے یہ جواب کہلا بھیجا کہ میرے خزانہ میں اس وقت صرف چار پانچ لاکھ روپے موجود ہیں جو میں نے زیارت مقامات مقدسہ کے لیے جمع کیے ہیں مگر کل صبح کو ڈیوڑھی پر حاضر ہوں تو اُن کو کچھ دیکر اُن کی خوشی کر دوں گی۔ یہ جواب دے کر نواب بیگم نے اپنے خواجہ سراؤں کو طلب کر کے حکم دیا کہ تم لوگ مستعد رہنا کل صبح کو جب مختار الدولہ یہاں آئیں تو اُن کو ڈیوڑھی میں بٹھا کر انعام اکرام کی باتوں میں لگا لینا جب وہ گفتگو میں مشغول ہو جائیں تو سر پر بے بھاؤ کے لگانا اور مارتے مارتے کام تمام کر دینا مگر مختار الدولہ کے کسی بدخواہ نے ان کو ان منصوبوں کی خبر کر دی اور دوسرے دن صبح کو وہ پوشیدہ طور سے لکھنؤ چلے آئے۔

نواب بیگم[۲] کے خواجہ سراؤں میں محرم علی خاں ناظر۔ التفات علی خاں۔ جاوید علیخاں میاں بحریاب۔ سخن فہم۔ میاں شفقت۔ میاں دانا۔ بختاور و تیز ہوش المخاطب بہ فراست علی خاص طور سے قابل ذکر ہیں بیگم کی محل سرا کی حفاظت و نگرانی کے لیے چار سو سپاہی نوکر تھے دربار دہلی کے قابل و حاذق حکماء و شعرا جو گردش زمانہ سے لاچار و پریشان ہو کر فیض آباد چلے آئے تھے وہ سب اُن کی سرکار میں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے اور برسر روزگار ہو گئے۔

---

[۱] فرح بخش [۲] فرح بخش

موصوفہ کے دربار میں حضرت عالمگیر اور حضرت بہادر شاہ کے زمانہ کے سب رنگ ڈھنگ تھے تقریبًا ایک ہزار آدمی اُن کے دم سے پرورش پا رہے تھے جن کی وجہ سے شہر میں بڑی رونق اور چہل پہل رہتی تھی۔

جب وہ محل سرا کے باہر کہیں ضرورت سے جاتی تھیں تو اُن کی سواری کے جلوس میں کثرت سے عصا بردار ہوتے جو نفیس اور سُتھری پوشاک پہنے ہوتے اور ہاتھیوں کی ایک لمبی قطار بھی جلوس میں ہوتی تھی جن میں سے بعضوں پر نقارے بجتے ہوتے اور بعضوں پر پھریرے لہراتے ہوتے۔ یہ کل جلوس خوش ترتیبی سے آہستہ آہستہ حرکت کرتا تھا۔ بیگم کے معاملات میں ہمیشہ صفائی رہتی۔ ظلم و ستم کا کبھی شائبہ بھی نہ پایا جاتا۔ اُن کے کل ملازمین نہایت اطمینان اور فارغ البالی سے زندگی بسر کرتے تھے۔ بتاریخ ۶ رجون ۱۷۹۶ء بزمانہ حکومت نواب آصف الدولہ بیگم نماز ظہر ادا کر رہی تھیں کہ دفعتًا مرغ روح قفس خاکی سے پرواز کر گیا۔ بروقت رحلت عمر تخمیناً ۹۰ برس کی تھی۔ لاش گلاب باڑی میں شجاع الدولہ کی قبر کے برابر دفن کی گئی۔ بنگلہ[۱] خراب شدہ سے اُن کا سِنِ انتقال نکلتا ہے۔ جملہ مورخین نے نواب بیگم کی سیرت کی بیحد ثنا و صفت کی ہے اُن میں سے اُن کے ہمعصر مورخوں کے اقوال درج ذیل کیے جاتے ہیں۔

مرزا ابوطالب مصنف تفضیح الغافلین[۲] اپنی کتاب میں تحریر کرتے ہیں:۔

"صدر جہاں بیگم نہایت عفت مآب اور دریا دل خاتون تھیں انھوں نے اپنی پوری زندگی حکومت اور امارت کے ساتھ بسر کی اور تمام عمر میں کبھی بھولے سے بھی کوئی فعل ایسا نہیں کیا جو اُن کی عظمت و سطوت کے منافی ہوتا۔ مشہور ہے کہ اُن کی ولادت کے قبل اُن کے باپ کے سر پر عسرت و فلاکت کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے مگر اُن کی پیدائش کے بعد اقبال مندی اور خوش بختی کی سرد ہوائیں ان تیرہ و تار گھٹاؤں کو بہت تیزی سے اُڑا لے گئیں اور اُن کا خاندان بے انتہا

---

۱ فیض آباد کا دوسرا نام بنگلہ تھا ۲ تاریخ اودھ مرتبہ مولانا نجم الغنی

بالا مال ہو گیا۔

مولوی فیض بخش کاکوروی مصنف تاریخ "فرح بخش" بھی اُن کے متعلق حسب ذیل رقم طراز ہیں:۔

"صدر النسا برہان الملک کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ زمانہ گزشتہ و موجودہ کی مخدرات میں بلحاظ اپنی پارسائی تقویٰ و عبادت اُن کا درجہ نہایت بلند اور ممتاز تھا اور حیا پروری، پاکبازی، فیاضی اور انصاف پسندی میں تو اُس زمانہ کی کوئی خاتون اُن کی ہمسر ہم پلہ نہ تھیں۔ علاوہ ان خوبیوں کے وہ اتنی ہمت ور اور شیر دل بھی تھیں کہ عورت ذات تو کجا بڑے بڑے سورماؤں کا زہرہ اُن کے سامنے آب ہوتا تھا۔ مقابلہ کی تاب نہ لا سکتے تھے۔ جب کبھی کوئی سیاسی گتھی پڑ جاتی تھی تو اُن کے ناخن تدبیر اُن کو ہمیشہ آسانی سے سلجھا دیتے تھے۔ سال میں تین مہینے وہ روزے رکھتی تھیں اور موتی باغ کی پشت پر انھوں نے ایک مسجد اور امام باڑہ بھی تعمیر کرایا تھا"[1]

جب بیگم دنیا سے رخصت ہوئیں تو نقد و جنس ملا کر دس یا پندرہ لاکھ سے زیادہ کا اثاثہ اُن کے یہاں سے برآمد نہ ہوا۔ یہ رقم انھوں نے برائے زیارت عتبات عالیات پس انداز کی تھی مگر آصف الدولہ نے اس خیال خام میں مبتلا ہو کر کہ انھوں نے قارونی خزانہ چھوڑا ہوگا۔ ان کے ملازمین و متوسلین پر سخت بدعت کی۔ سوگواروں کو صفِ ماتم بھی بچھانے نہیں دی۔ نواب صفدر جنگ کی تمام معمر خادماؤں کو ایک ہفتہ کے اندر اندر دولت سے نکال باہر کیا۔ محرم علی خاں و مطبوع علی خاں جو ساٹھ ستر سال سے کمال عزت و حرمت کے ساتھ اس گھر میں اپنی زندگی بسر کر رہے تھے اور جن کا لحاظ نواب شجاع الدولہ تک کرتے تھے اُن کے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر فیض آباد میں گشت کرایا اور محض شبہ کی بنا پر انھیں زد و کوب کر کے ذلیل و خوار بھی کیا۔ جب اس صورت سے بھی کچھ وصول نہ ہوا تو لکھنؤ لے جا کر اُن کی کل جائداد ضبط کر لی۔ مختصر یہ کہ ان خوش نصیب و خوش تدبیر بیگم کو اس جہان فانی سے رخصت ہوئے ایک مدت گزر چکی ہے مگر اُن کی یادگاریں پختہ رنگ کی طرح بدستور قائم ہے اور اُن کے زریں کارنامے آسمان شہرت پر تاروں کے مثل جگمگا رہے ہیں۔

۱؎ تاریخ اودھ

(۳) نواب شجاع الدولہ

۱۷۷۵ء - ۱۷۵۴ء

آپ کا نام نامی مرزا جلال الدین حیدر تھا اور خطاب "شجاع الدولہ" شہنشاہ دہلی نے عطا کیا تھا۔ تقریباً چوبیس برس کی عمر میں مسند نشین ہوئے۔ موصوف بڑے بلند حوصلہ تھے اور ان کی شہ زوری کی بڑی دھوم تھی۔ یہ نواب صفدر جنگ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ان کی شادی اُمۃ الزہرا بیگم کے ساتھ ہوئی تھی جن کا خطاب "جناب عالیہ بہو بیگم صاحبہ" تھا۔ موصوف مؤتمن الدولہ محمد اسحاق خاں صوبہ دار گجرات کی دختر نیک اختر تھیں مگر باپ اپنی پیاری بچی کا سہرا نہ دیکھ سکا پیام اجل قبل شادی ہی آ گیا۔ چنانچہ بیگم کے بڑے بھائی نجم الدولہ محمد اسحاق نے بحیثیت ولی رسوم شادی انجام دیں۔ شادی کے بعد بیگم رخصت ہو کر دہلی سے فیض آباد آئیں اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ بیگم سے نواب کے صرف ایک بیٹے نواب آصف الدولہ مرزا یحییٰ علی خاں عرف مرزا امانی پیدا ہوئے۔

بقول مصنف قیصر التواریخ بہو بیگم صاحبہ کے علاوہ نواب کی حرم میں ہزاروں ازواج اور تھیں مگر صاحب اولاد بہت کم ہوئیں۔ یہ سب بیگمیں ایک عالی شان عمارت میں رہتی تھیں جس کا نام "خورد محل" یا "حور محل" تھا۔ مؤلف تاریخ اودھ نے ان بیگمات کی تعداد دو ہزار سے زائد بتائی ہے۔

دو بجے دن کو نواب خاص محل سے برآمد ہو کر خورد محل میں داخل ہوتے تھے اگر اتفاقاً کسی رات کو کہیں باہر آرام فرماتے تھے تو صبح کو پانچ ہزار روپے بطور جرمانہ بہو بیگم صاحبہ کو بھیجتے تھے

خورد محل کی ازواج سے نواب کے صرف ۲۵ بیٹے اور ۲۲ بیٹیاں ہوئیں۔
۱۷۶۵ء میں جنگ بکسر میں انگریزوں سے شکست کھا جانے کے بعد نواب نے فیض آباد میں قیام اختیار کر لیا اور پچاس لاکھ روپے انگریزوں کو بطور تاوانِ جنگ بھی ادا کرنے پڑے مگر اُس وقت خزانہ خالی تھا۔ روپیہ کے لیے نواب نے اپنوں پرایوں سب سے کہا مگر روز سیاہ میں سب منھ موڑ گئے کسی نے حامی نہ بھری مگر اس آڑے وقت میں نواب کی بیاہتا بیوی بہو بیگم نے بڑا ساتھ دیا اور اپنا کل زرِ نقد اور بڑا زیور حتیٰ کہ ناک کی نتھ تک نواب کے حوالے کر دی جسے فروخت کر کے تاوانِ جنگ ادا کیا گیا اور نواب زندگی بھر بیگم کا احسان مانتے رہے۔
موصوف نے ۴ ذی قعدہ ۱۲۳۰ھ کو انتقال کیا میت گلاب باڑی میں دفن کی گئی۔ بعد میں قبر پر ایک عالی شان مقبرہ تعمیر ہوا۔

عالیہ سلطان بیگم

ان کا اصلی نام گنّا بیگم تھا اور نواب علی قلی خاں ظفر جنگ متخلص بہ ریاض الشعراء والہ مؤلف تذکرہ ریاض الشعراء کی بیٹی ایک طوائف کے بطن سے تھیں چنانچہ سیّد غلام علی نقوی اپنی تصنیف عماد السعادت میں اُن کی نسبی حالت کے متعلق تحریر کرتے ہیں ایک روز اعلیٰ حضرت محمد شاہ شہنشاہ دہلی نے نواب صفدر جنگ سے دریافت فرمایا کہ شجاع الدولہ کی شادی کہاں کرنے کا ارادہ ہے تو اُنھوں نے جواب دیا "چند روز کہ پیغام نسبت از خانہ علی قلی خاں داغستانی بنتِ اختی میر توزک می آید اگرچہ خان مشارٌ الیہ سیّد عباسی است و برادر زادہ حسن قلی خاں وزیر شاہ طہماسپ صفوی ثانی است لیکن چوں دخترش گنّا بیگم از بطن رام جنی است ما در خانہ زاد ازیں پہلو تہی می کند" یعنی چند روز گزرے کہ نسبت کا پیغام علی قلی خاں داغستانی چچا انگلی والے میر توزک کے یہاں سے آیا تھا۔ حالاں کہ

موصوف عباسی سید اور شاہ طہماسپ صفوی کے وزیر حسن قلی خاں کے بھتیجے ہیں مگر چوں کہ ان کی لڑکی گنا بیگم کسبی سے پیدا ہے اس لیے خانہ زاد یعنی شجاع الدولہ کی والدہ اس نسبت پر رضامند نہیں ہوتی ہیں۔ علی قلی خاں نے سنہ ۱۱۶۴ھ مطابق سنہ ۱۷۵۱ء میں انتقال کیا۔ تاریخ وفات اس مصرع سے نکلتی ہے ؎

خرد گفت بہ پیوستہ وآلہ برحمت

گنا بیگم رعنائی و زیبائی میں حور و پری کو مات کرتی تھیں۔ شجاع الدولہ اُن کے گلشن جمال کی بہار دیکھنے کے بیحد مشتاق ہوئے۔ اور شیر انداز خاں کو اُن کی ماں کے پاس نکاح کا پیغام دے کر روانہ کیا وہ بخوشی رضامند ہو گئیں اور اپنی بیٹی کو ہمراہ لے کر دہلی سے لکھنؤ کو روانہ ہوئیں جب آگرہ پہونچیں تو سورج مل جاٹ والی بھرت پور کا لڑکا جواہر سنگھ اُس کے حُسن و جمال کا شہرہ سُن کر ہزار جان سے والہ و شیدا ہو گیا اور اپنے آدمیوں کو روانہ کیا کہ جس طرح بنے گنا بیگم کو لے آئیں۔ شیر انداز خاں اور جواہر سنگھ کے ساتھیوں میں کٹرہ وزیر خاں میں جھڑپ ہوئی۔ گنا بیگم کی ماں یہ خبر سُن کر ایک شاطرانہ چال چل گئیں۔ کچھ دنوں تک تو لطائف الحیل میں بسر کی پھر ایک روز موقع پا کر لڑکی کو لے اُڑیں اور نواب احمد خاں بنگش والی فرخ آباد کے پاس پہونچیں۔ یہاں عماد الدولہ غازی الدین خاں احمد شاہ ابدالی کے خوف سے مقیم تھے وہ بھی اس شمع خوبی و محبوبی پر پروانہ وار جان نثار کرنے لگے۔ اور چاہا کہ خود اُن سے شادی رچائیں مگر نواب فرخ آباد نے شجاع الدولہ کا پاس خاطر کر کے اُن کو موصوف کے پاس بھجوا دیا۔ شجاع الدولہ نے گنا بیگم سے نکاح کر کے اُن کو عالیہ سلطان بیگم کا خطاب عطا کیا۔ موصوفہ سے نواب شجاع الدولہ کے صرف ایک بیٹے نصیر الدولہ پیدا ہوئے جو یمین الدولہ نواب سعادت علی خاں کے مختلف البطن بھائی تھے۔ سعادت علی خاں کے بھی ایک بیٹے کا خطاب "نصیر الدولہ" اور نام محمد علی خاں تھا جو بعد وفات نصیر الدین حیدر بادشاہ سنہ ۱۸۳۷ء میں محمد علی شاہ کا لقب اختیار کر کے تخت نشین سلطنت

اودھ ہوئے۔

مولانا نجم الغنی مؤلف تواریخ اودھ بحوالہ مسٹر اردن تحریر کرتے کہ "نواب عماد الملک نے بھی علی قلی خاں داغستانی کی ایک بیٹی بنّو بیگم سے عقد کیا تھا جن سے ایک بیٹے ناصر الدولہ پیدا ہوئے تھے۔ نواب عماد الملک نظام الملک آصف جاہ کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے جب وہ دکن کو روانہ ہونے والے تھے تو انھوں نے اسّی لاکھ روپیہ بطور زادِ راہ اپنے رفقاء سفر کو تقسیم کر دیا تھا مگر بعض رفقاء بعد میں پس و پیش کرنے لگے اور مختلف حیلے تراش کر اُن کی ہمرکابی سے پہلو تہی کی اور جو روپیہ کہ نواب سے وصول کر لیا تھا وہ بھی واپس کر دیا مگر موصوف کو یہ حرکت بہت ناگوار گزری اور اُن رقموں کو پھر اُنھیں لوگوں کے پاس واپس کر دیا۔ علی قلی خاں داغستانی بھی اسی زمرہ میں تھے مشہور تھا کہ انھوں نے تین لاکھ روپیہ برائے درستی سامان سفر وصول کیے تھے چوں کہ بعض وجوہات سے اُن کا سفر بھی ملتوی رہا اس لیے انھوں نے ارادہ کیا کہ نواب کا روپیہ واپس کر دیں مگر عماد الملک نے کہا کہ دوستی و یک جہتی کی حالت میں یہ طریقہ بہت نازیبا ہے جو روپیہ آپ کو پہونچا ہے اس کو اپنے صرف میں لائیے مگر یہ تواضع نکاح کے قبل کی تھی بلکہ اس وقت تک اس نسبت کا گمان بھی اُن کے ذہن میں نہ تھا۔

---

(۴) نواب آصف الدولہ

۱۷۷۵ء - ۱۷۹۷ء

یہ نواب شجاع الدولہ کے تنہا بیٹے تھے۔ ان کی سخاوت اور فیاضی کی چار دانگ عالم میں دھوم تھی۔ انھوں نے بعض وجوہ سے اپنا دارالحکومت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کیا۔ ان کے دورِ حکومت میں لکھنؤ کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ انھوں نے ۵۲ مواضعات لکھنؤ میں شامل کر کے اس کی تہذیب و تمدّن اور رونق اور چہل پہل میں چار چاند لگا دیے شہر میں انھوں نے دولت خانہ، اپنا شہرۂ آفاق امام باڑہ، ریذیڈنسی اور عیش باغ وغیرہ کی عمارتیں تعمیر کرائیں اور دیہات میں قیام کے لیے بی بی پور اور جھٹ میں کوٹھیاں بھی بنوائیں۔ ان کے دورِ حکومت میں محلے بھی بہت سے لکھنؤ میں آباد ہوئے اور لکھنؤ جو پہلے لڑکپن کی حالت میں تھا نواب کی بدولت جوانِ رعنا کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ اُن کی شادی شمس النسا بیگم . . . . . . کے ساتھ ہوئی تھی مگر بدقسمتی سے راس نہ آئی نہ بیوی سے کبھی دل ملا نہ کوئی اولاد ہی پیدا ہوئی۔ نواب کے نطفے سے صرف دو بیٹے کسی محل سے پیدا ہوئے تھے اُن میں سے، ایک کا نام زبان علی خاں تھا سودا نے دونوں بیٹوں کی تاریخ ولادت کہی تھی مگر یہ دونوں کلیاں بغیر کھلے مرجھا گئیں اور نواب کے دل کو ہمیشہ کے لیے داغدار بنا گئیں۔ اُس کے بعد موصوف بعض وجوہ سے جنسی خواہشات سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔

اُن کے بیٹوں بیٹیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے صاحب مفتاح التواریخ لکھتے ہیں کہ "نواب کے محل میں قریباً پانچ سو حسین و جمیل عورتیں جمع تھیں اُن میں کئی ایسی بھی تھیں جن کو

نواب نے حمل کی حالت میں محل سرا میں داخل کیا تھا جب کوئی بچہ ان حاملہ عورتوں کے پیدا ہوتا تو نواب جشن مناتے اور اپنے فرزند کے طور پر اس کی پرورش کرتے چنانچہ اسی قسم کے ساٹھ بچے اُن کے یہاں جمع ہو گئے تھے جن میں ۲۳ لڑکے اور باقی لڑکیاں تھیں لڑکوں میں سب سے بڑے وزیر علی خاں تھے۔ نواب کی وصیت کے موافق وہی اُن کے جانشین ہوئے۔

وزیر علی خاں کے علاوہ دوسرے قابلِ تذکرہ بیٹے رضا علی۔ شجاع علی اور دیانت علی تھے

نواب نے ۲۱ ستمبر ۱۷۹۷ء کو گلشن عالم کو الوداع کہی اور اپنے ہی مشہور عالم امام باڑہ میں موت کی میٹھی نیند سو رہے ہیں

نواب شمس النساء بیگم

محل خاص نواب آصف الدولہ

فرمانروایانِ اودھ سیاسی اغراض و مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر شادی بیاہ کے رشتے دہلی کے خاندان وزارت سے قائم کرتے تھے اسی وجہ سے قریب قریب ہر حکمران کی ایک سہرے جلوے سے بیاہی ہوئی رفیقہ حیات دہلی کی ضرور رہتی۔ مثلاً

(۱) نواب شجاع الدولہ کی محل خاص نواب اُمۃ الزہرا بیگم المخاطب بہ خطاب "جناب عالیہ" بہو بیگم صاحبہ نواب موتمن الدولہ محمد اسحاق خان کی دختر نیک اختر تھیں جو عہد دولتِ اعلیٰ حضرت محمد شاہ شہنشاہ دہلی میں دیوان خالصہ تھے۔

(۲) نواب آصف الدولہ کی بیوی نواب شمس النساء بیگم بھی دہلی کے خاندان وزارت کی چشم و چراغ تھیں۔

(۳) نواب یمین الدولہ سعادت علی خاں کی اہلیہ محترمہ نواب افضل بیگم مدار الدولہ اول نواب میر یوسف خان (مورث نواب علی نقی خاں مدار الدولہ ثانی وزیر اعظم حضرت واجد علی شاہ اودھ) کی صاحبزادی تھیں۔

(۴) شاہِ زمن غازی الدین حیدر کی بیگم خاص نواب بادشاہ بیگم صاحبہ نواب مُبشر الدولہ منجم شہنشاہ دہلی کی دُخترِ بلند اختر تھیں۔

(۵) شاہِ زماں نصیر الدین حیدر کی محل خاص نواب رقیہ سلطان بیگم المخاطب بہ نواب سلطان بہو صاحبہ شہزادہ محمد مرزا سلیمان شکوہ (برادر حقیقی حضرت شاہ عالم بادشاہ دہلی کی نورِ نظر تھیں۔

(۶) حضرت ثریا جاہ محمد علی شاہ کی زوجہ نواب جہاں آرا بیگم عرف کھیتو بیگم ملقب بہ نواب ملکہ آفاق صاحبہ نواب امام الدین خاں (نبیرہ وزیر الممالک نواب اعتماد الدولہ قمر الدین خاں وزیر اعظم حضرت محمد شاہ شہنشاہ دہلی کی صاحبزادی تھیں۔

(۷) حضرت امجد علی شاہ کی بیوی نواب تاج آرا بیگم المخاطب بہ نواب ملکہ کشور صاحبہ (مادر جانِ عالم واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ) نواب حسین الدین خاں کی بیٹی تھیں جو وزیر اعظم دہلی نواب قمر الدین خاں کے پرپوتے تھے۔ موصوف کا شجرہ خاندان حسب ذیل ہے۔

(شجرہ صفحہ ۴۱ پر دیکھیے)

اعتمادالدولہ نواب قمرالدین خاں (وزیراعظم دہلی)

نواب انتظام الدولہ خانخاناں

شمس النسا بیگم
منسوبہ نواب آصف الدولہ

نواب امام الدین خاں

حسین الدین خاں منسوب بہ
ولایتی بیگم دختر نواب سعادت علیخاں
فرمانروائے اودھ

جہاں آرا بیگم عرف کھتیسو بیگم
(نواب ملکۂ آفاق) منسوب بہ نواب
نصیرالدولہ محمد علی خاں بعدہٗ
(محمد علی شاہ) ابن نواب سعادت علیخاں

تاج آرا بیگم (نواب ملکہ کشور) منسوب بہ
حضرت امجد علی شاہ پسر محمد علی شاہ

خورشید حشمت مرزا
محمد واجد علی (واجد علی شاہ)
آخری تاجدار اودھ

مرزا محمد جواد علی
سکندر حشمت
عرف جرنیل صاحب

اشرف النسا بیگم
افسر بہو صاحبہ منسوب بہ
نواب سرفراز الدولہ ساکن
گڈھیا چودھرتھا

یہ جملہ خواتین متذکرہ بالا بہت ہی نیک سیرت، عالی دماغ، بلند حوصلہ، زیور علم سے
آراستہ، بحر ریاست کی شناور اور عصمت وعفت کی دیویاں تھیں سب دہلی کی شان و
شوکت اولوالعزمیاں در شاہی کارخانے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوئے تھیں۔ جس سے پھول
کے زیدے پھٹے ہوئے تھے۔ کسی بات کو خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ دربار لکھنؤ کا عیش ونشاط سے
بگڑا ہوا رنگ دیکھ کر ان خواتین کے سینوں پر سانپ لوٹ جاتا تھا مگر لاچاری اور بے بسی سے

پیچ و تاب کھا کر رہ جاتی تھیں۔ جذبہ خود داری بھی ان مخدرات میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا جس کی وجہ سے بعض اوقات شوہروں سے جھڑپ اور ناچاقی بھی ہو جاتی تھی۔ نواب آصف الدولہ کی خاندان وزارت دہلی میں نسبت قرار پانے کی صورت یہ ہوئی کہ جب موصوف سن شعور کو پہنچے تو والدین کو آرزو ہوئی کہ اپنے نور نظر کا سہرا دیکھ کر دل شاد کریں اور چاند سی بہو بیاہ کر لائیں اسی خیال سے نواب شجاع الدولہ اُن کے پدر نامدار نے خوش نظر علی خاں کو دہلی بھیج کر نواب امام الدین خاں خلف نواب انتظام الدولہ کو فیض آباد بلوا کر اپنا منشاء دلی اُن پر ظاہر کیا کہ میں اپنے لختِ جگر کو آپ کے والد ماجد کی فرزندی میں دے کر اُن کی دختر نیک اختر کو اپنے گھر کا چراغ بنانا چاہتا ہوں۔

مابعد علی بیگ خاں و لطافت علی خاں کو کئی ہزار فوج کے ساتھ دہلی بھیج کر نواب شولاپوری بیگم زوجہ نواب قمرالدین خاں کو دہلی سے فیض آباد بلوا کر بہت تعظیم و تکریم سے اپنا مہمان کیا اور فرائض مہمان داری بہت دریادلی اور حسن و خوبی سے ادا کیے چنانچہ سنہ ۱۱۸۱ھ مطابق سنہ ۱۷۶۶ء میں یہ نسبت قرار پائی۔ آصف الدولہ اکلوتے بیٹے ہونے کی وجہ سے اپنے والدین کی آنکھوں کا تارا ہو رہے تھے۔ اُن کی شادی شمس النساء بیگم کے ساتھ سنہ ۱۱۸۳ھ مطابق سنہ ۱۷۶۹ء میں نہایت دھوم دھام اور تزک احتشام سے فیض آباد میں ہوئی۔ جس میں نہایت بے جگری سے روپیہ پانی کی طرح صرف کیا گیا۔ مصارف شادی کا تخمینہ چوبیس[۲۴] لاکھ روپیہ کیا جاتا ہے۔ اس وقت شاہ عالم (بادشاہ دہلی) بھی فیض آباد میں موجود تھے وہ بھی رونق بخش محفل ہوئے۔ بروقت شادی آصف الدولہ کی عمر تخمیناً اکیس سال کی تھی دُلہن کو سسرال سے "نواب بہو" یا بقولے دیگر "دُلہن بیگم صاحبہ" خطاب عطا ہوا اگر بدقسمتی سے یہ شادی بالکل راس نہ آئی میاں بیوی میں ہمیشہ اَن بَن رہی بہن کی شادی کے بعد امام الدین خاں لکھنؤ ہی میں رہ پڑے اور مذہب آبائی ترک کر کے امامیہ مذہب اختیار کر لیا چنانچہ اُن کے تبدیل مذہب کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف "بادشاہ نامہ" تحریر کرتے ہیں۔

"امام الدین خاں بہادر نبیرہ قمر الدین خاں وزیر محمد شاہ بہ تقریب شادی نواب آصف الدولہ از دہلی آمدہ زیادہ از پانزدہ ہزار روپیہ مواجب می داشتند و زبدۃ الامرا شمردہ می شدند۔ با خواہر ایشان آصف الدولہ منعقد گشتند و شولا پوری بیگم را نیز دریں تقریب طلب داشتہ بودند بعد فراغ جلسہ شادی بیگم بہ دہلی مراجعت کردند امام الدین خاں سکونت نمودند۔ سرکار ایشاں نہایت کرد فر بود از ثروت خود ہم آسودہ بودند حسین الدین خاں فرزند ایشاں اند۔ وہموارہ خاندان نواب صفدر جنگ را در خاندان ایں جا سلسلہ مواصلت جاری نست بنا بر آں الحال باقی ماندگان آں خاندان ہم از ذکور و اناث بہ مقتضائے الناس علی دین ملوکہم۔ ملت امامیہ اختیار نمودہ اند۔" یعنی قمر الدین خاں (وزیر اعظم محمد شاہ بادشاہ دہلی) کے پوتے امام الدین خاں نواب آصف الدولہ کی شادی میں شرکت کی غرض سے فیض آباد آئے تھے۔ اُن کی تنخواہ پندرہ ہزار روپیہ ماہوار سے زیادہ تھی۔ اُن کا شمار اُمرا خاص میں تھا۔ اُن کی بہن سے نواب آصف الدولہ بیاہے گئے۔ شولا پوری بیگم بھی اس تقریب میں بلائی گئی تھیں۔ شادی ہو جانے کے بعد بیگم تو دہلی واپس چلی گئیں مگر امام الدین خاں لکھنؤ میں مقیم ہو گئے اُن کی سرکار نہایت شاندار تھی وہ گھر سے بھی بہت خوشحال تھے حسین الدین خاں اُن کے فرزند ہیں۔ نواب صفدر جنگ کے خاندان میں اس خاندان سے ہمیشہ شادی بیاہ کے رشتے قائم ہوتے چلے آئے ہیں اسی سبب سے اس خاندان کے کل باقی ماندہ افراد مرد و زن نے بموجب اس مثل کے کہ تمدن و طرز معاشرت میں رعایا اپنے حکمران کی پیروی کرتی ہے۔ مذہب امامیہ اختیار کر لیا۔

شمس النساء بیگم لکھنؤ کے قلعہ مچھی بھون میں رہتی تھیں۔ پرتاب گنج ساٹھ ہزار روپیہ سالانہ کی اُن کی جاگیر تھی۔ علاوہ اس کے ساٹھ روپیہ یومیہ بطور مصارف باورچی خانہ بھی سرکار آصفی سے ملتے تھے داروغہ سرکار نواب آصف الدولہ بہ معرفت رائے رتن چند مامور رہتا تھا۔ بعد رحلت نواب آصف الدولہ جب نواب سعادت علی خاں نے کچھ آمدنی بازار و پکاپل ضبط کرلی تو موصوفہ ناخوش ہوکر اپنی جاگیر چلی گئیں۔ کرنیل بیلی ریذیڈنٹ اودھ (Col: Ballie Resident of Oudh) سمجھانے کو گئے مگر رضامند نہ ہوئیں۔ ان کو قوی امید تھی کہ نواب خود آکر منالے جائیں گے مگر یہ آرزو دل کی دل ہی میں رہی۔ پرتاب گنج میں ایک مہینہ قیام کرنے کے بعد الہ آباد چلی گئیں۔ کئی مہینے کے بعد اسی عالم غربت میں خدا کے گھر سدھاریں اور وہیں سپرد خاک کی گئیں کوئی اولاد اپنی یادگار نہ چھوڑی۔

زمانہ حکومت غازی الدین حیدر میں اُن کی لاش[۱] الہ آباد سے لکھنؤ لاکر امام باڑہ آصفی کے وسطی دالان میں مرقد نواب آصف[۲] الدولہ کی بغل میں جانب مشرق دفن کی گئی حالاں کہ بعض لوگ اس کے مخالف تھے کہ جب جیتے جی دونوں میں موافقت نہ ہوئی تو بعد رحلت دونوں کی آرام گاہ میں یک جا ہونے سے کیا فائدہ ہوگا۔

غازی الدین حیدر نے ایک نقرئی ضریح بھی مثل ضریح قبر پر رکھوا دی تھی مگر اب صرف نواب مرحوم کی قبر پر ایک نقرئی کٹہرا لگا ہوا ہے جس کے آگے ان کا ایک تمغہ شیشے کے خانہ میں رکھا ہوا تھا جس کو تھوڑا عرصہ گزرا کوئی ذات شریف کھسکا لے گئے۔

---

[۱] قیصر التواریخ جلد اول [۲] مس سڈنی نے (Miss Sydney Hay) اپنی کتاب موسومہ ہسٹارک لکھنؤ (Historic Lucknow) میں بغیر جانچ تحقیق کیے لکھ مارا ہے کہ آصف الدولہ کی قبر کے برابر امام باڑہ کے خاص معمار کفایت اللہ شاہ جہاں پوری کی قبر ہے مگر یہ بیان حقیقت سے بالکل معرا ہے۔ آصف الدولہ کی قبر کے برابر

اب ایک نقلی شملہ اسی خانہ میں رکھا ہوا ہے۔ بیگم کی قبر کا اب نشان تک قائم نہیں ہے۔

شاہ غازی الدین حیدر نے بیگم مرحومہ کے متعلقین کی پرورش کا بھی معقول انتظام کر دیا تھا۔ بتاریخ ۲۰ نومبر ۱۸۱۴ء انھوں نے ایک کروڑ ہ لاکھ پچاس ہزار روپے بطور قرض دوام ایسٹ انڈیا کمپنی کو بہ تقرر سود چھ روپیہ فی صد سالانہ دیدیے جس کے سود سے منجملہ دیگر اشخاص کے متعلقین بیگم مرحومہ کے جن کی مجموعی تعداد پندرہ اشخاص پر مشتمل تھی مبلغ چار ہزار روپے ماہوار بطور وثیقہ نسلاً بعد نسلٍ مقرر کر دیئے یہ کل وثیقے ۱۴ نومبر ۱۸۱۴ء سے جاری کیے گئے۔ اور مرزا ... صاحب وغیرہ متعلقین مرحومہ کو برائے سکونت حویلی نواب ناظر تحسین علی خاں متوفی بھی متصل دولت خانۂ قدیم عطا کی گئی۔

شمس النسا بیگم کو شعر و سخن سے بھی ذوق تھا تخلص معلوم نہیں ہے .... خو . . . . صاحب دیوان بھی تھیں۔ آصف الدولہ ان کے شوہر نامدار کو بھی شعر و شاعری سے خاصہ لگاؤ تھا۔ خود بھی شعر کہتے تھے اور اچھے اشعار پر دم دیتے تھے۔ اکثر شعرا اُن کے دستر خوان کرم سے پرورش پاتے تھے۔ اس وقت لکھنؤ اور دہلی کی کیفیت چڑھتے چاند اور اُترتے چاند کی سی ہو رہی تھی۔ لکھنؤ بس رہا تھا اور دہلی اُجڑ رہی تھی۔ اور آصف الدولہ کی فیاضیوں اور زر پاشیوں کی بدولت لکھنؤ کی رونق اور آراستگی دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔ ان کے زمانہ ریاست میں کئی ممتاز اور نامور شعرا دہلی و فیض آباد کی سکونت ترک کر کے بخیال قدر دانی نواب لکھنؤ چلے آئے اور یہیں کے ہو رہے۔

نواب نے بھی از راہِ سرپرستی سب کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اُن کی خاطر اور دلداری تک کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ آصف الدولہ کا دیوان آصفیہ حیدر آباد دکن کے کتب خانہ

---

(۱) اُن کی زوجہ شمس النسا بیگم کی قبر ہے۔ کفایت اثر کی قبر امام باڑہ و مسجد موسومہ بلدار مسجد متصلہ صاحب گنج لکھنؤ میں ہے مگر امام باڑہ منہدم ہو چکا ہے۔

میں موجود ہے

نواب آصف الدولہ کی ایک غزل اور نواب بیگم کی جوابی غزل درج ذیل ہے۔ یہ دونوں غزلیں "دیوان جہاں مرتبہ منشی بینی نرائن کے قلمی نسخہ سے ماخوذ ہیں جو لکھنؤ یونیورسٹی کے کتب خانے میں موجود ہے۔

غزل آصف

تری تیغ جب ہم علم دیکھتے ہیں
دبیں سر کو اپنے قلم دیکھتے ہیں

جو جلوہ صنم تجھ میں ہم دیکھتے ہیں
خدا کی خدائی میں کم دیکھتے ہیں

شتابی سے آوے نہ میرے مسیحا
کوئی دن کو راہ عدم دیکھتے ہیں

ملے تم جو میرے رقیبوں سے جا کر
ہمیں ہیں کہ سو سو ستم دیکھتے ہیں

بہت جھوٹے وعدے کیے تو نے ہم سے
بھلا ہم تو تیری قسم دیکھتے ہیں

جوابی غزل
نواب بیگم

خوشی دل میں ہم اپنے کم دیکھتے ہیں
اگر دیکھتے ہیں تو غم دیکھتے ہیں

نہ قطرہ کوئی خون کا باقی ہے دل میں
نہ آنکھوں میں ہم اپنی نم دیکھتے ہیں

تو آئے نہ آئے یہاں ہم تو ہر شب
پڑے راہ تا صبحدم دیکھتے ہیں

نگاہ کرم جب جگہ پہ کرے تو
ہم اس جا پہ باغ ارم دیکھتے ہیں

کرم سے ترے شاد و خرم ہیں یہ سب
مگر ایک ہم ہیں کہ غم دیکھتے ہیں

زیادہ جو یعقوب سے غم ہمارا
جو ہم تجھ کو یوسف سے کم دیکھتے ہیں

تو آئے نہ آئے یہاں ہم تو ہر شب
پڑے راستہ صبحدم دیکھتے ہیں

جو چاہیں کہ لکھیں کچھ احوال دل کا
تو ہاتھوں کو اپنے قلم دیکھتے ہیں

بتوں کی گلی میں شب و روز آصف
تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں

تبسم بہ لب ہیں تمامی یہ مردم
پہ ہم اپنی آنکھوں میں نم دیکھتے ہیں
تمہیں کیا غرض ہے جو آؤ یہاں تک
ہمیں آن کر اب قدم دیکھتے ہیں
کہاں تاب ہے غیر کو دیکھنے کی
اگر دیکھتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں
کہا ہے جو تم نے یہ اپنی غزل میں
تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں
دکھا دیکھنا ہے جو دیکھے ہے سب کچھ
نہ تم دیکھتے ہو نہ ہم دیکھتے ہیں

نواب سعادت علی خاں

۱۷۹۸ء - ۱۸۱۴ء

نواب آصف الدولہ کی رحلت کے بعد اُن کے پسر متبنیٰ نواب وزیر علی خاں مسند نشین ریاست ہوئے مگر ۴ ماہ ۵ یوم حکومت کرنے کے بعد بوجوہ معزول کر کے بنارس بھیج دیے گئے۔ اور ان کے بجائے نواب سعادت علی خاں مسند ریاست پر متمکن ہوئے چوں کہ نواب کا حق وراثت مشتبہ تھا۔ صرف انگریزوں کی نظر عنایت سے عروس حکومت سے ہم آغوش ہوئے تھے اس لیے انگریزوں نے اس کارگزاری کے معاوضہ میں مصارف فوج پورا کرنے کے حیلہ سے نصف ملک اودھ جس کی آمدنی ایک کروڑ ۳۵ لاکھ روپیہ سالانہ نواب کی رضامندی سے اپنے قبضہ میں کر لیا مگر یہ کانٹا نواب کے دل میں ہمیشہ کھٹکتا ہی رہا۔ موصوف نے سولہ برس تک کمال دور اندیشی، تدبر، کفایت شعاری اور تندہی سے حکومت کی۔ شروع میں پانچ برس تک دولت خانہ آصفی میں قیام پذیر رہے اس کے بعد بیمار پڑ کر کوٹھی فرح بخش میں منتقل ہو گئے اور وہیں قیام اختیار کر لیا۔

انھوں نے قیصر باغ اور دلکشا کے درمیان بہت سی عمارتیں تعمیر کرائیں اور بہت سے محلے بھی ان کے دور حکومت میں آباد ہوئے۔

نواب کے دس بیٹے اور پانچ بیٹیاں مختلف محلات سے تھیں۔

۱۱ر جولائی ۱۸۱۴ء کو نواب کو یخنی میں زہر دے کر اُن کے سلسلۂ حیات کو منقطع کر دیا گیا۔ بروقت انتقال انھوں نے خزانہ میں سترہ کروڑ اور بقولے دیگر چودہ کروڑ روپیے چھوڑے۔ محلہ خاص بازار میں سپرد خاک کیے گئے اس کے بعد اُن کے فرزند نواب غازی الدین حیدر نے قبر پر ایک قابل دید عظیم الشان مقبرہ تعمیر کرا دیا۔ نواب کے صرف خاص محلات کے حالات درج ذیل ہیں۔

افضل بیگم

افضل بیگم۔ یہ نواب یمین الدولہ سعادت علی خاں پسر نواب شجاع الدولہ کی بیاہتا بیوی تھیں سعادت علی خاں سنہ ۱۷۹۸ء سے لے کر سنہ ۱۸۱۴ء تک فرمانروائے اودھ رہے۔ اُن کی شادی بیگم موصوفہ کے ساتھ دوران قیام بنارس ہوئی۔ اُن سے نواب کے دو بیٹے امیر مرزا خاں اور امراؤ مرزا خاں پیدا ہوئے مگر دونوں صغر سنی ہی میں داغ مفارقت دے گئے۔ پہلا چیچک کی نذر ہو گیا، دوسرا کسی اور مرض کا شکار ہوا۔ افضل بیگم نواب میر یوسف مدار الدولہ کی بیٹی مستورہ بیگم کے بطن سے تھیں۔ مدار الدولہ[1] کے نسبی حالات یہ ہیں کہ خواجہ محمد یعقوب اور خواجہ محمد موسیٰ دو حقیقی بھائی خواجہ بہاء الدین نقشبند کی اولاد میں تھے۔ خواجہ محمد یعقوب کو شہزادہ مراد بخش ابن شاہ جہاں شہنشاہ دہلی کی بیٹی منسوب تھیں اور خواجہ محمد موسیٰ شہزادۂ روشن گوہر المخاطب بہ نواب سربلند خاں کی شادی سلطان معز الدین جہاندار شاہ بادشاہ دہلی کی صاحبزادی جہاں آرا سے ہوئی تھی۔ میر محمد امین نے جو آگے چل کر نواب سعادت خاں و برہان الملک کے خطابات سے سربلند ہوئے۔ سنہ ۱۱۲۰ھ مطابق سنہ ۱۷۰۸ء میں ایران سے ہندوستان آکر انھیں نواب سربلند خاں کی سرکار میں سترہ روپیہ[2] ماہوار پر فراشوں میں ملازمت کی تھی۔ مدار الدولہ اول انھیں خواجہ محمد موسیٰ کے بیٹے تھے مگر بطن ملکہ سے نہ تھے چنانچہ سید غلام علی نقوی اپنی تصنیف عماد السعادت میں تحریر کرتے ہیں

"والا شان (مدار الدولہ اول) خواجہ موسیٰ خاں در ہندوستان آمدہ داماد معز الدین جہاندار شاہ شد، لیکن نواب موصوف از بطن ملکہ نیست، اولاد

۱؎ قیصر التواریخ ۲؎ عماد السعادت ۳؎ تاریخ ضیغمی

ملکہ ہمیشہ در قلعہ می بودند و آنہا را خواجہ زادہ می گفتند لیکن بعد ہنگامہ غلام قادر خاں از قلعہ بر آمدند و جا بجا متفرق شدند۔ بعضے بہ حیدر آباد و بعضے بہ ملک راجپوتان پارہ بہ آرکاٹ رفتند و دو یا سہ کس در لکھنؤ شب را بروز آرند۔ بالجملہ خواجہ موسیٰ خاں را سوائے اولاد بطن ملکہ چند پسر و چند دختر بودند یکے۔ نواب مدار الدولہ و دیگر میر عظیم الدین و میر بہاء الدین۔

(ترجمہ) یعنی مدار الدولہ اول کے والد خواجہ موسیٰ خاں نے ہندستان آکر معز الدین جہاندار شاہ کی شاہزادی سے شادی کی مگر نواب موصوف شہزادی سے نہیں ہیں۔ شہزادی کی اولاد ہمیشہ قلعہ میں رہتی تھی اور وہ لوگ خواجہ زادہ کہلاتے تھے لیکن غلام قادر خاں کی شورش کے بعد یہ لوگ قلعہ سے نکل کر ادھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ کچھ حیدر آباد پہونچے بعض راجپوتانہ اور آرکاٹ چلے گئے اور دو یا تین لکھنؤ میں مقیم ہیں، مختصر یہ کہ اولاد شہزادی کے علاوہ خواجہ موسیٰ خاں کے چند لڑکے اور لڑکیاں اور ہیں۔ اُن میں سے ایک مدار الدولہ اور دوسرے عظیم الدین و میر بہاء الدین ہیں۔

خواجہ محمد موسیٰ کا آبائی مذہب اہلِ سنت تھا مگر نواب سعادت خاں برہان الملک کی صحبت میں مذہب قدیم ترک کر کے امامیہ مذہب اختیار کر لیا تھا۔ برہان الملک نے موصوف کو علاقہ مچھرہٹہ متعلقہ خیر آباد جمعی ساٹھ ہزار روپیہ سالانہ بطور جاگیر اور وکیل السلطنت مختار مدار والہ بہادر صمصام جنگ خطاب بھی عطا کیا۔ چنانچہ عماد السعادت میں مرقوم ہو کہ

"خواجہ موصوف (خواجہ محمد موسیٰ) در ابتدا از جہت تولد در توران و صحبت بزرگان خود سنی بود و در ہندوستان چوں صحبت نواب برہان الملک دریافت بہ مذہب اثنا عشری میل نمود لیکن بکمال اخفا و مدار الدولہ ہرگز اخفائی مذہب کہ در اثنا عشری تقیہ ہمیں است بخاطر نداد و باعلان تعزیہ داری می کرد

یعنی خواجہ محمد موسیٰ شروع میں بہ سبب پیدائش ملک توران وصحبت بزرگان
سُنی المذہب تھے جب ہندوستان میں بُرہان الملک کی صحبت اُٹھائی
تو امامیہ مذہب کی طرف رغبت ہوگئی مگر اس راز کو بہت پوشیدہ رکھتے تھے
کیونکہ شیعہ مذہب میں اسی کو تقیہ کہتے ہیں لیکن مدار الدولہ اپنے مذہب کو بالکل
نہیں چھپاتے اور کھلم کھلا تعزیہ داری کرتے تھے اور کرتے ہیں ۔

نواب مدار الدولہ کی کئی بیویاں تھیں لیکن افضل بیگم نواب صمصام الدولہ کی دختر مستورہ بیگم
سے پیدا تھیں جن کی نسبت نواب شجاع الدولہ کے عہد دولت میں نواب سعادت علی خاں کے
ساتھ قرار پاگئی تھی مگر عقد کی نوبت نہ آئی تھی ۔

نواب مدار الدولہ کی کل بیویوں سے بارہ بیٹے اور دو بیٹیاں حسب ذیل تھیں :-
(۱) اسد الدولہ نواب امجد علی خاں (۲) حسین علی خاں (۳) حسن علی خاں جن کے بیٹے زین العابدین
خاں اور پوتے باقر علی خاں تھے (۴) عباس علی خاں (۵) احتشام الدولہ رئیس الملک
محمد علی خاں جن کے ایک بیٹے علی نقی خاں واجد علی شاہ کے زمانۂ حکومت میں مدار الدولہ
ثانی کے خطاب سے سرفراز ہو کر وزیر اعظم سلطنت اودھ ہو گئے تھے (۶) شریف الدولہ
احمد علی خاں جن کے دو بیٹے نواب علی خاں اور اکرام الدولہ حسین مرزا خاں مکرم الملک
اور ایک دختر گوہر آرا بیگم تھیں جو نواب علی نقی خاں کو منسوب تھیں اور نواب علی خاں
کی بیٹی عالم آرا بیگم واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کو منسوب تھیں ۔ اکرام الدولہ کے دو بیٹے
اصغر علی خاں اور حسن رضا خاں اور ایک بیٹی تھیں جو واجد علی شاہ کے مخبوط الحواس
بیٹے مرزا نوشیرواں قدر کو منسوب تھیں (۷) جعفر علی خاں (۸) علی رضا خاں (۹) قاسم
علی خاں (۱۰) مہدی علی خاں جن کو سعادت علی خاں نے آبدار خانہ کا مہتمم مقرر کیا تھا
(۱۱) علی محمد خاں (۱۲) میر علی خاں ۔ منجملہ دو بیٹیوں کے ایک کی شادی زین العابدین
خاں کے بیٹے میر نقی خاں کے ساتھ ہوئی اور چھوٹی بیٹی افضل بیگم بعد وفات نواب

شجاع الدولہ اُن کے بیٹے نواب سعادت علی خاں کو بمقام بنارس بیاہی گئیں۔ موصوفہ نے شہر مذکور ہی میں انتقال کیا ان کا مقبرہ درگاکنڈ (بنارس) میں ہے۔

نواب شجاع الدولہ نے بامداد سپاہ انگریزی حافظ الملک حافظ رحمت خاں والی روہیلکھنڈ کو شکست دے کر بریلی دپیلی بھیت وغیرہ کا حکمراں (گورنر) سعادت علی خاں کو مقرر کیا۔ مگر جب آصف الدولہ مسند نشین ریاست ہوئے تو انھوں نے سعادت علی خاں کو لکھنؤ واپس بلاکر اُن کے بجائے راجہ صورت سنگھ کو گورنر مقرر کردیا۔ اسی زمانہ میں نواب آصف الدولہ کو موت کے گھاٹ اُتارنے کی سازش ہوئی جس میں سعادت علی خاں وغیرہ شریک تھے، مگر جس کو اللہ رکھے اس کو کون چکھے۔ یہ کوشش ناکام ہوئی اور سعادت علی خاں بھاگ کر آگرہ پہونچے جہاں نجف خاں کارپرداز سلطنت دہلی کی نظر عنایت سے علاقہ ہنڈون دبیانہ بطور مدد معاش کے پایا مگر بوجہ قرابت قریبہ موصوف نے علاقہ مذکور مدارالدولہ اول کے سپرد کردیا

نواب آصف الدولہ اور سعادت علی خاں میں بوجوہ چند درچند صفائی نہ تھی۔ اس لیے اول الذکر نے مدارالدولہ کی جاگیر مچھر مٹہ ضبط کرلی جس پر انھوں نے نیڈیلوں کی مدد سے فتنہ وفساد برپا کیا چنانچہ فوج شاہی وانگریزی تنبیہ کو روانہ ہوئی اور اسی معرکہ کارزار میں مدارالدولہ کام آگئے۔ اُس کے بعد عہد نواب سعادت علی خاں میں اس خاندان کا پھر ستارہ چمکا اور بوجہ اعتماد دقرابت خدمت آبداری نواب مہدی علی خاں پسر یازدہم مدارالدولہ کو تفویض ہوئی۔

منشی رام سہائے تمنا۔ افضل التواریخ میں لکھتے ہیں:۔ "پرگنہ ہذا یعنی مچھر مٹہ عہد حضرت جنت آرامگاہ (نواب سعادت علی خاں) میں تحصیل و دفتر شاہی میں داخل کر لیا گیا مگر تنخواہ ہر ایک اولاد کی نواب موصوف کے خزانہ شاہی سے مقرر ہوگئی۔"

مگر حضرت امجد علی شاہ نے بہ فہمائش مجتہد العصر اقربائے مدارالدولہ کی کئی برس تک تنخواہ نہ دی۔ سب فاقہ کشی سے مرنے لگے، ولی عہد مرزا واجد علی خاں (مالبعہ الجد علیشاہ)

کی سفارش بھی کچھ کارگر نہ ہوئی، ایک دن نواب مہدی علی خاں پسر مدار الدولہ اول نے تنگ آکر جنرل کانفیلڈ ریذیڈنٹ لکھنؤ سے کہا کہ جب ہم لکھنؤ کی سکونت ترک کرنے پر مجبور ہوں گے تو سرکار میں اپنی بہن افضل بیگم کا مہر نامہ کئی کروڑ روپیہ کا ضرور پیش کریں گے صاحب نے جواب دیا ہم خوب جانتے ہیں کہ اتنی بڑی رقم کے لیے اودھ کی سلطنت بک جائے گی۔

بتاریخ ۱۳ فروری سنہ ۱۸۴۷ء حضرت امجد علی شاہ نے رحلت کی اُن کے پسر اکبر ولی عہد واجد علی شاہ نے جن کو نواب علی خاں ابن مدار الدولہ کی بیٹی عالم آرا بیگم منسوب تھیں تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ موصوف نے صرف چند ماہ کے بعد امین الدولہ نواب امداد حسین خاں وزیر اعظم کو موقوف کر کے اُن کے بجائے نواب علی نقی خاں نبیرہ مدار الدولہ اول کو وزیر اعظم مقرر کر کے "مدار الدولہ ثانی" "حضور عالم" کا خطاب عطا کیا اور نواب خاص محل عالم آرا بیگم بنت نواب شریف نواب علی خاں کے دباؤ سے سب کی تنخواہیں بحال ہوئیں۔ اُس کے بعد واجد علی شاہ نے مدار الدولہ ثانی نواب علی نقی خاں کی ایک لڑکی رونق آرا بیگم سے بھی سنہ ۱۲۶۷ھ میں شادی کر کے اُن کو "اختر محل" خطاب دیا۔ انھیں مدار الدولہ ثانی کے زمانۂ وزارت میں بتاریخ ۷ فروری سنہ ۱۸۵۶ء سلطنت اودھ ضبط ہو کر مقبوضاتِ انگلشیہ میں شامل ہو گئی۔ اور بادشاہ کلکتہ تشریف لے گئے۔ چھ ماہ کے بعد حضور عالم بھی مع اپنے صاحبزادی اختر محل کلکتہ پہونچ گئے۔ اس کے بعد سنہ ۱۲۸۶ھ مطابق سنہ ۱۸۶۹ء میں پہلے پہل لکھنؤ آئے اور یہیں بتاریخ ۲۱ رمضان سنہ مذکور کو نواب محسن الدولہ کے مکان پر ہیضہ سے انتقال کیا۔ لاش کربلائے معلیٰ بھیجی گئی۔ منشی رام سہائے تمنا افضل التواریخ میں تحریر کرتے ہیں

جب کبھی دستِ تقرب خاندان مدار الدولہ ریاست اودھ سے چھوٹ گیا، ماہِ دو ہفتہ کے مانند ریاست کو اس خاندان کے متعلق تنزل سے بدنمائی حاصل ہوئی

---

[1] تاریخ ضیغمی

عہد جنت آرام گاہ (نواب سعادت علی خاں) میں جو گزرا روشن و آئینہ ہے۔
اس وقت سوائے انتزاع سلطنت کے قہر سلطنت بلائے تحت الشعاع میں مبتلا ہوا
(یعنی نصف ملک انگریزوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ مؤلف) پھر اس خاندان کا توسل
سرکار اودھ سے منقطع ہوگیا۔ رشتہ مندی دربارہ اس خاندان کی اولاد امجد علی
شاہ سے اُس عہد میں قایم ہوئی جب وہم و قیاس بھی اُس کا نہ تھا۔ جب پایہ
سریر خلافت جلوس واجد علی شاہ سے ہم پایہ عرش ہوا۔ یہ خاندان بھی بہ تو
اقبال بادشاہ سے بیباک اُٹھا۔ دونوں خاندانوں میں رشتہ داریاں قائم ہوئیں
مگر عہد وزارت علی نقی خاں میں نقش سلطنت ہی نگین ریاست اودھ سے
محکوک ہوگیا۔

ٹاٹ محل

ٹاٹ محل ان کو نواب یمین الدولہ سعادت علی خاں فرمانروائے اودھ نے اپنی
مسند نشینی سے قبل بہ زمانہ قیام بنارس اپنی رفیقہ حیات بنایا تھا موصوف کو اُن کی چاہت
اور محبت بھی بہت تھی۔ بیگم کے پاؤں میں پدم تھا۔ چنانچہ ایک نجومی نے عرض کیا کہ اس
علامت والی عورت کے شوہر کو بادشاہ یا وزیر ہونا چاہیے۔ چونکہ موصوف بھی لیلائے
سلطنت کے بہت شیدائی تھے۔ انھوں نے اس کلام سے متاثر ہوکر ٹاٹ محل کو زمرۂ عوام
سے علیحدہ کرکے خواص محل میں داخل کردیا اس روز سے "خاص محل" مشہور ہوئیں[1] ۱۷۹۸ء
میں مسند نشین ریاست ہونے پر سعادت علی خاں نے انھیں علاقہ نواب گنج جس کی ایک لاکھ
بیس ہزار روپیہ عطا کیا۔

ٹاٹ محل سے نواب موصوف کے صرف ایک بیٹے نواب جلال الدولہ شجاع الملک

---

[1] قیصر التواریخ جلد اول۔

مرزا مہدی علی خاں شجاعت جنگ پیدا ہوئے جو نواب کے سب سے چھوٹے فرزند تھے اسی سبب سے سعادت علی خاں اُن سے مانوس بھی بہت تھے۔ جلال الدولہ کو نہ خود شادی سے رغبت تھی نہ اُن کے پدر نامدار کو ہی اس کا خیال آیا بقول مصنف قیصر التواریخ اُن کی خدمت میں فقط دو تین حرمیں رہا کرتی تھیں۔

منشی رام سہائے تمنا بھی افضل التواریخ میں تحریر کرتے ہیں:۔

" جلال الدولہ نشاط باغ املاک مہاراجہ ٹکیت رائے میں اکثر مقیم رہتے تھے، وہیں عورات عدم صحبت تخلیہ میں حاضر رہتی تھیں۔ ٹاٹ محل کے پاس جواہرات کے علاوہ کروڑ روپے نقد لطور امانت تھے جو ماہو لال[1] کا تھ دیوان خانگی کی تحویل میں اس شرط سے تھے کہ اُن کا سود جمع کرتا رہے مگر اُس نے زر امانت میں سے دو تین لاکھ روپیہ لے کر اپنی عمارتیں تعمیر کرائیں اور اس کنڈے پن سے عروس عیش سے ہمکنار ہوا کہ خاص محل کی بہت بدنامی ہو گئی۔ نواب معتمد الدولہ آغا میر نے کل حالات شاہ غازی الدین حیدر پسر سعادت علی خاں کے گوش گزار کیے اور کروڑ روپیہ کا مطالبہ اس کے ذمہ عاید کر کے اسے کشاں کشاں بے آبروئی کے ساتھ بلوایا۔ پہلے بہت برا بھلا کہا پھر ایک کوٹھری میں بند ہوا کر سخت تشدد کیا اور اتنی مار کھلوائی کہ اس کی جان لبوں پر آگئی۔ جلال الدولہ بھی اُس سے اس لیے ناخوش تھے کہ جب وہ رنگ رلیاں منانے کو اس سے روپیہ طلب کرتے تھے تو وہ صرف بقدر ضرورت دے دیتا تھا کچھ زائد نہیں دیتا تھا۔ حُسن اتفاق سے اُسی زمانہ میں غازی الدین حیدر نے مبلغ پچاس ہزار روپیہ اپنے سوتیلے بھائی جلال الدولہ کو ولادتِ فرزند کی تقریب میں صرف کرنے کو عنایت فرمائے مگر معتمد الدولہ نے زر نقد کو ادا کرنے کے وعدہ پر موصوف کی مہری زید منگوا کر ایک کروڑ کی رقم مع مبلغ پچاس ہزار روپیہ

[1] ماہو لال کی چڑھائی محلہ چوپٹیاں میں ۱۹۱۶ء تک موجود تھی مگر گلبر پارک کی تعمیر کے وقت بند کر دی گئی کچھ حصہ اب تک موجود ہے۔

مُجرا کر لیے اور آ موں لال سے کئی لاکھ روپیہ مدرانہ لے کر سمجھوتہ کر لیا مگر بعد میں
باقی ماندہ رقم کے لیے وعدہ خلافی کر کے اس کو پھر گرفتار کرا لیا اور اپنی امانت و
دیانت ظاہر کرنے کو اُسے تازیانے بھی لگوائے مگر چند روز کے بعد رہا کر دیا۔

جلال الدولہ کا کل اثاثہ بہ سبب قلت مداخل کثرت مصارف صرف چند سال کے عرصہ
میں خال سے لگ گیا۔ بوجہ فضول خرچی و اسرافِ بے جا ماں محل نے بھی اُن کی اعانت
سے ہاتھ روک لیا انھیں وجوہ سے بساطِ انبساط اُلٹ گئی اور ملازمین بھی رفو چکر ہو گئے۔
ماں تو الی دار وخشہ و کارگزار بیگم صاحب نے اپنے بچاؤ کے لیے نواب معتمد الدولہ اور خواتین
کنبوہ سے موافقت پیدا کی۔ جلال الدولہ سے کشیدہ رہا۔ نواب دربارِ شاہی میں اکثر جاتے
مگر اُن کی تنخواہ مثل اور بھائیوں کے نہ ملتی تھی۔ آخر تنگ ہو کر دربار کا جانا ترک کر دیا۔
اتفاقاً تادہ ہیضہ میں مبتلا ہو گئے۔ حالت نازک ہو گئی خاص محل کی مامتا نے جوش مارا باغ
میں تشریف لے گئیں نواب کی تیمارداری میں مصروف ہوئیں۔ حکیم میر ابو [قبلہ] ملازم بیگم
صاحب معالج ہوئے۔ خدا خدا کر کے شفا ہوئی۔ فی الجملہ بیگم صاحب اخراجات کی کفیل
ہوئیں۔ نواب بھی مجبوری سے اُن کی اطاعت کرنے لگے۔

نواب سعادت علی خاں نے ۱۸۱۴ء میں انتقال کیا۔ ان کی رحلت کے بعد ماں محل
دولت سرائے خاص موسومہ فرح بخش سے باؤلی والے مکان میں منتقل ہو گئیں جس کو نواب
آصف الدولہ نے سلاطین کے قابل تعمیر کرایا تھا چونکہ نواب جلال الدولہ کو اپنی ماں سے
موافقت نہ تھی اس لیے اُن سے علیحدہ نشاط باغ محلہ کہ مہاراجہ ٹکیت رائے میں جا کر رہے
جس کو اپنی پسند کے موافق خوب آراستہ کیا۔ اور عیش و نشاط شاہانہ شروع کر دیا۔ اکثر ملازم
تیر انداز وغیرہ نوکر ہوئے۔ تیر اندازی اور بندوق لگانے میں وہ خود بھی کامل تھے۔ ان کے
شریک جلسہ صحبت عیش فقط نواب حسین الدین خاں واجد علی شاہ کے نانا تھے۔

لہ ہمارے شہر لکھنؤ کے نامور حکیم محمد قاسم صاحب عرف حکیم صاحب عالم انھیں حکیم میر ابو کی ذریت میں ہیں۔

ثانی محل نے بزمانہ وزارت نواب معتمد الدولہ انتقال کیا۔ نواب جلال الدولہ سترد کہ مادری وجاگیر نواب گنج سے محروم رہے جواہرات وتحفہ اسباب ماہولال نے بخوف جان ومال نواب معتمد الدولہ خواتین کمبوہ کے حوالہ کر دیا۔ ماں کے سایہ عاطفت سے محروم ہو جانے کے بعد جلال الدولہ بامید موہوم چند روز تک دربار میں حاضر ہوا کیے مگر جب کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو مایوس ہو کر خانہ نشین ہو گئے۔ باہر نکلنا بالکل موقوف کر دیا۔ جب اس تکلیف سے بھی تنگ آ گئے تو ایک روز شب کو جس قدر اشرفیاں وجواہرات ہاتھ آیا وہ لے کر اور مینا سنگھ زمین دار کے گھوڑے پر سوار ہو کر خفیہ کان پور پہونچے۔ وہاں سے ڈاک میں کلکتہ روانہ ہو گئے کئی دن کے بعد ہرکاروں نے سرکار میں خبر کی۔ مگر کسی کے کان پر جوں بھی نہ رینگی۔

کلکتہ میں جب نواب شمس الدولہ احمد علی خاں برادر مختلف البطن سے ملاقات ہوئی تو وہ بہت خوش ہوئے اور نہایت محبتانہ برتاؤ کر کے فرمایا کہ انشاء اللہ ہم تم ایک ساتھ عتبات عالیات کو چلیں گے۔ اس اثنا میں نواب شمس الدولہ نے انتقال کیا وہ چاہتے تھے کہ اپنے بھتیجے جی چار لاکھ روپیہ کے سرکاری نوٹ خرید کر نواب کی نذر کریں۔ ایک روز حضرت بیگم نواب شمس الدولہ باتوں باتوں میں کچھ طعنہ زن ہوئیں مگر نواب نے جواب دیا میں کلکتہ رہنے کو نہیں آیا ہوں نہ کسی کا محتاج ہوں میری زاد راہ تین سو اشرفیاں اور کچھ جواہرات بھی موجود ہیں

نواب[1] کو زیارت عتبات مقدسہ کی دلی آرزو تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد اب اُن کا کوئی روکنے والا بھی نہ تھا چنانچہ چند خاص ملازم ہمراہ لے کر بذریعہ جہاز بصرہ پہونچے۔ ناظم بصرہ بالیوز بغداد نے ہر مقام پر اُن کا احترام کیا۔ ضیافت و مہمانی مثل دستور ولایت ہوئی کئی سوار اور چاؤش اُن کے ساتھ ہوئے جب شہر یا قلعہ کے نزدیک پہونچتے تھے توپ کی سلامی ہوتی تھی۔ وہ رہ کی زیارت سے فارغ ہو کر راہی مشہد مقدس ہوئے۔ ایک روز

---

[1] قیصر التواریخ جلد اوّل

موصوف ابن عباس آباد و میانی نماز صبح چنار کے درخت کے نیچے پڑھ رہے تھے کہ دفعتاً
ترکمان رہزن پہاڑ کی چوٹی سے اُتر کر قافلہ کو لوٹنے لگے اس میں کچھ ہندی بھی تھے۔ بعض
نواب کا نام لے کر فریاد کرنے لگے، نواب نے از راہِ جسارت اُن پر رجز کیا بعض نے نواب
کو منع کیا کہ آپ خاموش رہیے یہ ہندوستان نہیں ہے۔ اس عرصہ میں نواب نے طپنچہ سے دو
فائر کیے مگر دونوں خالی گئے۔ حالانکہ نواب اس فن کے قادر انداز تھے۔ ناگاہ ایک ترکمان
دوڑ کر نواب سے لپٹ گیا اور قید کر کے پہاڑ کی پشت پر جہاں رہتے تھے لے گئے اور کئی من
کی تبریزی بیڑیاں اُن کے پاؤں میں ڈال دیں اور روزمرہ از راہِ عداوت سخت تکلیفیں
اور روحانی آلام پہونچاتے تھے۔ وہ ترکمان بہت خوش تھا کہ میرے حصہ میں ہندوستان کا
شہزادہ آیا ہے۔ نواب اُسے سمجھاتے تھے کہ تیرا خیال غلط ہے۔ میں ہندوستان کا جلالیہ
فقیر ہوں وہ کہتا تھا بہر حال مجھے پانچ ہزار روپیہ دو میں آزاد کر دوں گا۔ نواب کہتے تھے
اگر یہی چاہتے ہو تو میرا خط یا مہر بالیوز بغداد کے پاس لے جاؤ وہ تمھیں دیدیں گے، وہ کہتا
تھا ہمارا آدمی وہاں جا کر گرفتار ہو جائے گا۔ غرض اس قافلہ کے زن و مرد ملا کر کل چھ
اشخاص اسیر ہوئے اور نواب بھی چھ آدمیوں کے حصہ میں تھے۔ ایک دن نواب نے عاجز
آ کر اس ترکمان کے ہشت سالہ لڑکے کو جان سے مار ڈالا۔ کیونکہ وہ بدذات سب سے
زیادہ آزار دیتا تھا۔ کبھی اُن پر پیشاب کر دیتا تھا کبھی منہ پر تھوک دیتا تھا کبھی گالیاں
دیتا تھا مگر اس کا باپ اس حرکت سے بہت خوش تھا۔ اور اپنی بیوی کی طرف اشارہ کر کے
کہا کہ تم نے اس کو بھی کیوں نہ مار ڈالا جو میرا حصہ بڑھ جاتا۔ دوسرے دن اس کا بھائی جو شریک
حصہ تھا خفا ہو کر کہنے لگا میں آج نواب کو مارے ڈالتا ہوں اور اپنے چکمہ دار پیروں سے
نواب کی پنڈلی پر کھڑا ہو گیا صاحب خانہ نے کہا پہلے تو میرا حصہ دیدے پھر تجھے اختیار ہے
ایک دن نواب چکی پیستے جاتے تھے اور اپنی بیکسی اور لاچاری پر زور رہے تھے۔ اس کمان
کی جورو نے ترس کھا کر ایک کرتہ اور ایک لنگی نواب کو دے دی اور اپنے شوہر سے

سفارش بھی کی کہ معلوم ہوتا ہے یہ شخص کسی اچھے خاندان کا ہے اس کے رونے پر مجھے رحم آگیا اور تیرا کرتا اور رنگی میں نے اس کو دے دی۔ جب نواب کی اسیری کی خبر مشہور ہوئی تو والی ایران فتح علی شاہ نے حکمران مشہد کو لکھا کہ ان کی رہائی کی کوئی صورت پیدا کرو۔ لکھنؤ میں نصیر الدین حیدر بادشاہ کو بھی خبر ملی اس وقت نواب روشن الدولہ وزیر اعظم تھے مگر کسی نے مطلق پرواہ نہ کی۔ جب حاکم مشہد نے حکمران مازندران کو لکھا تو اس نے پانچ ہزار روپیہ ادا کر کے نواب کو آزاد کرا دیا۔ وہاں سے نواب طہران آکر بالیوز کے مہمان ہوئے۔ پھر عتبات عالیات کی زیارت کو آئے۔ اُس کے بعد پھر بصرہ میں جہاز پر سوار ہو کر کلکتہ ہوتے ہوئے کانپور پہنچے وہاں ڈوہان صاحب کے بنگلہ میں اُترے۔ وہی نواب کے اخراجات کے کفیل رہے۔

۱۸۳۷ء میں جب محمد علی شاہ پسر نواب سعادت علی خاں سلطنت پر متمکن ہوئے تو نواب کا حال زار سُن کر از راہ صلہ رحم شقہ طلب بھیج کر اُن کو لکھنؤ بلوایا اور تاکہ شہر پر جلوس سواری بھی بھیجا جب ملاقات ہوئی تو خلعت دیا اور اعظم علی خاں والی کوٹھی واقع اسمعیل گنج رہنے کو دی۔ محمد علی شاہ اپنی زندگی بھر محبت سے پیش آتے رہے۔ تنخواہ بھی مثل اور بھائیوں کے مقرر کر دی۔ انھوں نے اسی تنخواہ پر قناعت کی۔ ایک روز کمال خصوصیت سے حضرت محمد علی شاہ سے عرض کیا مجھے تصویر خاص عنایت ہو تاکہ اُسے عزیز جان سمجھ کر ہر وقت شرف ملازمت حاصل کرتا رہوں۔ موصوف نے اپنی تصویر بڑے جلوس کے ساتھ بھجوائی۔ سب اُمرا پیادہ ساتھ تھے۔ نواب ہر روز تصویر کے سامنے جا کر باادب بیٹھا کرتے تاکہ موجب خوشنودی بادشاہ ہو۔

محمد علی شاہ کے بعد جب اُن کے فرزند امجد علی شاہ ۱۸۴۲ء میں تخت حکومت پر رونق افروز ہوئے تو سبھوں کی تنخواہ کم کر دی۔ نواب کے بھی پندرہ سو ماہوار رہ گئے وہ انھیں بھی غنیمت سمجھے۔ مصنف قیصر التواریخ راوی ہیں کہ چونکہ نواب صاحب روحانی

اٹھا چکے تھے کوئی حسرت دُنیا باقی نہ رہی تھی گھُل کر پیر نود سالہ ہو گئے تھے۔ وہ حُسن و شباب سب جاتا رہا تھا۔ کتب تواریخ کا بہت شوق تھا۔ غذا ایک وقت کی رہ گئی تھی۔ دو گھنٹہ کے بعد اُسے بھی قے کر کے نکال ڈالتے تھے۔ ابتدا میں بہت موٹے تھے
ڈاکٹر صاحب کی تجویز سے مشی کرتے تھے اور قے اختیار کی تھی اُس سے بہت دُبلے ہو گئے تھے۔ نواب امین الدولہ امداد حسین خاں سے بہت ربط تھا اس جہت سے کہ امام بخش خاں اُن کے باپ نواب کے یہاں تیر اندازی میں نوکر تھے اسی خصوصیت سے ایک شب مجلس محرم میں آئے تھے۔

حضرت واجد علی شاہ کے عہد دولت میں تنخواہ اور بھی کم ہو گئی۔ اُس پر بھی شکر خدا کرتے رہے، اکثر علیل بھی رہتے تھے۔ آخر عوارض مزمنہ نے ١٨٤٩ء میں انتقال کیا بادشاہ کے حکم سے حضرت نصیر الدین حیدر کی کربلائے نو تعمیر میں دفن ہوئے۔ اسباب ضبط سرکار ہو کر نیلام ہو گیا۔ ازدواج اور اولاد نہ تھی اور نہ اُس کی آرزو رہی تھی۔

---

(۳) سنگی خانم

سنگی خانم[1] نواب سعادت علی خاں کی بیوی اشرف علی خاں کی بیٹی اور نواب رمضان علی خاں کی سگی بہن تھیں۔ پورا شجرۂ خاندان حسب ذیل ہے۔

مشرف علی خاں — اشرف علی خاں

اشرف علی خاں
- رمضان علی خاں
  - محمد حسن خاں شیدا
    - رانی شہنشاہ بیگم
      - راجہ نواب علی خاں تعلقدار اکبر پور
    - رضا حسین خاں عرف بڈھن صاحب
    - محمد حسن خاں
  - علی عباس
  - علی نقی خاں
  - مہدی علی خاں
  - مرزا علی خاں
- سنگی خانم زوجہ نواب سعادت علی خاں
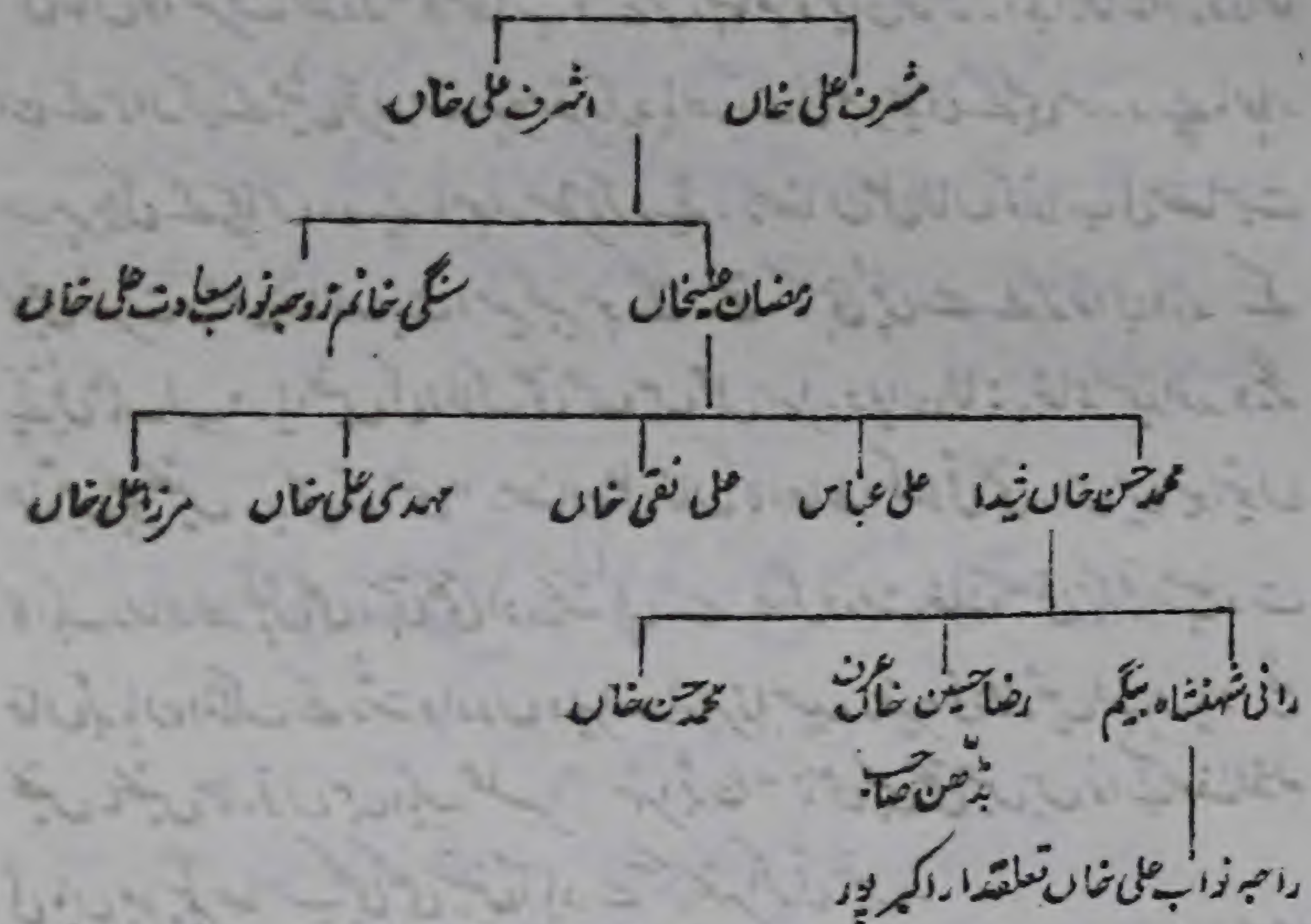
اشرف علی خاں اور مشرف علی خاں دو حقیقی بھائی آذربائی جان (ایران) سے آکر بنارس میں مقیم ہوئے۔ اشرف علی خاں کے اٹھارہ لڑکے اور چودہ لڑکیاں مختلف ازواج سے تھیں اُن میں رمضان علی خاں اور سنگی خانم ایک بطن سے تھے۔ نواب سعادت علی خاں اس وقت بمقام منڈیا فرکش تھے۔ وہیں سنگی خانم سے نکاح کر کے یا متعہ کر کے داخل حرم

[1] یہ نام اور بعض دیگر حالات راقم سطور کو نواب رمضان علی خاں کے پوتے نواب رضا حسین خاں عرف نواب بڈھن صاحب سے بدریافت معلوم ہوتے تھے۔ اس کے قبل کسی مورخ نے (بقیہ ص۵۶ پر)

کر لیا مگر اُن سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ رمضان علی خاں کے آٹھ بیٹے مرزا محمد حسن خاں شیدا علی عباس۔ علی نقی خاں۔ مہدی علی خاں و مرزا علی خاں وغیرہ تھے۔ محمد حسن خاں کی بیٹی شہنشاہ بیگم اور دو بیٹے رضا حسین خاں اور محمد حسن خاں تھے۔ شہنشاہ بیگم کے صرف ایک بیٹے ٹھاکر نواب علی خاں تعلقہ دار اکبر پور تھے جن کو برٹش حکومت نے راجہ کا خطاب بھی دیا تھا۔

۱۷۹۰ء کے شروع میں جب نواب سعادت حکمران اودھ ہوئے تو رمضان علی خاں کو "اشرف الدولہ" کا خطاب دے کر اہتمام دیوان خانہ۔ آبدار خانہ اور دوا خانہ ان کے حوالہ کر کے بیش قرار مشاہرہ مقرر کر دیا اور اُن کی ہر بیوی کے بھی سو روپے ماہوار اور ہر لڑکی کے پچاس روپے ماہوار مقرر کر دیئے۔ رمضان علی خاں کو نواب کی مصاحبت کا بھی شرف حاصل تھا اور بہت امیر کبیر ہو گئے تھے۔ آہنی پُل سے لے کر نوابی دور کے پکے پُل تک لب دریا انھیں کی املاک تھی جس میں محل سرا۔ دیوان خانہ۔ خانہ مسجد اور دیگر عمارتیں بھی تھیں۔ یہ کل آراضی "رمضان علی خاں کا احاطہ" کہلاتی تھی۔ اسی میں میواتیوں کا ایک رسالہ اور پلٹن بھی رہتی تھی اور پختہ پُل سے لے کر دولت خانہ آصفی تک نواب سعادت خاں برہان الملک کے رشتہ داروں دلیر الدولہ مرزا حیدر وغیرہ کی عمارتیں لب دریا واقع تھیں۔ انھیں عمارتوں میں ایک محلسرا "سنہرا برج" نامی بھی تھی جس میں نواب آصف الدولہ کی ماں بہو بیگم صاحب کبھی کبھی فیض آباد سے آکر ٹھہرا کرتی تھیں۔

۱۸۵۷ء میں جب انگریزوں نے مچھی بھون میں قلعہ بند ہو کر باغیوں سے مقابلہ کی تیاری کی تو چاروں طرف کی عمارتوں کو توپ کے گولوں سے منہدم کر کے کھلا میدان کر دیا تاکہ محبان وطن ان پر جمع ہو کر گولے گولیاں نہ برسا سکیں۔ اسی وقت نواب رمضان علی خاں کی کل املاک بھی جو قلعہ کے سامنے ہی جانب شمال واقع تھی منہدم کر دی گئی۔ صرف

(بقیہ حاشیہ ۵۵) بیگم کا نام تحریر نہیں کیا تھا۔ سب تاریخوں میں صرف ہمشیرہ رمضان علی خاں درج ہو۔ چونکہ یہ نام ہم تک رمضان علی خاں کے پوتے کی زبانی پہونچا۔ اس لیے اس کی صحت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہو

"خانۂ خدا" کو بچالیا گیا جو تا حال قائم ہے مگر اب بوجہ ناواقفیت جنوں کی مسجد مشہور ہوگئی ہے۔
ان کل عمارتوں کی بنیادیں اب تک زیر زمیں دبی پڑی ہیں اور اتنی مستحکم ہیں کہ پھاوڑوں
کا مقابلہ کر کے کھودنے والوں کے دانت کھٹے کر دیتی ہیں اور کھودے نہیں کھدتیں جب
حویلی کی کل آراضی داخل قلعہ ہوگئی تو شیدا صاحب کو تیس روپے ماہوار بطور کرایہ ملنے لگے
بعد وفات شیدا صاحب طے پایا کہ کل ورثا شامل ہو کر دخل یابی کا دعویٰ کریں مگر بوجوہ ایسا
ممکن نہ ہوا اور آراضی نزول سرکار ہوگئی۔

رمضان علی خاں کی نسبت عام طور سے مشہور تھا کہ انھوں نے سر جان بیلی رزیڈنٹ
اودھ کے اشارہ پر نواب سعادت علی خاں کو یخنی میں زہر دے کر اُن کی شمع حیات گُل
کر دیا تھا جس کے صلہ میں نواب مرحوم کے بیٹے نواب غازی الدین حیدر سے اُن کا منتی قرار
وثیقہ جاری کرایا گیا تھا

---

(۷) شاہ زمن غازی الدین حیدر بادشاہ اوّل

۱۸۱۴ء ـ ۱۸۲۷ء

موصوف منجملہ نواب وزیر علی خاں اودھ کے ساتویں نواب اور نواب سعادت
علی خاں کے بڑے بیٹے تھے۔ انگریزوں کے بہکانے سے انھوں نے شہنشاہ دہلی سے
رشتہ توڑ کر ۱۸۱۹ء میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس طرح موصوف "اودھ کے
پہلے بادشاہ زیر اقتدار سرکار کمپنی تھے۔ بادشاہت کی یادگار میں انھوں نے دو محلے"
حیدرآباد اور" بادشاہ نگر آباد کیے ان کے علاوہ متعدد عمارتیں بھی مثل مقبرہ نواب
سعادت علی خاں و خورشید زادی۔ مبارک منزل۔ شاہ منزل۔ ولایتی باغ چھتر
منزل اور نجف اشرف وغیرہ موصوف نے تعمیر کرائیں۔

بادشاہ بیگم صاحب ان کی بیاہتا بیوی تھیں اُن کے علاوہ اُن کے دوسرے قابل تذکرہ محلات مبارک محل، سلطان مریم بیگم، ممتاز محل اور سرفراز محل تھے ان محلات کے علاوہ "اسامیاں تھیں یعنی وہ عورتیں جو موصوف کے تصرف میں آتی ہیں مگر بیگموں کے درجہ تک ترقی نہ کرسکیں۔ یہ سب بے اولاد رہیں اور بادشاہ بھی اولاد کی طرف سے لاپرواہ تھے۔ ۱۸ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو شاہ زمن عالم بالا کو سدھارے اور اپنی ہی تعمیر کردہ عمارت شاہ نجف میں مدفون ہوئے۔

نواب بادشاہ بیگم

نواب بادشاہ بیگم شاہ زمن غازی الدین حیدر کی خاص محل تھیں جو ۱۸۱۴ء سے لے کر ۱۸۲۷ء تک فرماں روائے اودھ رہے۔ بیگم کے والد مبشر الدولہ حضرت محمد شاہ شہنشاہ دہلی کے منجم تھے۔ سلطنت دہلی کا منجم اس زمانہ میں صاحب منصب ہوتا تھا۔ بادشاہ بیگم کی شادی غازی الدین حیدر کے ساتھ ۱۷۹۴ء میں بمقام بنارس ہوئی۔ اُس وقت نواب آصف الدولہ مسند آرائے صوبہ اودھ تھے اور اُن کے مختلف البطن برادر نواب یمین الدولہ سعادت علی خاں بہ پسر غازی حیدر محلہ درگا کنڈ بنارس میں مقیم تھے

دوران حکومت غازی الدین حیدر میں بعض فتنہ پردازوں اور آفت کے پرکالوں نے شاہ موصوف کے دل میں بس ہو کر ان کو اپنی بیوی بادشاہ بیگم اور بیٹے نصیر الدین حیدر کی طرف سے بدگمان کردیا کہ یہ دونوں زہر دے کر آپ کے چراغ زندگی کو گل کرنا چاہتے ہیں۔ نصیر الدین حیدر شاہ غازی الدین حیدر کے نورِ نظر شاہ صبح دولت المخاطب بہ ممتاز محل کے بطن سے تھے۔ اُن کی ماں وضع حمل کے بعد ہی تیر قضا کا نشانہ بن چکی تھیں

جس کے بعد بادشاہ بیگم نے اپنا بیٹا بنا کر بڑے لاڈ پیار اور اللہ امین سے پالا تھا۔
غازی الدین حیدر چاہتے تھے کہ نصیر الدین حیدر کو اپنے قابو میں لا کر اس کانٹے کو ہمیشہ
کے لیے دور کر دیں مگر بادشاہ بیگم اس گاڑھے وقت میں آڑے آگئیں اور بادشاہ کا نہایت
پامردی سے مقابلہ کر کے اُن کا منشا دلی پورا نہ ہونے دیا۔ بالآخر بادشاہ نے اپنی جان
کے خوف سے دونوں ماں بیٹوں کو زیر حراست کر دیا جب ۱۸۲۷ء غازی الدین حیدر
دنیا سے رخصت ہوئے تو دونوں کی قید و بند سے گلو خلاصی ہوئی اور نصیر الدین حیدر تخت
آرا ہوئے.......... نصیر الدین حیدر نے بھی بادشاہ بیگم کے ساتھ دغا نہ کی اور ایک
معمولی بات پر محل خانہ سلطانی بہ جبر و جفا اُن سے خالی کرا لیا۔ سبب یہ تھا کہ بادشاہ
کی ایک نہایت چہیتی اور دل نواز بیوی قدسیہ محل نے بوجوہ چند در چند زہر کھا کر
اپنے ہاتھوں اپنی جان دیدی تھی۔ اس داغ مفارقت سے موصوف بہت ہی بے چین
اور مضطرب تھے۔ کسی طرح صبر نہ آتا تھا۔ نہ محفل میں دل بہلتا تھا۔ نہ ویرانہ میں قرار
آتا تھا۔

اسی وحشت مزاجی کے عالم میں انھوں نے حکم نافذ کر دیا کہ سب اعزہ و متوسلین
ایک مدت معینہ تک سیاہ لباس پہن کر سوگ منائیں۔ مگر بادشاہ بیگم نے یہ عذر کر کے
میں صرف غم امام حسین علیہ السّلام میں سیاہ پوش ہوتی ہوں۔ بادشاہ کے حکم کی تعمیل نہ کی
اس پر وہ بہت چراغ پا ہوئے اور بیگم صاحب کو عاجز و پریشان کرنے میں کوئی دقیقہ
اٹھا نہ رکھا۔

چنانچہ رزیڈنٹ کے سمجھانے پر موصوفہ بیرون شہر جا کر باغ الماس علی خاں میں
مع حشم و خدم فروکش ہوئیں اور اپنے ناسپاس بیٹے سے مقابلہ کے لیے ایک جرار فوج
بھی ملازم رکھی۔ اب مضافات لکھنؤ میں ایک متوازی زبردست سرکار بھی قائم ہو گئی۔ نہ
ادھر کا آدمی اُدھر جاتا تھا نہ اُدھر کا اِدھر آنے پاتا تھا۔ ہر وقت جھڑپ کا اندیشہ تھا۔

دونوں کو ایک دوسرے کا دغدغہ دامن گیر رہتا۔ اس خدشہ کو نصیرالدین حیدر کی قبل از وقت موت نے جو ۱۸۳۷ء میں زہر خورانی سے واقع ہوئی بالکل دور کر دیا۔

بوقت تخلیہ محل سرائے شاہی نصیرالدین حیدر نے چاہا تھا کہ اپنے بیٹے مرزا رفیع الدین فریدون بخت عرف محمد مہدی منا جان کو بیگم کے قبضہ سے نکال کر اس کے نخلِ حیات کو بھی جڑ سے کاٹ دیا جائے۔ مگر جس طرح بیگم نے نصیرالدین حیدر کی حمایت میں غازی الدین حیدر کا جم کر مقابلہ کیا تھا اُسی طرح نصیرالدین حیدر کے مقابلہ میں منا جان کی حفاظت جان کے لیے سینہ سپر ہو گئیں اور اپنی دلیری اور ثابت قدمی سے نصیرالدین حیدر کے دانت کھٹے کر دیئے اس پر نصیرالدین حیدر نے غصہ میں آکر منا جان کے پسر ناجائز ہونے کے اشتہارات چھپوا کر تمام شہر میں چسپاں کرا دیئے تاکہ بیگم صاحب کا منشا و دلی پورا نہ ہو اور منا جان تاج و تخت سے محروم ہو جائیں۔

بعد وفات نصیرالدین حیدر بیگم صاحب نے محض اپنی ہمتِ مردانہ اور سینہ زوری سے خلاف منشاء ایسٹ انڈیا کمپنی منا جان کو لال بارہ دری میں تخت نشین کر دیا جس پر بہت ہی کشت و خون ہوا۔ سیکڑوں جوانِ رعنا موت کے گھاٹ اُترے۔ خون کی ندیاں بہہ گئیں مگر آخر میں موصوفہ کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ منا جان اور بادشاہ بیگم دونوں حراست میں لکھنؤ سے کانپور اور کانپور سے قلعہ چنار گڑھ بھیج دیئے گئے اور دو ہزار چار سو روپیہ ماہوار دونوں کی تنخواہ خزانہ لکھنؤ سے مقرر کر دی گئی۔

بادشاہ بیگم کی شکست کے بعد نصیرالدین حیدر کے چچا نصیرالدولہ محمد علی خاں حسب الحکم خداوندان کمپنی تخت سلطنت پر بٹھا دیئے گئے جنھوں نے محمد علی شاہ کا لقب اختیار کیا۔

منا جان اپنے باپ کے بیٹے تھے نصیرالدین حیدر کے اکثر عادات و خصائل سے

ان میں پائے جاتے تھے۔ آپ آتشیں سے بھی کثرت سے شوق کرتے تھے۔ آخر ۱۸۴۶ء
میں مرگ ناگہانی کے شکار ہوگئے اور چنار گڑھ ہی میں پیوند خاک ہوئے۔ ان کی
رحلت کے بعد ۱۸۶۱ء میں بادشاہ بیگم کو بھی فرشتہ اجل نے مکروہات زمانہ سے ہمیشہ کے لیے
نجات دلادی۔

موصوفہ نہایت شیر دل اور دھن کی پکی واقع ہوئی تھیں۔ جب کسی معاملہ کے نشیب
فراز پر غور و خوض کرکے وہ کوئی راہ عمل اختیار کرلیتی تھیں تو پھر وہ چاہے جتنی پر پیچ اور
کانٹے دار ثابت ہوتی یا پہاڑ بھی سد راہ ہوتے۔ تو کبھی بھی اس سے منھ نہ موڑتی تھیں۔

بادشاہ بیگم کے سوانح حیات بیان کرنے کے بعد اب ہم ان کی سواری کے جلوس
کی کیفیت بیان کریں گے۔ ہندستانی مورخوں نے تو ان باتوں کو خانگی امور تصور
کرکے ان کی طرف کوئی التفات نہ کیا مگر زوال سلطنت کے بعد کی اس قسم کی تحریریں نگاہوں میں لگاتے
اور موتیوں میں تولنے کے لائق ہوگئی ہیں کیونکہ یہ بیانات اس زمانہ کی تہذیب و
تمدن کی آئینہ دار ہیں۔ مسز حسن علی ایک یورپی خاتون نے بادشاہ بیگم کی سواری کا
جلوس اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اپنے ہم جنسوں کی آگاہی کے لیے اس کی تفصیل
قلم بند بھی کرلی تھی چنانچہ سواری کے جلوس کا مواد اسی خاتون کی تحریر سے لیا گیا ہے
وہ تحریر کرتی ہیں:۔

"ممتاز بیگمات شاہی شاذ و نادر ہی محل سرا کے باہر قدم رکھتی ہیں مگر جب
کسی خاص ضرورت سے ان کو باہر جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو وہ اپنے
جاہ و جلال کو پورے طور سے ملحوظ خاطر رکھتی ہیں۔ میں اپنے اس بیان کی
وضاحت بادشاہ بیگم کی سواری کے جلوس سے کردوں گی جب وہ کئی برس
متواتر دولت سرائے سلطانی کی چہار دیواری میں قیام کرنے کے بعد مع خدم[1]

---

[1] Manners & Customs of the Mussalmans of India

حشم میرے مکان کے سامنے سے درگاہ حضرت عباس تشریف لے گئی تھیں۔

بادشاہ بیگم باعتبار اعزاز و مرتبت کسی دوسرے ملک کی ملکہ سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ خطاب کے علاوہ ان کو اور بھی مخصوص اعزاز حاصل ہیں۔ مثال کے طور پر ڈنکہ ہی کو لے لیجیے۔ جو اُن کی سواری کے ہمراہ ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا امتیازی نشان ہے جس کے استعمال کی جہاں پناہ نے اپنے خاندان کی کسی اور خاتون کو اجازت نہیں دی ہے مگر چتر اور آفتابہ یعنی زردوزی کام کا سائبان اور طاؤس کے پروں کی چوری علاوہ ملکہ کے دوسری بیگمات شاہی بھی اپنی سواری کے ساتھ استعمال کرتی ہیں۔

بیگم صاحب کی سواری میں جو جلوس تھا اس کے شروع میں مجھے ایک دستہ اسپ سوار محافظین کا پورا پورا پوشاک میں ملبوس نظر پڑا جن کی جھنڈیوں کے پھریرے ہوا میں لہرا رہے تھے اُن کے بعد دو دستے اور تھے جن کے ہمراہ باجہ والوں کے غول اور جھنڈی بردار بھی تھے ان کے پیچھے ایک کمپنی نیزہ بردار پیادوں کی تھی جو نفیس اور بے داغ سفید پوشاکیں پہنے تھے اُن کے سروں پر پگڑیاں بھی سفید ہی تھیں۔ یہ لوگ ہاتھوں میں سُرخ رنگ کی چھوٹی چھوٹی مثلث نما جھنڈیاں لیے تھے جن پر مارکہ شاہی یعنی دونوں جانب دو مچھلیاں اور درمیان میں ایک عجیب قسم کا آلہ حرب زردوزی کام کا بنا تھا۔ جھنڈیاں تقریباً تین فٹ لمبے نقرئی عصا پر نصب تھیں جن کے زیریں چھوٹی چھوٹی سنگینیں پنہاں تھیں جو کھٹکا دبانے سے نمودار ہو جاتی تھیں۔ ان کے عقب میں پورا غول باجہ والوں ڈھول اور شہنائی نوازوں کا تھا پھر وہ مہتم بالشان ڈنکہ شاہی تھا جو خلقت میں سواری کے جاہ و حشم کا اعلان کرتا ہے

ملکہ ایک بلند اور پر شوکت چنڈول میں سوار تھیں جس کے دونوں جانب خوش پوشاک معتمد ملازمین شاہی چنور اور آفتابے لیے جارہے تھے۔ یہ چنڈول زمین سے نمایاں ہوتا ہے

مگر قد میں بڑا اور زیادہ بلند بھی ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ چھ فٹ لمبا ۵ فٹ چوڑا اور چار فٹ بلند ایک چھوٹا سا نقرئی کمرہ ہوتا ہے جن کے آگے پیچھے نیچے کے جانب چاندی کے خول چڑھے ہوئے چار ڈنڈے ہوتے ہیں جن کو بیس کہار اپنے کاندھوں پر رکھ کر لے چلتے ہیں اور چوتھائی میل کی مسافت طے کرنے کے بعد کہاروں کی بدلی ہو جاتی ہے پھر دہ کہار اٹھا کر لے چلتے ہیں جو بدلی کے لیے سواری کے ہمراہ رہتے ہیں۔ منزل مقصود کے پہنچنے تک کہاروں کی اسی طرح بدلی ہوا کرتی ہے۔ یہ چنڈول بردار کہار خوشنما سفید رنگ کی وردیاں زیب تن کیے تھے جو ٹھیک ان کے ناپ کی تیار کی گئی تھیں۔ اُن کے اوپر قرمزی رنگ کے ڈھیلے ڈھیلے لبادے پہنے تھے جن کے حاشیوں پر سُنہرا کارچوبی کام بنا تھا اور پُشت پر بھی ایک کارچوبی مچھلی بنی تھی ان کی پگڑیاں لبادوں کی ہم رنگ تھیں اور پگڑی کی بغل میں ایک طلائی مچھلی ٹنکی تھی جس کی دم سے ایک قیمتی اور سنہرا پھُندنا لٹکتا تھا جو اتنا لمبا ہوتا ہے کہ چلتے وقت صرف کہاروں کے شانوں ہی کو مَس نہیں کرتا ہے بلکہ ان کی شان و شوکت کو بھی دوبالا کر دیتا ہے۔ چنڈول کے اردگرد نہایت طرحدار اور قوی الجثہ کہاریاں بھی تھیں جو نوک پلک سے درست نہایت زرق برق لباس میں ملبوس زیوروں سے گوندنی کی طرح لدی ہوئی ٹھنکتی چمکتی چلی جاتی تھیں۔ ان کہاریوں کا فرض منصبی یہ ہے کہ سواری کو زنانخانہ کے صحن میں پہونچا دیں۔ جہاں مردوں کا قدم رکھنا تو درکنار، پرندہ پر تک نہیں مار سکتا۔ ان کہاریوں کے علاوہ چوبدار اور سونٹے بردار بھی کثیر تعداد میں ہاتھوں میں طلائی اور نقرئی عصا لیے ہوئے چنڈول کے چاروں طرف تھے جو ہر وقت دوانگی نیز داہنی پر سواری کے اعزاز اور مرتبہ کا آواز بلند کرو کا لگاتے تھے فقرا و مساکین کو بھی چنڈول کے قریب نہیں آنے دیتے جو صاحب سواری کی فیاضی اور دریا دِلی کی وجہ سے ایسے موقعوں پر ٹڈی دل کی طرح جمع ہو جاتے ہیں مگر بلکہ اپنے چند خواجہ سراؤں کی معرفت جو چنڈول کے قریب ہی رہتے ہیں۔ ایک معقول رقم مردجہ

دستور کے بموجب تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد لٹوا دیتی ہیں جن کو محتاج اور گدا گر چھین جھپٹ کر اٹھا لے جاتے ہیں۔ خواجہ سراؤں کے سردار یعنی نواب ناظر ملکہ کے چنڈول کے بعد ہی ایک ہاتھی کی پشت پر ایک جگمگاتے ہوئے ہودہ میں بیٹھا تھا جو نہایت نفیس زربفت کی پوشاک میں ملبوس ۔ ایک چمک دار پگڑی سر پر جمائے تھا ایک بیش بہا اور خوش وضع جامہ وار بھی اوپر سے اوڑھے تھا۔

نواب ناظر کے بعد بادشاہ بیگم کے عملہ کی باوقعت خاندانی بیگمات تھیں جو اپنے مرتبہ یا منظورِ نظر ہونے کے لحاظ سے بھی اعلیٰ قدر مراتب پردہ دار نینسوں میں سوار تھیں جن کی محافظت سپاہی نیزہ بردار اور چوبدار پورے طور سے کر رہے تھے۔ ان بیگمات کے بعد عملہ خانگی کے چند افسران نہایت سجیلے ہاتھیوں پر سوار تھے۔ سب کے آخر میں ادنیٰ درجہ کی خادمائیں اور لونڈیاں باندیاں رتھوں یعنی پردہ دار گاڑیوں میں سوار تھیں جو عام طور سے ہندوستان میں رائج ہیں۔ ان رتھوں میں بیل جتے تھے جن کی گردنوں میں ڈوری سے بندھی ہوئی چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں لٹکتی تھیں اور جن کے چلتے وقت یک ساتھ بجنے سے ایک قسم کی سُریلی اور خوش آیند جھنکار پیدا ہوتی تھی۔ رتھ ایک چوڑی چکلی پہیہ دار گاڑی ہوتی ہے جس کے ڈھانچہ کی چھت میں دو قبے ہوتے ہیں جن میں سے ایک بمقابلہ دوسرے کے کسی قدر بڑا ہوتا ہے۔ ان گاڑیوں پر سُرخ رنگ کی پوششیں تھیں جن کے کناروں پر سُنہرا یا زرد گوٹ لگی تھی۔ جو لوگ رتھوں پر سوار ہوتے ہیں وہ گدّوں پر نشست کرتے ہیں جو اندر کی جانب بچھا دیے جاتے ہیں۔ رتھ میں آگے کی جانب سے سوار ہوتے ہیں جس طرف پوشش کے ہمرنگ ایک موٹے کپڑے کا پردہ پڑا ہوتا ہے جو سواریوں کو باہر والوں کی نظروں سے چھپائے رہتا ہے۔ رتھ بان اور پردہ کے درمیان جو تھوڑی سی جگہ باقی رہ گئی تھی۔ اس میں دو دایا مین خادمائیں نگرانی کے لیے بٹھا دی گئی تھیں۔ یہ عورتیں سن رسیدہ ہوئی تھیں جن میں کوئی کشش اور جاذبیت باقی نہ رہی تھی۔ ان کے لیے باہری

چہل پہل دیکھنے، مجمع کی سیر . . . . کرنے اور پردہ کے باہر کی پاک وصاف ہوا سے لطف اندوز ہونے میں کوئی قباحت نہیں سمجھی جاتی۔ برعکس اس کے اُن سے بڑے پایہ اور مرتبہ کی عورتیں چاہے وہ جس سن وسال کی بھی ہوں اس قسم کی آزادی نہیں برت سکتیں بادشاہ بیگم کی سواری میں بنے دیسی وضع کی گاڑیاں شمار کیں تو ان کی تعداد پچاس نکلی اور ہر گاڑی میں چار سے چھ عورتیں تک ٹھونس دی گئی تھیں یہ سب زنانہ عملہ کی منصب، چھٹی نویس، قرآن خوان، خواصیں اور منلانیاں وغیرہ تھیں اس سے آپ کو اس امر کا پورا اندازہ ہو جائے گا کہ ہندوستان کی کسی عظیم المرتبت خاتون کے عملے میں کتنی مختلف قسم کی خادمائیں ہوتی ہیں اور اُن کی تعداد کتنی کثیر ہوتی ہے۔

اوسط درجہ کی چال سے یہ جلوس میرے مکان کے سامنے سے تقریباً نصف گھنٹہ میں گزرا ہو گا اس کا انتظام نہایت معقول تھا اور جلوس کو دیکھ کر سواری کے کروفر اور عظمت و بزرگی کا سکہ دلوں پر بیٹھ گیا۔

نواب مُبارک محل

ولایتی محل شاہ زمن غازی الدین حیدر

مبارک محل کے باپ کرنیل عَلیش فرنگی تھے اور ماں ایک ہندستانی عورت چمپا نامی تھی۔ کرنیل عَلیش کانپور میں قیام پذیر تھے جہاں اُن کا بنگلہ بہت مشہور تھا موصوف کے ولایت چلے جانے کے بعد مبارک محل کانپور میں پیدا ہوئیں۔ سن شعور کو پہنچ کر وہیں ایک درس گاہ میں تعلیم حاصل کرنے جایا کرتی تھیں۔ اُن کا نام شروع میں بقول مس سڈنی ہے (Miss Sydney Hay) مؤلف ہسٹارک لکھنؤ (Historic Lucknow) مریم رکھا گیا تھا۔ موصوفہ ابتداءً نصرانی مذہب کی پیرو اور حسن د

چندے آفتاب اور چندے ماہتاب تھیں۔ جولائی سنہ ۱۸۱۴ء میں مسندِ وزارت پر جلوہ گر ہونے کے بعد جب حضرت غازی الدین حیدر بغرضِ ملاقات نواب گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز کانپور تشریف لے گئے تو موصوفہ کے چاندسے مکھڑے پہ دم دینے لگے چنانچہ ان کو اپنے ہمراہ لکھنؤ لے آئے اور مذہب اسلام کی تلقین کی۔ جب وہ آغوشِ اسلام میں آگئیں تو سنہ ۱۸۱۵ء کے آغاز میں اُن سے عقد کرکے اُن کا اسلامی نام عزت النساء بیگم مہدِ علیا مبارک محل رکھا اور بمقابلہ محل خاص بادشاہ بیگم صاحبہ اُن کو محل قرار دیا اور اُن کا اہتمام بھی نواب قمرالدین احمد خاں عُرف مرزا حاجی کے سپرد کرکے نگر محل خطاب دیا۔ بروقت نکاح مبارک محل کی اٹھتی جوانی تھی مگر اُن کے شوہرِ نامدار نے تینتیسویں (۳۳) سال میں قدم رکھا تھا۔ عقد کے بعد غازی الدین حیدر نے اپنی اس بہو بیوی کی تنخواہ دو ہزار روپیہ ماہوار مقرر کی اور اپنی بہت سی اسامیاں بھی انھیں کے ماتحت کردیں۔ غازی الدین حیدر مبارک محل کو دمِ ہوش چاہتے تھے اسی لیے موصوفہ اکثر بجرے یا گاڑی میں اُن کے ہمراہ پہلو میں رونق افروز ہوتی تھیں۔

واقعات مرقومہ بالا قیصر التواریخ مرتبہ سید کمال الدین حیدر کی بنیاد پر تحریر کیے گئے ہیں، مگر مولانا نجم الغنی مؤلف تاریخ اودھ نے مبارک محل کے جو ابتدائی حالات بیان کیے ہیں وہ ان واقعات سے کسی قدر مختلف ہیں، لہٰذا وہ بھی درج کیے جاتے ہیں۔

مولانا نجم الغنی تاریخ اودھ کی جلد سوم میں تحریر کرتے ہیں۔

"غازی الدین حیدر کے دل میں بادشاہ بیگم[1] کی مفارقت سے خارِ الم کھٹکتا تھا، معتمد الدولہ (آغا میر) نے اس کے رفع کرنے کے واسطے یہ تجویز نکالی کہ

۱؎ بادشاہ بیگم غازی الدین حیدر کی بیاہتا بیوی تھیں معتمد الدولہ آغا میر وزیر اعظم نے مصلحتاً دونوں میں ناچاقی کرادی تھی اور بادشاہ نے بیگم کو نظربند کردیا تھا۔

ایک خوب صورت عورت جو ایک انگریز کے نطفہ سے ہندوستانی عورت کے بطن سے پیدا ہوئی تھی اور اس کو مرزا حاجی کان پور سے اپنے ہمراہ لائے تھے بادشاہ کے ساتھ منعقد کی۔ بادشاہ نے "رنگ محل" خطاب دیا اور مبارک محل نام مشہور ہوا۔"

مبارک محل نہایت دریا دل اور سیر چشم تھیں اسرار اور بندگان خدا اُن کی بدولت پرورش پاتے تھے۔ تا زیست مذہب اسلام پر پورے انہماک سے قائم رہیں۔ مسلم مخدرات کی طرح پردہ میں رہتی تھیں اور اہل اسلام کے طرز معاشرت اُن کے رسوم اور آداب صحبت سے پورے طور پر واقف ہو گئی تھیں۔

نواب معتمد الدولہ آغا میر بادشاہ بیگم سے بوجوہ خار کھاتے تھے اور مصلحتاً چاہتے تھے کہ غازی الدین حیدر اور بادشاہ بیگم میں اَن بن رہے اسی لیے وہ ہمیشہ مبارک محل کی پشت پناہی کرتے تھے۔

غازی الدین حیدر کے ولی عہد صاحب عالم نصیر الدین حیدر کی نسبت اولاً نواب نصیر الدولہ محمد علی خاں کی بڑی بیٹی عالیہ بیگم سے قرار پائی تھی جو بعد کو صاحب تخت و تاج ہو کر محمد علی شاہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ مگر معتمد الدولہ نے بادشاہ کو کچھ سمجھا بجھا کر یہ نسبت ترک کر کے نواب محسن الدولہ سے ٹھہرائی اور بجائے بادشاہ بیگم کے شادی کا مہتمم مبارک محل کو کیا۔

بابعد معتمد الدولہ نے اپنے بڑے بیٹے آغا علی خاں (امین الدولہ) کی نسبت جو خورد محل مسماۃ بی جان سے تھے، نواب شاہ میر خاں کی صاحبزادی نواب بی بی عرف بنی بیگم کے ساتھ قرار دینا چاہی مگر شاہ میر خاں، بانی خاندان شاہی اودھ نواب سعادت خاں برہان الملک کے خاندان سے تھے، اور اپنا قدر و منزلت کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی لڑکی کی شادی اپنے خاندان کے ملازم کے لڑکے سے رچانا

کسرِ شان سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے یہ کہہ کر کہ مجھ غریب کی بیٹیاں غریب خاندانوں میں جاتی ہیں، خوب صورتی سے انکار کر دیا۔ مگر معتمد الدولہ نے اپنی دولت و جبروت کے بل بوتے پر جبر و تعدی سے کام لینا شروع کر دیا جس پر شاہ میر خان کلکتہ چلے گئے تاکہ اس ظلم و ستم کی فریاد کمپنی کے حکام سے کریں مگر وہاں بھی سب معتمد الدولہ کا کلمہ پڑھ رہے تھے اس لیے مجبور ہو کر لندن کا عزم کیا۔ جب وہاں بھی اُن کی سعی بار ور نہ ہوئی تو مصر میں قیام اختیار کر لیا اور وہیں سے اس دنیا کو سدھار گئے جہاں جا کر کوئی واپس نہیں آتا۔ اُن کی بڑی بیٹی بیگم کو جو لکھنؤ میں رہ گئی تھیں شاہ غازی الدین حیدر نے مبارک محل کے سپرد کر دیا کہ اس کو اپنی بیٹی سمجھ کر۔ اُس کی شادی معتمد الدولہ کے بیٹے کے ساتھ کر دو۔ چنانچہ مبارک محل نے حسن باغ میں بہت دھوم دھام سے شادی کر دی۔

بادشاہ مبارک محل سے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔ بیحد مانوس تھے، چنانچہ اُن کی سواری کے لیے جلوس، ڈنکہ اور ماہی مراتب کا حکم بھی نافذ کر دیا تھا۔ اور دس ہزار روپیہ ماہوار وثیقہ مقرر کر دیا تھا جس کی بنیاد یوں پڑی کہ ۱۸۲۵ء میں جب جنگ برما کے شعلے بلند ہوئے تو مولوی محمد غلیل الدین خاں نے جو سفیر شاہی کلکتہ تھے اور سرکار کمپنی نیز سرکار شاہی کے معتمد علیہ تھے۔ شاہ اودھ غازی الدین حیدر کو رضامند کر کے ایک کروڑ روپیہ بطور قرض دوام کمپنی کو دلوا دیا۔ یہ رقم کثیر بذریعہ ریذیڈنسی کشتیوں پر لدوا کر کلکتہ بھیجی گئی جلیل القدر انگریز ریذیڈنسی میں روپیوں کے اس عظیم الشان پہاڑ کو بطور تماشا دیکھنے آتے تھے۔ اس میں سے مولوی صاحب کو بھی دس لاکھ روپے بحساب دس فیصدی بطور حق السعی ملے۔

وثیقہ کی بابت یہ طے پایا کہ شاہ اودھ غازی الدین حیدر نے ایک کروڑ روپیہ کی رقم جو علیتہ کے لیے کمپنی کے سپرد کی تھی اس کا منافع بحساب پانچ فی صد

سالانہ مبلغ اکتالیس ہزار چھ سو چھیاسٹھ روپیہ دس آنہ آٹھ پائی ہوتا ہے، اس رقم منافع سے منجملہ دیگر اشخاص، مبلغ دس ہزار روپیہ ماہوار نواب مبارک محل کو ۱۰ اگست ۱۸۲۵ء سے بہ حمایت سرکار کمپنی ملا کریں اور اپنے بعد اپنے وثیقہ کے ایک ثلث تک جو وہ وصیت کریں وہ جائز تصور کیجائے پوری رقم میں سے اور بصورت عدم وصیت باقی ماندہ دو تہائی میں سے نصف رقم نجف اشرف اور نصف رقم کربلائے معلی کے مجتہد صاحب اور مجاور دین آستانہ کو ابداً مؤبداً ارسال کی جائے اور اس کے ثواب کے مستحق شاہ زودہ ہوں گے

غازی الدین حیدر نے ۲۰ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو بعمر تخمیناً چھپن سال اس دار فانی سے کوچ کیا۔ اُن کے انتقال کے بعد نواب مبارک محل کی سرکار میں سیاہ و سفید کا کل اختیار حکیم بندہ مہدی خاں اُن کے طبیب خاص کو ہوا جن کا مکان کٹرہ ابو تراب خاں لکھنؤ میں اب تک موجود ہے۔

حکیم صاحب کے اثر و رسوخ کے متعلق سید کمال الدین حیدر مصنف قیصر التواریخ ناقل ہیں:—

"حکیم بندہ مہدی خاں جو مدت سے ملازم خاص سرکار نواب مبارک محل کے تھے بظاہر پیشہ طبابت مگر جناب موصوفہ کے دفور عنایت سے اختیار کُلی اندر اور باہر سرکار رکھتے تھے۔ اور اسی مظنہ مادہ فاسد سے کئی بار وزارت میں قید بھی ہو چکے تھے۔ اس حکم ناطق سے قیام شبانہ روز ڈیوڑھی کا موقوف کر کے خود دقت صبح وقت نماضی (؟) اختیار کیا تھا[1]"

---

[1] ایک حکم مہ نوجہ ہوں جناب سلیمن صاحب ریذیڈنٹ اودھ بہر وثیقہ دار بیگم کے نام اس مضمون کا جاری ہوا تھا کہ ہم نے بیگمات کی نگرانی کے لیے ایک محل دار مقرر کی ہے تاکہ وہ پیندرہویں روز اُن کے حرکات و سکنات سے مطلع کرتی رہے جس کی تنخواہ صاحبات محل کے ذمہ عاید کی گئی ہے (اس کے علاوہ ایک داروغہ بھی سرکار شاہی سے مقرر ہوا تاکہ وہ بھی بیگمات کی دقبیہ ... پر دیکھے)

جس امر کو صاحب قیصر التواریخ نے صفحہ میں بیان کیا ہے اس کو مؤلف تواریخ اودھ نے جلد چہارم میں کھلے الفاظ میں ظاہر کیا ہے، عبارت ملاحظہ ہو:۔

"حکیم بندہ مہدی خاں جو نواب مبارک محل زوجہ غازی الدین حیدر کی سرکار میں ملازم تھے۔ بظاہر پیشہ طبابت کا تھا مگر در پردہ بیگم کے ساتھ آنکھ لگی ہوئی تھی، اس لیے بیگم کی تمام سرکار کے مختار کل تھے، اور اسی وجہ سے کئی بار وزارت میں قید بھی ہو چکے تھے، اُنھوں نے بھی اس حکیم ناطق سے ڈیوڑھی کا قیام ترک کر کے صرف صبح کی نباضی کے وقت آنا اختیار کیا۔"

بعد اجراء وثیقہ نواب مبارک محل نے اپنے وثیقہ کی ایک تہائی رقم یعنی تین ہزار تین سو ۳۳۳۳ تینتیس روپیہ پانچ آنہ چار پائی کی بابت سنہ ۱۲۳۵ھ میں ایک وصیت نامہ بزبان فارسی تحریر کیا، جس کی رو سے چودہ اشخاص کے گزارے بلا شرط خدمت مقرر کیے۔ منجملہ ان اشخاص کے حکیم مرزا بندہ مہدی خاں اور اُن کے پسر حکیم بندہ رضا خاں کے گزارے بھی علی الترتیب یک صد و صد روپے مقرر کیے گئے ان کے علاوہ چند اشخاص کے گزارے بشرط خدمت بھی مقرر کیے گئے۔ وصیت نامہ میں یہ بھی صاف طور سے درج کر دیا کہ اپنی حیات بھر میں خود ہر ایک مشاہرہ دار کو مشاہرہ تقسیم کروں گی۔

میرے بعد مرزا بندہ مہدی خاں جن کو میں نے اپنی طرف سے متولی مقرر کیا ہے خزانۂ ریذیڈنسی سے رقم وصول کر کے تقسیم کیا کریں گے۔ مشاہروں میں کمی بیشی کرنے کا اختیار کسی کو نہ ہوگا اور نہ میرے بعد میرے کسی ملازم و وابستہ سے محاسبہ و مواخذہ کیا جائے گا۔ وصیت نامہ کی دفعات پنجم و نہم میں کچھ ضروری ہدایات درج ہیں جن سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ موصوفہ کی حکیم صاحب اور اُن کے خاندان پر کس قدر نظر لطف و کرم تھی، لہذا ہر دو دفعات بہ تمام و کمال پیش کی جاتی ہیں۔ اس وصیت نامہ میں یہ خاص بات ہے کہ نہ اس میں تاریخ درج ہے نہ مہینہ، صرف سنہ درج ہے اور بیگم کی صرف

بلاواسطہ گذشتہ حالات سے مطلع کرتا ہے۔ (بقیہ صفحہ ۶۹)

مہر ہے دستخط نہیں ہیں۔

دفعہ پنجم

برائے مصارف بقیہ ثلث مشاہرہ کہ بعد مشاہرہ شاہرہ داران مبلغ یک ہزار چہار صد و پنجاہ دسہ روپیہ پنج آنہ چہار پائی باقی ماند متولی مذکور (حکیم بندہ مہدی) را اختیار است کہ مشار الیہ بعد انقراض حساب این عاجزہ زربقیہ مذکورہ را بہ تنخواہ قرآن خوانان موقوفان و ذاکران و دیگر عملہ ضروریہ متفقہ مقبرہ ام و مقبرہ والدہ ام و انعقاد مجالس عزا و حج بیت اللہ الحرام و زیارات عتبات عالیات ائمہ ہدیٰ علیہ السلام صرف کنند و در عہد تولیت ملکوبہ با ہر کہ از اولاد و لواحق او باشد یا برائے ہر کسے کہ متولی مذکور برائے تولیت این باب خاص وصیت نماید احدے را اختیار تغیر و تبدل دراں نباشد"

دفعہ نہم

" اثاث البیت و دیگر اشیا منقولہ و غیر منقولہ مملوکہ این عاجزہ اہالی سرکار دولت مدار انگریز بہادر بعد وفات نیلام فرمودہ ما حصل آں را در سرکار ابد قرار خود جمع نمودہ منافع آں را حسب ضابطہ سرکار خود ماہ بماہ مسطور عنایت فرمائید کہ او از ما حصل مزبورہ اول تعمیر مسجد و امام باڑہ بجائے مدفن عاجزہ بہر دیارے کہ اتفاق افتد نمودہ من بعد ابداً موبداً زر مذکورہ را بصرف مصارف صاحبان بیت الحرام زائران مشاہد مشرفہ ائمہ علیہ السلام و پرورش و خبر گیری ایتام و سادات مومنین و دیگر محتاجین اہل اسلام در آرد کہ ثواب این خیرات مبرات عاید حال این عاجزہ گردد"

سید کمال الدین حیدر ناقل ہیں کہ بیگم صاحبہ کو اکثر اوجاع باطنی ہو جاتا تھا۔ حکیم صاحب موصوف (حکیم بندہ مہدی) کے دست شفا سے رفع ہو جاتا تھا۔ پھر چند روز سے

آلامِ روحانی میں مبتلا ہوئیں، مختصر یہ ایک روز باغ سے آموں کی ڈالی آئی تھی اس سے
ے کچّی آم رات کو نوش کیے۔ شب ہی میں طبیعت بے لطف ہو گئی، حکیم صاحب نے
حسبِ دستور کچھ دوا بھیجی، نہ استعمال کی مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ چنانچہ بروز شنبہ بتاریخ بستم
شعبان ۱۲۶۵ھ مطابق ۳۰ رجون ۱۸۴۹ء بعہد حکومت جان عالم واجد علی شاہ
ت کی چاشنی چکھی۔ سارے محل میں کہرام مچ گیا، گریہ وزاری ہونے لگی۔ قریب دوپہر
کے حضور عالم نواب علی نقی خاں وزیر اعظم کے کانوں تک یہ خبر پہنچی تو انھوں نے
ی وقت بادشاہ کو مطلع کیا۔ پھر رات گئے بعد غسلِ دریا جنازہ اٹھا بموجب حکم حضرت
واجد علی شاہ امام باڑہ نجف اشرف میں اپنے شوہر نامدار کے پہلو میں مدفون ہو گئیں۔

امام باڑہ نجف اشرف میں شاہ غازی الدین حیدر کی تین بیویاں تہِ خاک
ت کی ابدی نیند سو رہی ہے۔ امام باڑہ میں داخل ہوتے وقت بادشاہ کا مرقد سامنے
ملتا ہے جس کے داہنے جانب مبارک محل کی آخری خوابگاہ ہے۔ جس پر ایک شاندار
کا جمنی حظیرہ ہے۔ نجف کی تمام قبروں سے اس قبر کا ساز و سامان زیادہ پُرشوکت اور
ش قیمت ہے۔ بادشاہ کی قبر کے بائیں جانب نواب ممتاز محل بادشاہ کی دوسری مسلّم
ی کی قبر ہے جس پر چاندی کا کٹہرا رکھا ہے" اور بائیں جانب کے گوشہ میں بادشاہ
تیسری محبوب بیوی سرفراز محل کا مدفن ہے جس پر ایک چوبی کٹہرا رکھا ہوا ہے۔

مبارک محل کے انتقال کے دوسرے روز بروز یکشنبہ بوقت صبح حسب دستور
الدولہ نے بیگم مرحومہ کے مکان مسکونہ واقع مچھی بھون متصل باؤلی میں تعلیقہ کر کے
ے بٹھا دیے اور جو کچھ مال و اسباب دستیاب ہوا داخلِ سرکار کر دیا۔ بادشاہ نے
مردہ سمجھ کر دیانت الدولہ کے سپرد کر دیا پھر کچھ خیال نہ کیا۔ جس کی قسمت میں جو کچھ
وہ اسے ملا۔ مجد الدولہ منہ دیکھتے رہ گئے۔ بہت سا سامان خفیہ طور پر کھسک گیا۔
نہ وجواہر ان کے یہاں کا مشہور تھا اس کا کچھ پتہ نہ چلا کہ کس کے ہاتھ لگا۔ درحقیقت

کو سیوم کی تقریب ہوئی۔ خلعت ماتم پرسی نواب علی نقی خاں نے حکیم صاحب موصوف اُن کے بیٹے حکیم بندہ رضا خاں اور بندہ رضا خاں اور پنڈت دلوان کو دیا۔ اور محل میں حضرت بُواجی کو آیا جو صیفِ ماتم پر بیٹھی تھیں۔

امام باڑہ شاہ نجف میں ذیل کا میر علی اوسط رشک کا طبعزاد قطعہ تاریخ لگا ہوا ہے جس سے مبارک محل کی تاریخ و سنہ وفات ظاہر ہوتا ہے۔

افسوس مبارک محل ایں مریمِ عصر — رُو کرد بسُوئے گلشنِ رضوان ہائے
تاریخ وفات خامۂ رشک نوشت — ہشتم بوده ز ماہ شعبان ہائے

بعد رحلت مبارک محل ایک ثلث وثیقہ کی تقسیم حسب منشا و مرحومہ ہوئی، اور باقی دو ثلث کی تقسیم نواب اقبال الدولہ پسر نواب سعادت علی خاں کے اختیار سے ہوئی۔

مرزا کمال الدین حیدر کا بیان ہے کہ کسی شخص نے نفع ذاتی کے لیے محل موصوف کے وصیت نامہ میں کچھ تغیر و تبدل بھی کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ تحریر کرتے ہیں:۔

"وصیت نامہ مہری بیگم صاحبہ (مبارک محل) کلکتہ سے ریذیڈنٹ کے پاس آیا۔ چنانچہ رکٹس صاحب (Ricketts) ریذیڈنٹ نے خلاف سررشتہ سمجھ کر چاہا کہ بعد تحقیقات بیگم صاحبہ سے دریافت کر کے جاری کریں کہ آپ نے ہماری معرفت روانہ صدر کیوں نہ کیا۔ مہندر رتن خزانچی صاحب کا بڑا معتمد تھا اُس نے بموافقت اپنے کہ پیشتر سے موافق ہو چکا تھا صاحب کو سمجھایا کہ آپ بموجب حکم صدر کے تعمیل کیجیے۔ اس تحقیقات سے موٹے ور دسری کے آپ کو کیا حاصل ہوگا۔ معتمدین بیگم صاحبہ یہ کہتے ہیں کہ وصیت نامہ مصنوعی سے اکثر حقداروں کے حق مارے گئے مگر بیگم صاحبہ لاعلم رہیں۔

مولوی علی حسن بلگرامی جو اس تحریر مصنوعی کے موجد ہوئے تھے۔ اُن کی تنخواہ سو روپیہ کی اسی ثلث وصیت سے بموافقت عملہ گورنمنٹ علیحدہ ہو گئی۔ اسی سبب سے لوگ مولوی صاحب

کی خوش قسمتی کی قسمیں کھاتے تھے۔ بعد انتقال بیگم صاحبہ حکیم بندہ مہدی خاں حسب منشاء وصیت نامہ نجف اشرف کے متولی ہوئے۔ جب انھوں نے مرض ہیضہ سے انتقال کیا تو اُن کے بیٹے حکیم بندہ رضا خاں بحیثیت متولی ان کے جانشین ہوئے۔ جنھوں نے ۱۹۰۰ء میں بلا وصیت چھوڑے انتقال کیا۔ ان کے بعد اُن کے مختلف البطن بھائی مرزا بندہ محمد و مرزا بندہ قاسم تولیت نجف کے لیے کوشش کرتے رہے بلکہ ایک دعویٰ بھی عدالت دیوانی میں اسی غرض سے دائر کیا مگر اس میں بالآخر ناکامی و نامرادی کا منھ دیکھنا پڑا اور نجف کا انتظام حسین آباد ٹرسٹ کے متعلق کر دیا گیا جو اب تک بدستور قائم ہے مگر حکیم صاحب کے خاندان والوں کو بروے وصیت نامہ وثیقہ برابر ملے جاتا ہے

سلطان مریم بیگم

سلطان مریم بیگم، ڈاکٹر شارٹ باميز، بغداد کی بیٹی، اقوام کی آرمنی اور مذہب عیسوی کی پیرو تھیں۔ غازی الدین حیدر کی مسند نشینی کے تیسرے سال ۱۸۱۶ء میں اُن کی ماں اُن کو کانپور سے لے کر لکھنؤ آئیں اور گومتی کے اُس پار محلہ حیدرآباد میں ایک کرایہ کا مکان لے کر فروکش ہوئیں۔ غازی الدین حیدر اُس طرف ہوا خوری کو جایا کرتے تھے۔ دونوں ایک ساتھ انگریزی پوشاک زیب تن کیے سڑک پر کھڑی ہو کر جناب عالی کو سلام کرتی رہیں۔ اُن کی ماں چاہتی تھیں کہ نواب کو اپنی شمع رُخ لڑکی کا پروانہ بنا کر مال و دولت حاصل کریں۔ جس سے زندگی عیش و فراغت سے بسر ہو۔ مگر نواب عرصہ تک ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بالآخر تیر تدبیر نشانہ پر پہنچا۔ ایک روز اس گل رعنا کی بوئے الفت نواب کے دماغ میں سما گئی۔ اسی روز نصف شب گزرنے کے بعد میر گلو خواص کو مع سپاہ اور پالکی بھیج کر بلوا لیا۔ اُن کی والدہ میر گلو سے کہنے لگیں کہ ہم نا اُمید ہو کر کانپور

واپس جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ صرف اخراجات کے منتظر تھے۔ المختصر مس نشارٹ خوب بن سنور کر نواب کی دولت سرا "فرح بخش" کے کمرہ میں داخل ہوئیں۔ جناب عالی نے بصد اشتیاق دیکھ کر فرمایا کہ میز پر سے ایک پٹاری تین لاکھ روپیہ کے مرصع زیورات کی لے جاؤ اور انھیں پہن کر ہمارے پاس آؤ۔ چنانچہ جب جناب عالی سے شرف ملازمت حاصل کر چکیں تو انھوں نے پانچ ہزار روپیہ دے کر رخصت کیا۔ بقول مرزا کمال الدین حیدر مصنف قیصر التواریخ اس وقت اُن کی ماں کی حالت بیان سے باہر تھی۔ فرط مسرت سے جامہ میں نہ سماتی تھی۔ صحن میں سجدۂ شکر بجا لاتی تھیں

کئی روز کے بعد پھر بوقت شب طلب فرمایا اور دوسرا اجس زیور جواہر کا، دو ہزار روپے۔ ایک ہزار اشرفی اور تین گٹھریاں ہر قسم کے کپڑوں کی مرحمت کیں پھر کئی روز کے بعد بنا کر حضرت عباسؑ کی حاضری اپنے ہاتھ سے کھلائی اور مذہب اسلام کی تلقین کی انھوں نے بظاہر بخوشی خاطر کلمہ طیبہ پڑھا۔ پھر فرمایا ہم نے تمھیں بیگم کیا۔ انھوں نے نذر پیش کی بعد قبول اسلام اُن کا نام سلطان بیگم رکھا۔ اس کے بعد ایک روزان کو جڑاؤ جوڑیاں مالیتی ایک لاکھ روپیہ، جن میں ہیرے کے سفید و گلابی نگینے جڑے تھے اور ایک نتھ ایک لاکھ روپیہ قیمت کی مرحمت فرمائی اور پانچ ہزار روپیہ درماہہ مقرر کر کے بارہ دری کے قریب محل سرا قیام کے لیے عنایت کی۔ سکھ پال سواری کو دیا اہتمام ڈیوڑھی اور فراہمی اسباب ضروری کے لیے ظفر الدولہ کپتان فتح علی خاں کو مقرر کیا۔ بعد قیام بادشاہت ۱۸۲۵ء میں جب شاہ غازی الدین حیدر نے سرکار کمپنی کو ایک کروڑ روپیہ بطور قرض موجود دے کر دس ہزار روپیہ ماہوار کا وثیقہ اپنی دوسری انگریز نژاد بیگم نواب مبارک محل کا مقرر کیا تو اس کے ساتھ ہی ساتھ ڈھائی ہزار روپیہ ماہوار کا وثیقہ سلطان مریم بیگم کا بھی مقرر کیا۔ اور دیگر کل لوازمات میں یہ بیگم نواب مبارک محل کی ہم پلہ اور ہمسر کر دی گئیں۔ غازی الدین حیدر نے ۱۸۲۷ء میں انتقال کیا۔

سید کمال الدین حیدر ناقل ہیں کہ بعد انتقال حضرت خلد مکان (شاہ غازی الدین حیدر) ایک حکیم کا ان کے یہاں بھی بڑا اختیار کل تھا۔ جس طرح حکیم بندہ مہدی خاں مبارک محل میں تھے۔ غازی الدین حیدر کے انتقال کے بیس برس بعد سلطان مریم بیگم کی والدہ مرض دق میں مبتلا ہوئیں۔ جب مرض میں شدت ہوئی اور انھوں نے محسوس کیا کہ پیمانہ عمر لبریز ہو چکا ہے صرف چھلکنے کی دیر ہے تو بہ نظر احتیاط ایک وصیت نامہ تحریر کر کے ریذیڈنٹ اودھ کے پاس بھیجا کہ میری ماں نے طمع زر میں مجھ کو ایک مسلمان کے دامن سے وابستہ کر دیا تھا۔ اس وقت بدرجۂ مجبوری میں نے اوپری دل سے اسلام قبول کر لیا تھا مگر تہ دل سے اپنے آبائی مذہب پر قائم رہی اور ہنوز قدیمی طریقہ پر صدق دل سے قائم ہوں چنانچہ میرے انتقال کے بعد میری تجہیز و تکفین عیسائی مذہب کے مطابق ہو۔ اور ایک ثلث تنخواہ میری وصیت کے موافق میرے بھائی جوزف شارٹ کے نام جاری ہو۔

وصیت نامہ تحریر کرنے کے بعد امام باڑہ آغا باقر خاں کے قریب حسن علی کپتان کے مکان میں جا کر بہ کرایہ رہیں اور دو برس کی طویل علالت کے بعد ۱۸۴۹ء کو جان عالم واجد علی شاہ کے عہد میں بوقت نو بجے شب انتقال کیا۔ بموجب وصیت کوٹھی دلکشا الدولہ کے سامنے روشن کھنو کے گورستان میں دفن کی گئیں۔ مدفن کے اوپر ایک گول گنبد تعمیر کیا گیا جو اب تک موجود ہے۔ بعد رحلت حسب الحکم شاہی مجد الدولہ نے ضبط کر کے پہرے بٹھائے۔ جب حسد رسے جواب رپورٹ ریذیڈنٹ آیا تو اُن کا متروکہ جوزف شارٹ اُن کے بھائی کو ملا۔ گو اس بارے میں منجانب سرکار شاہی خداوندان ایسٹ انڈیا کمپنی کو پھر تحریر کیا گیا کہ بصورت موجودہ پوری تنخواہ کربلائے معلیٰ بھیجی جائے مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ سلطان مریم کے بھائی جوزف شارٹ کی ذریت اب تک وثیقہ پا رہی ہے

ان میں سے کچھ لوگ خاص لکھنؤ میں مقیم ہیں، کچھ لوگ باہر ریلوے وغیرہ میں ملازم ہیں۔ مگر سب کے سب اپنے آبائی مذہب پر بدستور قائم ہیں۔

جوزف شارٹ اگرچہ مذہباً عیسائی تھے مگر لباس مثل مسلمانوں کے ہندوستانی وضع کا استعمال کرتے تھے۔ بزمانۂ غدر سرکش فوج نے اُن کا گھر بھی لوٹ لیا جس پر جان کے اندیشہ سے وہ شہر میں چھپ گئے۔ پھر محلہ دولت گنج میں حسن علی خاں تھانہ دار کے مکان میں جا کر مقیم ہوئے۔ وہاں سے نواب امیر الدولہ حیدر بیگ خاں کے پوتے مرزا محمد تقی اُن کو اپنے مکان میں منصور نگر لے گئے۔ اس مکان میں راٹن صاحب عیسائی بھی پوشیدہ طریقہ پر سکونت پذیر تھے۔ راٹن صاحب کے بڑے لڑکے محمد عسکری نے ایک روز جوزف شارٹ سے کچھ طلب کیا۔ جب ان کا مقصود حاصل نہ ہوا تو حسام الدولہ یوسف خاں کلکٹر عہد رجبی کے پاس جا کر کچا چٹھا بیان کر دیا کہ ہمارے محلہ میں انگریز روپوش ہیں ان کو یقین واثق تھا کہ میرے باپ ستی سفارش سے ضرور بری ہو جائیں گے۔ یوسف خاں نے اپنے بھائی ناصر الدولہ علی محمد خاں عرف ممو خاں جرنیل فوج سے تذکرہ کیا۔ اس پر پلٹن کے تلنگے محمد عسکری کے ہمراہ آئے۔ سب کی مشکیں باندھ کر براہ چوک مجمع عام سے در دولت پر لے گئے۔ جب یہ کل اسیران بلا حضرت محل والدہ مرزا برجیس قدر کے روبرو جا کر صف بستہ کھڑے ہوئے تو تلنگوں نے چاہا کہ سب کو گولی سے اڑا دیں۔ مگر مفتاح الدولہ نے سفارش کی کہ اس گروہ میں سلطان مریم بیگم کے حقیقی بھائی جوزف شارٹ بھی ہیں۔ حاکم وقت کسی رئیس و شریف کو تہ تیغ نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی عزت و حرمت کی نگہداشت کرتا ہے۔ پھر اثبات کر عرض کیا کہ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ مسلمان ہیں اور ہمیشہ سے ان کا لباس و طرز معاشرت مثل اہل اسلام کے رہا ہے۔ اس کے بعد اُن کا ہاتھ بغرض دستگیری جناب عالیہ

(والدۂ برجیس قدر) کے روبرو لے گئے کہ ملاحظہ فرمائیے ان کا لباس مثل ہندستانیوں کے ہے یا نہیں؟ مابعد اُن کی اہلیہ کا ہاتھ بغرضِ دستگیری جناب عالیہ کے ہاتھ میں دیدیا۔ انھوں نے فرمایا، ان لوگوں کی مشکیں کھول دو، صرف حراست میں رکھو اور دارغہ میر واجد علی کے سپرد کردو۔ میر واجد علی نے اُن کو ایک کرایہ کے مکان میں لیجا کر رکھ دیا اور اُن لوگوں کی حفاظتِ جان کے لیے مشہور کردیا کہ جوزف شارٹ کے داماد جوزف بانس بندوق کی ٹوپی بنانا جانتے ہیں۔

اور اُس کی تدبیر یہ کی کہ اپنے پاس سے کئی سو ٹوپیاں سرکار میں پیش کردیا کرتے تھے کہ یہ اُن کی بنائی ہوئی ہیں۔ مرتا کیا نہ کرتا ان سبھوں نے مصلحتِ وقت سمجھ کر مسلمانوں کی ایسی وضع قطع بنالی۔ داڑھیاں بڑھالیں۔ مشائخی کرتے پہن لیے۔ سر پر بادامی عمامے باندھے اور ہاتھ میں زیتون کے بڑے دانوں کی تسبیح لیے رہتے تھے۔ اس صورت سے خدا خدا کر کے بلوائیوں سے جان بچی۔

سرفراز محل

حسینی خانم نام، ملیح آباد کی رہنے والی تھیں، چہرہ کتابی رنگ سانولا نمکین آنکھیں رسیلی اور بڑی بڑی، جسم گداز اور ہاتھ پیر گول تھے۔ غازی الدین حیدر شاہ اودھ کی نظروں میں سما گئیں انھوں نے موصوفہ سے نکاح کر کے سرفراز محل کا خطاب دے کر عزت افزائی فرمائی۔

سرفراز محل ہنگامہ غدر تک پنج محلہ واقع مچھی بھون میں رہتی تھیں جب ۱۸۵۸ء میں مچھی بھون پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا تو شہر میں کرایہ کا مکان لے کر سکونت اختیار کی اُس کے بعد اکبری دروازہ کے قریب جھمونگہ کی چڑھائی پر ایک رفیع الشان

مکان خرید کر وہیں بفراغت زندگی بسر کرنے لگیں۔
ان کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ ۲۰ راکتوبر ۱۸۸۳ء کو تقریباً ستر برس کی عمر میں اپنے مکان مسکونہ میں انتقال کیا۔ امام باڑہ نجف اشرف میں دفن ہوئیں۔ میر مونس نے چہلم کی مجلس پڑھی۔
امام باڑہ شاہ نجف میں داخل ہوتے وقت ان کی قبر بائیں جانب گوشہ میں ملتی ہے جس پر لکڑی کا کٹہرا لگا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کے انتقال پر بعض لوگ ان کے قیمتی جواہر اور دیگر بیش قیمت اشیاء کھانے کے بہانہ سے خوانوں میں ڈھو کر لے گئے۔
سرفراز محل کا وثیقہ شاہ غازی الدین حیدر نے بروئے عہد نامہ ۱۷ راگست ۱۸۲۵ء ایک ہزار روپیہ ماہوار مقرر کیا تھا، ان کے ملازمین و متوسلین کے لیے بھی چھ سو ستائیس روپیہ ماہوار وثیقہ کے علاوہ مقرر کیے تھے۔ وثیقہ کی ایک تہائی تین سو بتیس روپیہ پانچ آنہ چار پائی ۳۳۳/۵/۴ کے لیے موصوفہ کو اختیار دیا تھا کہ جس کے حق میں چاہیں منتقل کر دیں۔ مگر ان کی وفات پر باقی ماندہ دو ثلث میں سے نصف کربلائے معلیٰ اور نجف اشرف بھیجا جائے گا جس کا ثواب بادشاہ کو ہوگا۔ چنانچہ بتاریخ ۴ راپریل ۱۸۶۶ء بیگم نے بابت ایک ثلث ایک وصیت نامہ تحریر کر کے چیف کمشنر مسٹر آر۔ ایچ ڈیوس (R. H. Davis) کو برائے تصدیق بھیج دیا تھا جس کی رو سے صرف بتیس روپیہ پانچ آنہ ۳۲/۵/۴ اپنی قبر کے مصارف کے لیے رکھے۔ باقی رقم وثیقہ مختلف اشخاص کے نام جاری کرنے کی ہدایت تھی جن میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے رقم وثیقہ بالمعاوضہ خریدی تھی اس وصیت نامہ میں جو بارہ ۱۲ اشخاص وثیقہ یابندگان نامزد کیے گئے تھے ان میں سے دو لاولد وفات پا گئے لہٰذا بتاریخ ۱۴ رجولائی ۱۸۶۶ء متوفیان کے بجائے دیگر اشخاص کے نام درج کرائے گئے، اور محمد امین خاں متولی کے دس روپیہ ماہوار اور ہادی علی خاں متولی کے پندرہ

روپیہ ماہوار بموجب وصیت نامہ مقرر کیے۔ یہ دونوں متولیان حنفی المذہب تھے۔ بیگم بھی ابتدا میں سُنی المذہب تھیں مگر بعد میں بادشاہ کی صحبت میں امامیہ مذہب اختیار کر لیا تھا۔ سرفراز محل کے ایک بھائی نواب علی محمد خاں عرف لعل خاں تھے۔ جن کے تین بیٹے امجد علی خاں، اکبر علی خاں اور احمد علی خاں تھے۔ اکبر علی خاں کے بیٹے افسر علی خاں تھے جنہوں نے تھوڑا عرصہ گزرا انتقال کیا۔

بعد رحلت سرفراز محل جن اشخاص کے نام وثیقہ جاری ہوا اُن میں سے خاص خاص آدمیوں کے نام درج ذیل ہیں:-

منشی کالکا پرشاد خریدار وثیقہ ایک سو پانچ ۱۰۵ روپیہ داروغہ عاشق عسکری خریدار وثیقہ سینتالیس ۴۷ روپیہ امجد علی خاں بھتیجہ سرفراز محل اکیس ۲۱ روپیہ اکبر علی خاں بھتیجہ سرفراز محل ستر ۷۰ روپیہ ماہوار میاں زنبخت علی خاں ناظر ڈیوڑھی خود تیس ۳۰ روپیہ ماہوار۔

اس وثیقہ کی تقسیم میجر ہارس فورڈ (Major Hors Ford) افسر کچہری وثیقہ نے کی۔ املاک سرفراز محل واقع محمود نگر لکھنؤ کھنڈر ہو چکی ہے۔

سرفراز محل (ثانی)

یہ بیگم کسی بادشاہ کی بیوی نہ تھیں مگر چونکہ یہ خطاب بھی تاجدار اودھ کا بخشا ہوا ہے اس لیے ان بیگم کا تذکرہ بھی مختصر الفاظ میں کیا جاتا ہے۔

بعد انتقال غازی الدین حیدر اُن کے فرزند دلبند شاہ نصیر الدین حیدر نے یہ خطاب وزیر اعظم نواب روشن الدولہ کی ایک بیوی کو دیا تھا۔ شروع زمانۂ وزارت میں شاہ موصوف روشن الدولہ پر بہت مہربان تھے، اکثر اُن کی کوٹھی میں تشریف لے جاتے تھے روشن الدولہ باہر کی نشست اُن کے خلاف مزاج سمجھ کر اُن کو زنان خانے میں لے جاتے

تھے۔ جہاں ارباب نشاط کی صحبت گرم رہتی تھی، اور روشن الدولہ کی بیوی ہنسی مذاق
دلچسپ نقلوں اور گرما گرم فقروں سے بادشاہ کے دل کو بہلائے رہتی تھیں ان مسماۃ کا نام
حسینی اور دوسرا نام محبوبن بھی تھا۔ پہلے طوائف کا پیشہ کرتی تھیں مگر روشن الدولہ نے
ان کو گھر بٹھا لیا تھا۔ روشن الدولہ کے بیٹے مرزا محمد حسن خاں انھیں بی حسینی کے بطن
سے تھے۔ بادشاہ نے خوش ہو کر بی حسینی کو سرفراز محل کا خطاب عطا فرمایا۔ اور اُن کے
محمد حسن خاں کو لشکر سلطانی کا جرنیل مقرر کیا۔ جرنیل کی شادی نواب معتمد الدولہ آغا میر کی
کدوکاوش سے شہزادہ سلیمان شکوہ کی ایک بیٹی سے ہوئی جن کی ایک دختر نواب سلطان
رقیہ بیگم شاہ نصیر الدین حیدر کو پیشتر ہی سے منسوب تھیں، اس طور پر جرنیل محمد حسن خاں
بادشاہ بیگم کے ہم زُلف ہو گئے۔ گو شہزادہ سلیمان شکوہ کو یہ نسبت کسی طرح منظور نہ تھی مگر
معتمد الدولہ کے دبدبہ اور جبر دست سے بے بس ہو گئے۔ شروع زمانہ حکومت حضرت محمد علی
شاہ میں روشن الدولہ معزول ہوئے اور اُن کی کل املاک محاسبہ میں ضبط کی گئی جس پر کچھ
لاکھ روپیہ علاوہ شاہی کی نذر کر کے کانپور چلے گئے وہاں جرنیل روشن الدولہ سے دس لاکھ
روپے لے کر اُن سے جُدا ہو گئے۔ روشن الدولہ تو گھر سے خرچ کرتے کرتے بالکل تہیدست
ہو گئے اور آخر میں تنگی ترشی سے زندگی بسر کر کے دنیا سے رُخصت ہو گئے مگر جرنیل بہت
بد چلنی سے زندگی بسر کرتے رہے۔

ممتاز محل

اس خطاب کی اودھ میں کئی بیگمات گزری ہیں۔ اولاً یہ خطاب مسماۃ صبح دولت
کو دیا گیا، جو بادشاہ بیگم صاحب محل خاص شاہ زمن غازی الدین حیدر کی خواص تھی۔
شاہ موصوف اس گلبدن غنچہ دہن پر فریفتہ ہو کر اس کے باغ حُسن سے گل چینی کرنے لگے

جب اُس کے بطن سے شہزادہ نصیر الدین حیدر عرف مرزا علی حیدر بتاریخ ۲ جمادی الاول ۱۲۱۸ھ پیدا ہوئے تو اُس کو ممتاز محل کا خطاب عطا کر کے سربلند کیا مگر شہزادہ کی ولادت کو چند ہی ماہ گزرے تھے کہ ممتاز محل کو اپنی جانِ عزیز جان آفریں کے سپرد کرنا پڑی۔ بعد وفات غازی الدین حیدر، اُن کے نورِ نظر نصیر الدین حیدر کے سر پر ۱۸۲۷ء سے لے کر ۱۸۳۷ء تک تاجِ شاہی جگمگاتا رہا۔

منشی عبدالاحد مصنّف "وقائع دلپذیر" جو بادشاہ بیگم کے ہمعصر تھے۔ ممتاز محل کے سانحۂ ارتحال کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی کتاب میں تحریر کرتے ہیں کہ بادشاہ بیگم سوت کا جلاپا برداشت نہ کر سکیں اور صبح دولت کو اذیتیں دے دے کر ختم کرا دیا۔ اُس کی لاش شہر کے ناکہ پر چھانچہ باغ میں جہاں غربا کے مردے دفن ہوتے تھے سپرد لحد کی گئی۔ اُس کی وفات کے بعد بادشاہ بیگم نے چاہا کہ گلِ نوشگفتہ نصیر الدین حیدر کو بھی ٹھکانے لگا دیں۔ مگر فیض النسا مغلانی نے خدا ترسی کر کے اُن کو اس مکروہ فعل سے باز رکھا۔ بعدہ بادشاہ بیگم نے بچّہ کا نام نصیر الدین حیدر رکھ کر ایسی محبت اور شفقت سے اپنا بیٹا بنا کر پرورش کیا کہ کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ نصیر الدین حیدر اُن کے بطن سے نہیں ہیں۔ جب نصیر الدین حیدر تاج و تخت کے مالک ہوئے اور اُن کو نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں کی زبانی معلوم ہوا کہ اُن کی حقیقی ماں ممتاز محل کو بادشاہ بیگم نے طرح طرح کی بدسلوکیاں کر کے موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا تو انھوں نے اپنی والدہ کی قبر پر ایک مقبرہ بنوا دیا۔ جو امتداد زمانہ سے اب منہدم ہو کر رہ گیا ہے۔

ممتاز محل ثانی

یہ شاہ زمن غازی الدین حیدر کی نومسلم بیوی اور رتی لال بقال کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور جگن ناتھ بقال کی رشتہ دار تھیں جو بعلّت باقی داری سرکار اپنی گلوخلاصی

کے لیے از خود مسلمان ہو گئے تھے جن کا اسلامی نام غلام رضا خاں رکھا گیا تھا اور شرف الدولہ کے خطاب سے بھی ممتاز ہوئے تھے۔ انھیں شرف الدولہ کا بنوایا ہوا روضہ کاظمین محلہ منصور نگر لکھنؤ میں اب تک موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ممتاز محل کی ایک اور بہن بھی دائرہ اسلام میں آئی تھیں جن کا اسلامی نام لاڈو خانم رکھا گیا تھا۔

بعد انتقال صبح دولت المخاطب بہ ممتاز محل شاہ غازی الدین حیدر نے موصوفہ سے نکاح کر کے اُن کو بھی ممتاز محل کے خطاب سے افتخار بخشا۔ بیگم کا چہرہ طباقی، پیشانی کشادہ، آنکھیں بڑی بڑی اور رنگ گندمی تھا۔ کان کی لوؤں میں ترکیوں کے پہننے کے چاک موجود تھے۔ اور بائیں ہاتھ میں گودنا گدا ہوا تھا۔ بزمانۂ حیات غازی الدین حیدر ممتاز محل ثانی امام باڑہ نجف اشرف کی پشت پر ایک مکان میں رہتی تھیں جو دریا اور نجف کے درمیان واقع تھا۔ یہ مکان تخمیناً ۱۹۱۳ء میں جب بٹلر روڈ (Butler road) دریا کے کنارے نکالی گئی تو کھد گیا۔ اب صرف ایک دیوار لبِ دریا بطورِ نشانی باقی رہ گئی ہے۔

مبلغ ایک کروڑ روپیہ جو شاہ غازی الدین حیدر نے سرکار کمپنی کو بتاریخ ۱۷ اگست ۱۸۲۵ء بطور قرض دوام دیے تھے اس رقم کے سود سے منجملہ اور محلات کے ممتاز محل کے گیارہ سو روپیہ ماہوار بطور وثیقہ مقرر ہوئے تھے مگر بوجہ لاولد انتقال کرنے کے ان کا وثیقہ انھیں پر ختم ہو گیا۔

بیوہ ہو جانے کے بعد موصوفہ کا لباس سادہ اور سفید ہوتا تھا، اونچا چوڑا مو باف سے بندھا ہوا سر پر سفید ململ کا دوپٹہ، گلے میں اصلی جامدانی کا کُرتہ، پیروں میں بڑے پائنچوں کا پائجامہ اور سفید کا شانی ململ کا گھیتلا جوتا، ہاتھوں میں علی بند یعنی ٹھونس پہنتی تھیں۔ تخمیناً ۱۸۹۶ء میں انھوں نے انتقال کیا۔ امام باڑہ نجف اشرف میں داخل ہوتے وقت اُن کی قبر بادشاہ کی قبر کے بائیں جانب ملتی ہے جس پر چاندی کا کٹہرا لگا ہوا

ہے۔

بعد انتقال غازی الدّین حیدر ۱۸۲۷ء سے ۱۸۵۷ء کے فسادِ عظیم تک موصوفہ پنج محلے والی مچھی بھون میں رہیں، جب انگریزوں نے مچھی بھون کو اپنے قبضہ میں کر لیا تو شہر میں کرایہ کا مکان لے کر رہیں، بعدہٗ محلہ گولا گنج میں اپنا ذاتی مکان بنوا کر اس میں منتقل ہو گئیں۔ یہ مکان اب فروخت ہو کر کُھد گیا ہے۔ صرف پُرانا پھاٹک اُن کی یاد دلانے کو باقی ہے مگر اُن کی ایک خوشنما مسجد محلہ چاندی خانہ میں کنگھے محل کے امام باڑے کے پاس ڈیوڑھی آغا میر متصل اب تک قائم ہے، جو اُن کے نام کو روشن کیے ہوئے ہے۔ مسجد میں ایک قطعۂ تاریخ بھی نصب ہے، جو زیادہ تر مٹا ہوا ہے صرف الفاظ مندرجہ ذیل بدقت پڑھے جا سکے

عاشق و ناظرہ ممتاز محل صاحب عفت ....

زوجِ اُو شاہ غازی الدین خود چو خورشید ......

کرد تعمیر چو از بہر نماز .... اندر خاک

مسجد نہایت دیدہ زیب ہے۔ مبنت کا کام بھی نہایت دلکش ہے مگر سنہ تعمیر پڑھا نہیں جا سکا۔ تیسری محل کے حالات واجد علی بادشاہ کی بیگموں کے سلسلہ میں درج ہیں

بادشاہ دوم شاہ نصیر الدین حیدر

(۱۸۳۷ء - ۱۸۲۷ء)

۲۵ برس کی عمر میں موصوف وارث تاج و تخت ہوئے اور دس برس برسرِ حکومت رہے۔ اُن کے عہد دولت میں بہت سے کام آسائش خلق کے بھی ہوئے۔ وکٹوریہ اسٹریٹ پر ڈاکٹری اسپتال اور چوک بازار میں یونانی شفاخانہ قائم کیا گیا۔ اسپتال کے قریب غریبوں محتاجوں کے لیے ایک غریب خانہ اور کوڑھیوں کے لیے ایک صحت خانہ کی بنیاد بادشاہ نگر کے قریب ڈالی گئی۔ اُن کے علاوہ ایک رصد خانہ (موجودہ امپیریل بینک) اور کربلا بھی محلہ ارادت نگر میں موجودہ شیعہ کالج کے قریب تعمیر کرائی۔ مدرسہ اور چھاپہ خانہ جاری کیا۔ اور دو محلے گنیش گنج چاند گنج آباد کیے۔

اُن کے قابل تذکرہ محلات یہ تھے:- (۱) سلطان بہو صاحب خاص محل یعنی بیاہتا بیوی (۲) ملکہ زمانیہ (۳) مخدرہ عظمیٰ (۴) تاج محل (۵) بادشاہ محل (۶) قدسیہ محل اور (۷) صاحبہ محل وغیرہ

لالہ رام پرشاد رفیق خاص افتخار الدولہ مہاراجہ میوہ رام نے بادشاہ کی خوشنودی مزاج کے لیے بہت سی اسامیاں بصرف کثیر فرقہ ارباب نشاط میں سے منتخب کر کے جمع کی تھیں اُن سب کو طلب کر کے داخل محل کیا اور "عیش محل" خطاب دیا۔ قیصر التواریخ جلد ا اُن کے علاوہ بہت سی کسبیاں مثل کرم بخش وغیرہ جو سر آمد روزگار تھیں داخل محل ہوئیں۔ اُن کی تفصیل بیان سے باہر ہے (قیصر التواریخ جلد اول)

۷ جولائی کو زہر دے کر اُن کی شمع حیات کو اُن کے دشمنوں نے گل کر دیا۔ بروقت رحلت سن شریف ۳۵ سال کا تھا۔ میت کربلائے ارادت نگر میں سپرد خاک کی گئی۔

بروقت تخت نشینی خزانہ بھرا پڑا تھا۔ نواب سعادت علی خاں کی جمع کی ہوئی رقم خطیر میں سے دس کروڑ روپے موجود تھے مگر دس برس کے بعد اُن کی وفات پر خزانہ میں صرف ستر لاکھ روپے نکلے جس میں مبلغ ۵۲ لاکھ روپے قدسیہ محل کے متروکہ کے بھی شامل تھے۔

نواب سلطان بہو صاحبہ

اودھ کی دوشیزہ ملکہ

محل خاص حضرت نصیر الدین حیدر تاجدار اودھ

نواب رقیہ سلطان بیگم المخاطب بہ نواب سلطان بہو صاحبہ مرزا سلیمان شکوہ شہزادہ دہلی کی لاڈلی بیٹی اور حضرت شاہ عالم شہنشاہ دہلی کی پوتی تھی۔ لڑکپن میں گھر والے پیار سے اُن کو بُوا سلطانہ بھی کہتے تھے۔ اُن کی دو سگی بہنیں اور تھیں جن کے نام تقیہ سلطان بیگم اور تر نیہ سلطان بیگم تھے۔ مرزا سلیمان شکوہ حضرت شاہ عالم کے دوسرے بیٹے نواب قدسیہ بیگم کے بطن سے تھے جو ایران کے شاہی صفویہ خاندان کی ایک رکن اور امامیہ مذہب کی پیرو تھیں۔ شہزادہ موصوف بھی اپنی ماں کے مذہب پر تھے۔ بعد بغاوت غلام قادر روہیلہ جس نے شاہ عالم کو نابینا کر دیا تھا۔ سلطنت دہلی کی حالت ابتر ہو گئی۔ اگلا سا وہ تجمل اور احتشام نہ رہا۔ جہاں پہلے ہر طرف غنچہ و گل تھے وہاں نیرنگی زمانہ سے اب بالکل خار ہی خار دکھائی پڑتے تھے۔ جب ضروریاتِ زندگی کے بھی لالے پڑے اور پریشانیوں نے ہر طرف سے نرغہ کیا تو شہزادہ نے بصد حسرت و یاس ترک وطن کا عزم کیا۔ اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انھوں نے کئی گوجر ملازم رکھے اور ایک گھوڑا سواری کے لیے اُن کے ساتھ کر کے دریا کے پار اُتار دیا

اور خود بھی تاریکیٔ شب میں کمند ڈال کر قلعہ کی بلند فصیل سے نیچے اُتر آئے پھر ایک گھوڑے کی پیٹھ پر دریا عبور کر کے دوسری طرف آئے اور بیس کوس اُسی برق رفتار سے گھوڑے پر چل کر داخل ریاست رامپور ہوئے۔ وہاں اُن کا بہت شاندار خیر مقدم ہوا۔ نواب فیض اللہ خاں رئیس رامپور نے خیمہ میں اُتار کر گراں قدر نذرانہ پیش کیا جس سے کلفتیں دور ہو گئیں اور سامانِ شاہانہ فراہم ہو گیا۔

وہاں سے رخصت ہو کر لکھنؤ کا رُخ کیا۔ اور صوبۂ اودھ میں داخل ہو کر ناگہ شہر لکھنؤ میں تکیۂ بودعلی شاہ کے قریب ایک باغ میں بہ جمعیت پانچ ہزار سوار و پیدل شاگرد پیشہ وغیرہ فروکش ہوئے۔ خیموں میں قیام کیا مگر شہزادہ کی آمد نواب آصف الدولہ کے بارِ خاطر ہو گئی انھوں نے داخلۂ شہر کی اجازت نہ دی کیونکہ چار سال قبل ۱۷۸۴ء میں شہزادہ کے برادرِ معظم مرزا جہاندار شاہ عرف مرزا جہاں بخت بھی دہلی سے لکھنؤ تشریف لائے تھے جن کی پنشن نواب آصف الدولہ نے نہایت فیاضی سے پچیس ہزار روپیہ ماہوار مقرر کر دی تھی۔ مگر شہزادہ موصوف سے کچھ ایسے افعال ناروا سرزد ہوئے کہ آصف الدولہ کا آئینہ دل اُن کی طرف سے غبار آلود ہو گیا جس پر انھوں نے لکھنؤ کی سکونت ترک کر کے بنارس میں استقامت فرمائی۔

نواب آصف الدولہ خیال کرتے تھے کہ مرزا سلیمان شکوہ بھی مثل اپنے بڑے بھائی کے ہوں گے اور اگر شہزادگان دہلی اسی طرح لکھنؤ میں آ کر بستے رہے تو میری پوری آمدنی گذاروں اور پنشنوں کی نذر ہو جائے گی اس لیے نواب نے شہزادہ سے معذرت کہلا بھیجی کہ جو عہد نامہ میں نے سرکارِ انگریزی سے کیا ہے اس کی رو سے بلا صلاح و مشورہ نواب گورنر جنرل فدوی حاضرِ خدمت نہیں ہو سکتا۔ آخر کار اکرام اللہ خاں نے اپنے بھائی علامہ تفضل حسین خاں نائب الریاست کو موافق کیا انھوں نے گورنر جنرل کو سمجھا بجھا کر اجازتِ ملاقات دلوائی۔ نواب نے شہزادہ کے قیام گاہ پر جا کر اُن کا استقبال کیا جو

تخمیناً تین ماہ سے خیموں میں بسر کر رہے تھے۔ شہزادہ ایک کوہ پیکر ہاتھی پر متمکن ہوئے
نواب حسبِ دستور وزیر اعظم خواصی میں بیٹھ کر مورچھل کو جنبش دیتے ہوئے بڑے جاہ و
جلال سے لکھنؤ لائے۔ بنگلہ مرزا خلیل میں قیام ہوا جو قریب کوٹھی ریذیڈنسی کنار دریا واقع
تھا پھر جنرل مارٹین کی ٹیڑھی کوٹھی خرید کر اس میں منتقل ہو گئے۔ اس کے بعد لارڈ کارنوالس
گورنر جنرل لکھنؤ تشریف لائے تو اُن کی سفارش سے چھ ہزار روپیہ ماہوار بطور مصارف
باورچی خانہ سرکار نواب اودھ سے مقرر ہوئے۔ خاں زاد خاں کو داروغگی ذات خاص
تفویض ہوئی۔ شہزادہ موصوف تاریخ آمد سے تا سنہ جلوس شاہ زمن غازی الدین حیدر
کمال اعزاز اور احترام سے لکھنؤ میں رہے۔ جب نواب سعادت علی خاں مسند نشین ریاست
ہوئے اور دولت خانہ قدیم تعمیر کردہ نواب آصف الدولہ کی سکونت ترک کر کے اور
جنرل مارٹین کی عمارت فرح بخش خرید کر اس میں منتقل گئے تو خلاف آداب شاہی سمجھ کر
کوٹھی کرنل صاحب کنار دریا متصل ریذیڈنسی بعوض ٹیڑھی کوٹھی شہزادہ کو پیش کی۔

نواب سعادت علی خاں اور اُن کے بیٹے نواب غازی الدین حیدر خاں ایام
بادشاہت بطریق صوبہ داری پیش آیا کیے یعنی شہزادہ کو نذر دیتے تھے اور خلعت پہنتے تھے
اور جب کبھی شارع عام پر شہزادہ صاحب اور نواب موصوف کی سواریوں میں مڈبھیڑ
ہو جاتی تھی تو نواب کی سواری کا ہاتھی ازراہ ادب گھٹنوں کے بل بٹھا دیا جاتا تھا۔ اور شہزادہ کا
کا ہاتھی اسی آن بان سے نکل جاتا تھا۔

۱۸۱۹ء میں جب نواب غازی الدین حیدر خاں شاہ اودھ قرار پائے تو
شہزادہ سے مساویانہ ملاقات کے طالب ہوئے جب شہزادہ نے اپنی شان برقرار رکھ
کر ملاقات کی تو شاہ غازی الدین حیدر کا غنچۂ دل کھلا کر رہ گیا کہ میرا اشتیاق دلی
پورا نہ ہوا اس روز سے جانبین کے دل ایسے مکدر ہو گئے کہ نصیر الدین حیدر کی شادی
تک ملاقات کی نوبت نہ آئی۔

بعد قیام بادشاہت غازی الدین حیدر نے خیال کیا کہ میں بادشاہ کے منصب جلیلہ پر فائز ہوا ہوں۔ اب خاندان تیموریہ سے رشتہ قائم کرنا چاہیے چنانچہ انھوں نے نواب معتمد الدولہ آغا میر کو مقرر کیا کہ وہ مرزا سلیمان شکوہ کو رضامند کریں کہ وہ اپنی دختر رقیہ سلطان بیگم کی شادی ولی عہد سلطنت مرزا نصیر الدین حیدر سے کر دیں۔ بعض شہزادگان دہلی مقیم لکھنؤ راوی ہیں کہ اولاً شہزادہ نے یہ رشتہ قائم کرنے سے بوجوہ صاف انکار کر دیا۔ اس پر اُن کی تنخواہ روک دی گئی جس سے سخت مالی مشکلات سے دو چار ہونا پڑا اور گوناگوں مصائب کا چشمہ اُبل پڑا۔ شہزادے کے متعلقین و متوسلین کی تعداد کئی سو تھی ایک روز روپیہ کا ایسا توڑا ہو گیا کہ دستر خوان پر صرف بھنے ہوئے چنے آئے اس پر شہزادہ اشکبار ہو گئے۔ آغا میر نے میر گلزار علی خاں رفیق الدولہ کو جو شہزادہ کے عقل کل تھے بہ طمع زر ہموار کیا۔ انھوں نے شہزادہ کے محل خاص نواب نوازش محل کو نشیب و فراز سے باخبر کیا۔ سب زر سے پر ہوتا ہے۔ آخر کار اپنی بھتیجی اور دل نواز بیوی نواب نوازش محل اور مختار کے سمجھانے از راہ مصلحت و دور اندیشی رضامند ہو گئے۔

نواب سلطان بہو نہایت قبول صورت خوش خلق اور پیکر شرم و حیا تھیں مگر میاں بیوی میں ہمیشہ اَن بن رہی کبھی موافقت نہ ہوئی۔

اکتوبر ۱۸۲۷ء میں نصیر الدین حیدر تخت سلطنت پر جلوہ گر ہوئے۔ تاجپوشی سے ایک سال کے اندر ہی جون ۱۸۲۸ء میں خسر اور داماد میں جھگڑا ہو گیا۔ سبب یہ ہوا کہ شہزادہ کی ایک بیگم سرفراز محل نے ایک لڑکی مانجاں کلاونت کی لے کر بطور اپنی بیٹی کے ناز و نعم سے پالی تھی۔ اس کا نام قمر چہرہ تھا اس کا مکھڑا واقعی چاند کا ٹکڑا تھا۔ جب وہ جوان ہوئی تو اس کے حسن و جمال کا شہرہ سُن کر نصیر الدین حیدر اُس کے عاشق زار ہو گئے اور اعتماد الدولہ میر فضل علی خاں اپنے وزیر اعظم کو شہزادہ کے پاس بھیجا کہ اگر آپ اُس کا نکاح مجھ سے کر دیں تو پانچ ہزار روپیہ ماہوار اور اضافہ کر دوں گا۔ شہزادہ نے یہ امر باعث بدنامی

سمجھ کر کہ گھر گھر چرچا ہوگا کہ اپنی بیٹی پر خود سوت مسلط کر دی قبول نہ کیا اس پر بادشاہ بت چراغ پا ہوئے اور ایک روز جب شہزادے کے محلات اپنے باغ جا رہے تھے تو نصیر الدین حیدر نے ایک کشتی کے ذریعہ سے قمر جہرہ کی سواری نواب سلطان بہو کے محل میں اُتروا دی شہزادہ نے خبر پاتے ہی اس امر کی فریاد ریذیڈنٹ سے کی اُنھوں نے نصیر الدین حیدر سے کہلا بھیجا کہ اس معاملہ میں آپ کی بڑی رُسوائی ہوگی اور ہنگامہ عظیم ہو جانے کا بھی اندیشہ ہے بہتر ہوگا کہ آپ اس لڑکی کو فوراً واپس کر دیں۔ نصیر الدین حیدر نے قمر جہرہ کو سوار کر کے بھیج دیا اور ریذیڈنٹ سے یہ کہہ کر بات بنا دی کہ وہ اپنی ہمشیرہ نواب سلطان بہو کی ملاقات کو محل میں گئی تھیں یہ مجھ پر تہمت تراشی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ نصیر الدین حیدر نے اُن کے گزارہ سے مبلغ پانچ ہزار روپیہ جو بروقت ملاقات مساویانہ مقرر ہوئے تھے تنخواہ سے کم کر دیئے۔ جب قمر جہرہ شہزادہ کے یہاں واپس آئی تو اُنھوں نے اُس کے پیر میں بیڑیاں ڈال کر قید کر دیا۔

اس واقعہ کے بعد شہزادہ کو لکھنؤ میں رہنا وبال جان ہو گیا۔ انھوں نے اپنے سمدھی کرنل گارڈنر رئیس کاسگنج کو جن کی پوتی سوسین گارڈنر (Susanne Gardner) شہزادہ کے ایک بیٹے مرزا علی طاہر کو منسوب تھیں بلا بھیجا۔ کرنل موصوف لکھنؤ آکر شہزادہ کو کاسگنج لے گئے اور قمر جہرہ کو اپنی بیگم کی نگرانی میں کر دیا جو صوبہ بمبئی کے ایک رئیس کی بیٹی تھیں۔ یہاں کرنل گارڈنر کے بیٹے جیمس گارڈنر پر قمر جہرہ کے حُسن فسوں ساز کا ایسا جادو چل گیا کہ وہ اُسے لے اُڑے اور خفیہ طور پر الور جا پہنچے۔ کرنل گارڈنر جو نہایت ہی شریف النفس انگریز تھے۔ اس حرکت نازیبا کی وجہ سے اپنے بیٹے کی صورت سے بیزار ہو گئے۔ اُن کے خطوط کا بھی کبھی کوئی جواب نہ دیا۔ جیمس گارڈنر اور قمر جہرہ دو سال تک متواتر جنگلوں میں حیران و پریشان گھومتے رہے۔ ایک روز جیمس گارڈنر نے اپنے باپ کو کشتی میں سوار دیکھ کر تہیہ کر لیا کہ یا تو آج عفو تقصیر کراؤں گا یا جان پر کھیل جاؤں گا چنانچہ وہ کشتی کے ساتھ

مسلسل تیر تے رہے۔ مگر کرنل گارڈنر ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آخر کار جب اُنھوں نے دیکھا کہ جیمس گارڈنر بالکل شل ہو گئے ہیں اور عنقریب غرق آب ہوا چاہتے ہیں تو محبت پدری تو جہ ارادی پر غالب آئی اُنھوں نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر ناؤ پر بٹھا لیا۔ خطا بھی معاف کر دی اُس کے بعد جیمس گارڈنر کی شادی باقاعدہ ملکہ جیرہ کے ساتھ ہو گئی اور تین اولادیں بھی پیدا ہوئیں جن کے نام سلیمان۔ ولیم گارڈنر اور نوشابہ بیگم رکھے گئے۔

اس واقعہ سے شہزادہ کو اور بھی زیادہ کوفت ہوئی اور کاس گنج کی سکونت ترک کر کے اکبر آباد میں قیام اختیار کیا اور اپنے خویش نصیر الدین حیدر سے اس قدر ناراض ہو گئے کہ اپنے جیتے جی نہ بیٹی کو کبھی بلایا نہ خود اُن کو دیکھنے کو آئے۔ اُن کی صاحبزادی شل سابق اودھ ہی میں مقیم رہیں ظلم و ستم کا نشانہ بنتی رہیں نصیر الدین حیدر نے اپنی تخت نشینی کا سالانہ جشن ۱۸۳۲ء میں بڑے تزک و احتشام سے منایا تھا۔ اُس روز ایک یورپین خاتون بیگمات شاہی کو دیکھنے کے اشتیاق میں دولت سرائے سلطانی گئی تھیں۔ اُن کا بیان ہے کہ میں بادشاہ کے خاص محل سلطان بہو کو نہ دیکھ سکی کیونکہ مجھے معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ اُن پر عتاب شاہی نازل ہے اور وہ اُسی محل میں اسیروں کی طرح زندگی گزار رہی ہیں۔

دیگر مورخین نے بھی واقعات مرقومہ بالا کی تصدیق و تائید کی ہے مثلاً فانی پارکس (Fanny Parkes) ایک فرانسیسی خاتون بہ سلسلۂ سیاحت ہند ۱۸۳۲ء میں شہر لکھنؤ بھی آئی تھیں وہ اپنے سفر نامہ میں تحریر کرتی ہیں کہ بیگمات شاہی اودھ کے کچھ اندرونی حالات مجھے ایک ایسے شخص کی زبانی معلوم ہوئے جس نے مجھ کو تاکید کر دی تھی کہ سر دست یہ باتیں آپ اپنے تک رکھیے گا اور کسی کو نہ معلوم ہونے پائیں ورنہ آپ کی اودھ سے واپسی پر اگر یہ پتہ چل گیا کہ یہ رازہائے سربستہ میں نے طشت از بام کیے ہیں تو اُس کی پاداش میں میری جان پر بن جائے گی۔ وہ حالات یہ ہیں:-

" ملکہ یعنی نواب سلطان بہو ہز رائل ہائی نس (His Royal Highness)

مرزا سلیمان شکوہ کی بیٹی ہیں جو موجودہ شہنشاہ دہلی اکبر شاہ ثانی کے حقیقی بھائی ہیں۔ شادی کے اول ہی روز سے ملکہ صاحبہ کے ساتھ لاپروائی اور بے التفاتی برتی گئی اور مناسب برتاؤ بھی اُن کے ساتھ نہیں کیا گیا۔ تھوڑے عرصہ قبل تک اُن کو صرف بیس عدد روپیہ یومیہ یعنی چھ سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ آج کل وہ دو ہزار روپیہ ماہوار پا رہی ہیں مگر محل کے باہر قدم رکھنے کی اُن کو مطلق اجازت نہیں ہے۔ اُن کے خاندان کے کل قدیم ملازمین کو جواب دے دیا گیا اور فی نفسہ وہ ایک نظر بند کی حیثیت سے ایام زندگی کاٹ رہی ہیں۔ نہ کبھی بادشاہ اُن کے پاس جاتے ہیں نہ بادشاہ کا کوئی عزیز و از قسم ہمیار رشتہ دار نہ کسی دوسرے شخص کی مجال ہے جو اُن کے قیام گاہ کی طرف رُخ بھی کر سکے۔

اہلیہ رزیڈنٹ نے مجھ سے بیان کیا کہ ملکہ چندے آفتاب چندے ماہتاب ہیں ایسی حسین و جمیل عورت میری نظر سے کبھی نہیں گزری مجھے اُن کی ہمشیرہ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور اُن کو دیکھ کر میں بآسانی یقین کر سکتی ہوں کہ ملکہ کی رعنائی و زیبائی بیان کرنے میں ذرہ برابر مبالغہ سے کام نہ لیا گیا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ اُن کی کتخدائی کو تخمیناً پانچ سال گزرے ہیں اور انھوں نے اپنی زندگی کی زیادہ سے زیادہ سولہ یا سترہ بہاریں دیکھی ہوں گی۔ ملکہ کے والد عہد نواب آصف الدولہ سے لکھنؤ میں مقیم تھے۔ شاہ مرحوم غازی الدین حیدر نے اُن کو مجبور کیا کہ اپنی بیٹی کی شادی مرزا نصیر الدین حیدر، اُن کے ولی عہد کے ساتھ کر دیں۔

مرزا سلیمان شکوہ کو پانچ ہزار روپیہ ماہوار بطور گذارہ ملتے تھے۔ اب اس رقم کی ادائی بھی رُکی ہوئی ہے اور بماہ جون ۱۸۲۵ء شاہزادہ موصوف کی ایسی توہین اور تذلیل کی گئی کہ وہ شہر لکھنؤ کی سکونت ترک کرنے پر مجبور ہو گئے۔

کہا جاتا ہے کہ دہلی کے خاندان تیموریہ کی یہ چشم و چراغ شہزادی بوا سلطانہ اپنے

باپ کے اس امر پر مجبور کیے جانے پر کہ وہ اُن کی شادی نصیر الدین حیدر کے ساتھ کر دیں۔ نہایت آزردہ اور برافروختہ ہیں اور بمقابلہ خود نصیر الدین حیدر کو اس قدر ادنیٰ اور کم ذات آدمی خیال کرتی ہیں کہ نہ وہ کبھی اپنے محل میں اُن کے آنے کی روادار ہوئیں نہ کبھی اپنے پلنگ پر اُنھیں قدم رکھنے دیا۔ شہزادہ سلیماں شکوہ بہت ہی کثیر الاولاد ہیں۔ اُن کے کل بادن اولادیں ہوئیں جن میں بارہ لڑکے اور چالیس لڑکیاں تھیں۔ شہزادہ بالکل تہی دست ہیں۔ اُن کی پانچہزار روپیہ ماہوار کی پنشن متعدد مہاجنوں کے پاس رہن ہے۔

سلیمن صاحب ریذیڈنٹ اودھ بھی نواب سلطان بہو کے بڑے معترف اور مداح تھے وہ اپنے سفرنامہ اودھ میں جو انھوں نے سنہ ۱۸۵۰ء میں مرتب کیا تھا اور جو ایک صنعتی اور رسمی سفارتی تھی وہ موصوفہ کی نسبت حسب ذیل تحریر کرتے ہیں:۔

"شاہ نصیر الدین حیدر کی شادی شہنشاہ دہلی کی پوتی سے ہوئی تھی۔ یہ نوجوان شہزادی بلا کی حسین اور نہایت نیک سیرت بھی ہیں۔ اراکین خاندان شاہی اودھ نیز باشندگان لکھنؤ اُن کی بہت تعظیم و توقیر کرتے ہیں۔ دربار شاہی کا رنگ بگڑا ہوا دیکھ کر اُنھوں نے شادی کے بعد ہی سے عزلت گزینی اختیار کی اور اب وثیقے تین سو یا چار سو روپیہ ماہوار کی قلیل رقم پر جو اُن کو شاہ اودھ سے ملتی ہے وہ گزارہ کر رہی ہیں۔"

ایک دوسرے مقام پر وہ موصوفہ کی نسبت حسب ذیل رقم طراز ہیں:۔

"وزیر اعظم کو ہمیشہ یہ ملحوظ خاطر رہتا تھا کہ بادشاہ سلامت کی محبوب ترین بیگم کو ترغیب و تحریص دے کر اپنا ہمنوا و ہمنوا بنائے رکھیں چونکہ بادشاہ کے محل

نواب سلطان بہو پر جو نہایت عظیم المرتبت اور والا دودمان شہزادی ہیں اثر جمانا اور اُن کو اپنی مٹھی میں کر کے ہمدردی حاصل کرنا محال تھا اس لیے اُن

کے لیے یہ صورت پیدا کی گئی کہ وہ قصر سلطانی کی سکونت ترک کرکے اپنے شوہر سے علیحدہ زندگی بسر کریں۔"

مرقومۂ بالا بیانات پڑھنے سے ظاہر ہوگا کہ گو مؤرخین میں بعض معاملات میں چند دیگر اختلافات ہیں مگر ان امور پر سب یک زبان ہیں کہ ملکہ کے ساتھ شرع ہی سے بہت نامناسب برتاؤ کیا گیا۔ نہ شمس دیگر محلات اُن کا بیش قرار وظیفہ مقرر ہوا نہ حسن سلوک سے اُن کی کبھی دلجوئی کی گئی بلکہ برعکس اس کے وہ زیر حراست رکھی گئیں۔ محل کے باہر جانے کی اُن کو مطلق اجازت نہ تھی اُن کے قدیم ملازمین کو جو اُن سے ہمدردی کرتے تھے برخاست کر دیا گیا تھا۔ اور کسی فرد بشر کی مجال نہ تھی جو اُن سے ملاقات کر سکے۔

بیچارگی اور بے بسی میں مرزا سلیمان شکوہ نے اُن کی شادی جو نصیر الدین حیدر کے ساتھ کر دی تھی اُس کا رنج کو دلی صدمہ تھا اور اپنی علو ہمتی سے ثابت کر دیا کہ باپ کی رضامندی جبر اور دباؤ سے حاصل کی جا سکتی ہے مگر بیٹی کی مرضی کسی قیمت پر بھی بس خریدی جا سکتی ہے۔ بعد میں اُن کو ایذائیں بھی پہونچائی گئیں۔ اُن کی سوتیلی بہن قمر چہرہ کو محل بنا فرکو کوشش کی گئی مگر اُنھوں نے سب باتیں صبر و سکون کے ساتھ برداشت کیں اور اور جس طرح دنیا میں آئی تھیں اسی طرح کورے پنڈے کے ساتھ دنیا سے سدھار گئیں

۱۸۳۷ء میں بعد انتقال شاہ نصیر الدین حیدر جب بادشاہ بیگم صاحبہ نے مرزا فریدوں بخت عرف منا جان کو خلاف منشاء گورنمنٹ محض اپنی حمایت اور زور دراز دری سے تخت اودھ پر بٹھانے کا تہیہ کیا تو راستہ میں حسن باغ سے نواب سلطان بہو کو بھی اپنی مہم کو قوت پہونچانے کے لیے ساتھ لے لیا تھا مگر جیسے ہی بیرونی چھپنے لگیں اُن کی دو خادمائیں اُن کی پالکی لال بارہ دری کی بغلی صحنچی میں جانب مشرق لے گئیں۔ اُن پ

سلہ ملکہ حسن باغ میں رہتی تھیں یہ باغ ۱۸۵۷ء میں اُجڑ گیا اور اس کی عمارت بھی منہدم کر دی گئی۔ میڈیکل کالج کا بورڈنگ ہاؤس (Hardinge bridge) پکے پُل کے (باقی ۱۹۳ پر)

بے ایک کا بازو چہروں سے بہت مجروح ہو چکا تھا مگر دوسری نے چند کپڑے باہم باندھ کر اُن کی مدد سے شہزادی صاحبہ اور زخمی خادمہ کو تخمیناً آٹھ گز کی بلندی سے نیچے صحن میں اُتار دیا جہاں سے اُن کے ملازمین اُن کو محل سرا واپس لے گئے اس طرح تینوں کی جانیں محفوظ رہیں۔ بارہ دری کے شمال رُخ دونوں نچانکوں میں سپاہی کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے اور سوائے اس طریقہ سے واپس آنے کے اور کسی طرح جان بری ناممکن تھی

سلیمن صاحب کے متذکرہ بالا بیان میں اور سید کمال الدین حیدر مصنف تاریخ اودھ کے اس موقع کے بیان میں قدرے اختلاف ہے۔ آخر الذکر اس واقعہ کے متعلق حسب ذیل تحریر کرتے ہیں:۔

"جب لال بارہ دری میں ہنگامہ کارزار گرم ہوا تو سلطان بہو بیگم صاحبہ گھبرا کر پینس سے باہر نکل پڑیں اور بارہ دری کے پردے سے مثل گیند کے نیچے چلی آئیں ایک شخص نے اپنی گودی میں اُتار لیا پھر پینس میں سوار ہوئیں بموجب حکم صاحب

بسلامت اپنی جائے قیام حسن باغ میں چلی آئیں۔"

۱۸۵۸ء میں بعہد مرزا ارجلیس قدر سلطان بہو لکھنؤ ہی میں مقیم تھیں اُسی زمانہ میں شہزادہ فیروز شاہ پسر مرزا ناظم بخت نواسہ حضرت فرخ سیر بادشاہ دہلی مع دو سو سوار پانسو تلنگہ بہمراہی جنرل بخت خاں داخل لکھنؤ ہو کر ملکہ موصوفہ کے مکان میں بسبب قرابت کے فرد کش ہوئے۔ سلطان بہو نے خوف زدہ ہو کر جناب عالیہ (والدہ برجلیس قدر) سے کہلا بھیجا کہ مجھ کو اتنا مقدور نہیں ہے کہ اُن کی خاطر خواہ تواضع کر سکوں۔ اُن کے قیام کے لیے دوسرا مکان تجویز ہونا چاہیے چنانچہ حسن باغ کے قریب ایک دوسرا مکان تجویز ہوا۔ شہزادہ اُس میں منتقل ہو گئے۔ حضرت محل والدۂ برجلیس قدر نے پانچ ہزار روپے

اُس جانب اسی باغ کی آراضی پر تعمیر ہوا ہے اور جا بجا قدیم عمارت کے کھنڈرات اب تک پائے جاتے ہیں۔

دعوت کے بھیجے۔ جب باغی فوج لکھنؤ سے بھاگ گئی۔ شہزادہ موصوف بھی سراسیمہ ہو کر برلی چلے گئے۔

مرزا سلیمان شکوہ نے اکبر آباد میں بتاریخ ۲۴ر فروری ۱۸۳۷ء فرشتۂ اجل کو لبیک کہا اُن کی لاش چھ ماہ تک وہیں رہی بعدہ بمقام سکندرہ اکبر کے مقبرہ میں دفن کی گئی اور اس پر سنگ مرمر کی قبر بنوادی گئی۔

بتاریخ ۲۰ر اکتوبر ۱۸۳۷ء شاہ نصیر الدین حیدر کو بھی زہر دے کر عین عالم شباب میں موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ اب اس ڈرامہ کی ہیروئن صرف سلطان بہو بیگم رہ گئیں۔ بعد ضبطی سلطنت اودھ عملداری سرکار میں۔ وہ بھی کربلائے معلےٰ چلی گئیں اور عراق میں چند سال قیام کرنے کے بعد موت نے اُن کو بھی اپنی آغوش میں لے لیا اور میٹھی نیند سُلا کر دُنیاوی بکھیڑوں سے ہمیشہ کے لیے آزاد کر دیا۔ اُن کا متروکہ نواب اقبال الدولہ پسر شمس الدولہ نواب احمد علی خاں برادر زادہ شاہ غازی الدین حیدر نے پایا جو قبل سے عراق میں مقیم تھے۔

نواب ملکہ زمانیہ

دولاری (آئندہ ملکہ زمانیہ) بنارس کے ایک کورٹی کی لڑکی تھی جس نے اپنے پڑوسی فتح مراد سے ساٹھ روپیہ کپڑا خریدنے کو قرض لیے مگر اس کے بعد ہی وہ اپنی زوجہ اور یکسالہ لڑکی دولاری کو چھوڑ کر تیر اجل کا نشانہ ہو گیا۔ اس پر فتح مراد نے بالعوض زر قرضہ دونوں ماں بیٹیوں کو اپنی حراست میں کر لیا۔ لیکن بعد میں لڑکی کی ماں اس امر پر

Biographical Sketches by T.W. Beale [1]

رضامند ہوگئی کہ مطالبہ میں لڑکی کو لے کر حساب بے باق کر لیا جائے۔ اس صورت سے دولاری کی ماں کی گلو خلاصی ہوگئی۔

جب دولاری فتح مراد کو مل گئی تو اُن کی ہمشیرہ کرامت النساء اُس کو اپنی لڑکی بناکر پرورش کرنے لگیں۔ اب اس کا نام حسینی رکھا گیا مگر اُس کے مزاج میں ضد اور ہٹ بہت تھی جب وہ سنّ شعور کو پہونچی تو یہ معلوم کر کے کہ وہ رستم خاں کی محبت میں گرفتار ہے جو اُن کے بھائی فتح مراد کی زوجہ ثانیہ جمیل النساء کے شوہر اوّل مرزا بقا بیگ سے پیدا تھا اُنھوں نے زور دے کر اُس کی شادی رستم خاں ہی سے کر دی۔ شجرہ خاندان فتح مراد حسب ذیل ہے۔
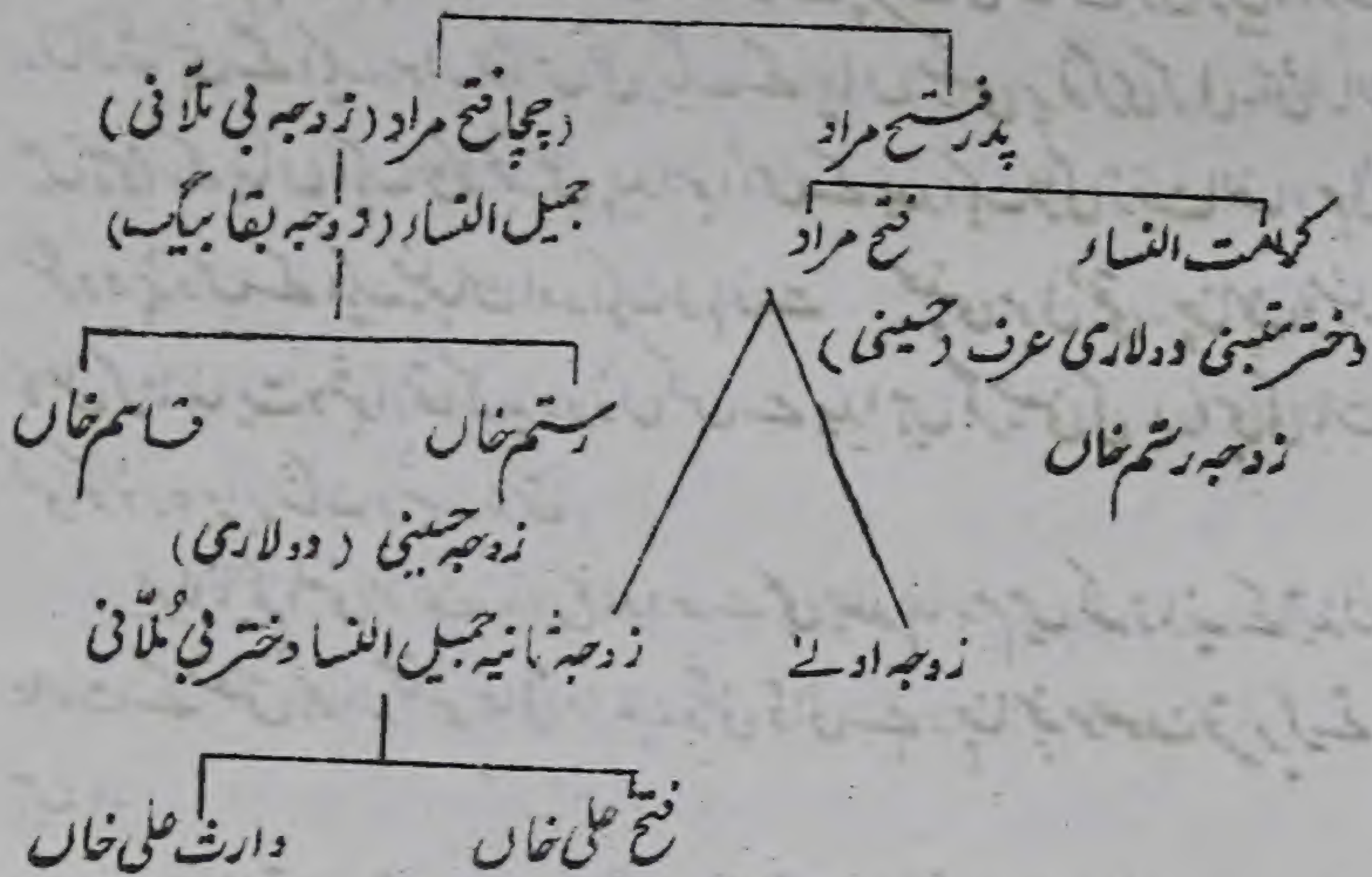
جمیل النساء ملّانی کی بیٹی فتح مراد کی چچا زاد بہن تھیں۔ اُن کا پہلا عقد بقا بیگ سے ہوا تھا جن سے دو لڑکے رستم خاں اور قاسم خاں پیدا ہوئے تھے۔ بقا بیگ قوم کے مغل اور بنارس کے قدیم باشندے تھے وہ تلاش روزگار میں جو مکان سے نکلے تو پھر کچھ پتہ نہ چلا کہ اُن کا کیا حشر ہوا۔ اُن کی گمشدگی کے بعد جمیل النساء کا عقد ثانی فتح مراد

کے ساتھ ہو گیا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد فتح مراد بھی دنیا سے کوچ کر گئے اور اُن کی پہلی بیوی نے اپنی سوت جمیل النساء کو مع فتح علی خاں و وارث علی خاں پسران فتح مراد اور رستم خاں اور اُن کی بیوی حسینی (وہ لاری) کو لڑ کر گھر سے نکال دیا۔ چنانچہ یہ مصیبت کا مارا قافلہ بنارس سے بی ملّانی کے پاس رستم نگر میں پہونچا۔ موصوفہ زیورِ علم و ہنر سے آراستہ تھیں اور نواب محبت خاں ابن حافظ رحمت خاں والی روہیلکھنڈ کے یہاں والی لڑکیوں کو کلام پاک پڑھانے کے لیے دس روپیہ ماہوار وخوراک پر ملازم تھیں بی ملّانی نے یہ خیال کر کے کہ حسینی نے اپنے شوہر کے ساتھ پورے طور سے وفا نہیں کی ہے۔ اُس کے نواب موصوف کے مکان پر قیام کرنے میں تامل کیا اور یہ قافلہ ایک فیلبان کے یہاں مقیم ہوا مگر بی مُلّانی ان لوگوں کے کھانے کپڑے کی کفالت کرتی رہیں۔ رستم نے رسالہ شاہی کے ایک سوار عباس قلی بیگ کے یہاں سئیسی پر نوکری کر لی۔ اسی دوران میں حسینی کے یہاں ایک لڑکا محمد علی پیدا ہوا اُس کے بعد ایک لڑکی زینت النساء ہوئی مگر وہ پڑوس کے ایک فیلبان اور ایک لوہار سے پھنسی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس مسئلہ کا حل کرنا نہایت دشوار تھا کہ یہ دونوں کس سے پیدا ہیں مگر حسینی کی بدراہی کی بابت کسی کو ذرہ برابر شک و شبہہ نہ تھا۔

مولانا نجم الغنی مؤلف تاریخ اودھ نے بھی جلد چہارم میں ملکہ زمانیہ کے ابتدائی حالات کے متعلق بحوالہ محتشم خانی مزید روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ موصوف تحریر کرتے ہیں:۔

اس کا نام حسینی تھا۔ وہ ایک پٹھان کے نکاح میں تھی جو بنارس کا رہنے والا تھا اس کے دو ماموں زاد بھائی وارث علی خاں اور فتح علی خاں دہلی کے باشندے تھے مگر بنارس میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ شہزادہ مرزا جواں بخت کے استاد شاہ عالم بادشاہ کے عہد کے منصب داروں میں سے تھے۔ حسینی خانم نے اُن کے گھر میں روٹی کپڑے

پر ایک مدت تک بنارس میں اوقات بسر کی۔ جب یہ شخص بھی صدمات بے معاشی میں مبتلا ہوا تو حسینی تباہی کی حالت میں لکھنؤ چلی آئی اور ایک فیل بان کے گھر میں جو اُس سے محبت کرتا تھا رہنے لگی۔ اس عورت کا ایک لڑکا جس کا نام محمد علی عرف زینب تھا اور ایک لڑکی فیلبان کے نطفہ سے پیدا ہوئی۔

محمد علی کی عمر تین سال کی اور زینت النساء کی اندازاً ڈیڑھ سال کی ہوگی کہ مرزا نصیر الدین حیدر ولی عہد سلطنت کے یہاں سکھ چین خواص مخاطب بہ افضل سے بتاریخ ۱۴ ستمبر ۱۸۲۰ء بوقت سہ پہر فریدون بخت رفیع الدین احید ر محمد مہدی عرف مناجان پیدا ہوئے جن کے لیے ایک دودھ پلانے والی انا کی ضرورت ہوئی اور بڑی جرأت انا کی تلاش میں رستم نگر بھی آئے۔ بی ملا ذی نے جن کے حسن و فضل کا شہرہ خاندان شاہی تک پہنچ چکا تھا حسینی کو بھیج دیا۔ بادشاہ بیگم نصیر الدین حیدر کی سوتیلی ماں کو حسینی کی صورت شکل بہت پسند آئی اور اطبا و شاہی نے اس کا دودھ بھی اعلیٰ درجہ کا پایا چنانچہ بی حسینی مناجان کو دودھ پلانے پر مقرر ہوگئیں۔ اس وقت نصیر الدین حیدر کی اٹھتی جوانی تھی اِدھر حسینی پر بھی شباب کا عالم تھا۔ انا جی کو دیکھتے ہی موصوف دل ہاتھ سے کھو بیٹھے۔ بھوک پیاس اُڑ گئی۔ نواب معتمد الدولہ آغا میر نے دلی راز سے آگاہ ہو کر دو بڑی خواصوں کے ہمراہ بی حسینی کو نصیر الدین حیدر کے ہمراہ حسن باغ بھیج دیا۔ یہاں سرگرم عیش و نشاط ہوئے۔ تھوڑا بہت زیور لباس عنایت کیا آئندہ کے لیے وعدے وعید بھی کیے مگر حسینی کی آتش محبت موصوف کے دل میں برابر سلگتی رہی۔ آخر کار پانچ چھ برس کے بعد اس کا شعلہ دفعتاً بھڑک اٹھا اور انھوں نے والدین کو عاجز و پریشان کر کے اجازت حاصل کر لی اور ۱۸۲۶ء میں بی حسینی سے نکاح کر کے اُن کو شہزادہ محل خطاب دیا۔ پھر ۲۰ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو جب اُن کے والد حضرت غازی الدین خلد مکان ہو گئے اور موصوف تخت سلطنت پر جلوہ گر ہوئے تو شہزادہ محل بی حسینی خانم

کہ بموجب عہد و پیمان زمانۂ ولی عہدی "ملکہ زمانیہ" کا محمد علی کو "کیواں جاہ" کا اور زینت النساء کو "نواب سلطان عالیہ" کا خطاب عنایت فرمایا۔ ملکہ زمانیہ کا بڑا زمانہ ہوا۔ کیواں جاہ اور سلطان عالیہ دونوں بادشاہ کے بیٹے اور بیٹی مشہور ہوئے۔ یکم مارچ ۱۸۲۹ء کو بادشاہ نے باسٹھ لاکھ چالیس ہزار روپیہ بہ تقرر سود پانچ روپیہ فی صد سالانہ بطور قرض موبد کمپنی کے حوالہ کیے جس کے سود سے دس ہزار روپیہ ماہوار کا وثیقہ ملکہ زمانیہ کا اور چار ہزار روپیہ کا نواب سلطان عالیہ کا جاری ہوا۔ وثیقہ کے علاوہ ملکہ زمانیہ کو علاقہ ٹانڈہ بھی جاگیر میں دیا گیا جس کی آمدنی چھ لاکھ روپیہ سالانہ تھی۔

فتح علی خاں اور وارث علی خاں پسران فتح مراد بنارس سے پریشان ہو کر لکھنؤ آئے۔ دونوں ملکہ زمانیہ کے بھائی مشہور ہوئے۔ موصوفہ نے بادشاہ کے یہ ذہن نشین کیا کہ یہ لوگ بڑے خاندانی ہیں مگر گردش زمانہ سے افلاس و ناداری کے دلدل میں پھنس کر اس تبدل حالت کو پہونچ گئے ہیں چنانچہ انھوں نے دونوں کو خلعت دے کر ملکہ زمانیہ کی جاگیر کا ناظم مقرر کر دیا۔ نظامت پر پہونچ کر دونوں نے امیرانہ ٹھاٹھ دکھائے۔ خوب گلچھرے اڑائے۔ سو سو طائفے نابرو حور پیکر طوائفوں کے حاضر در بار رہتے تھے اور بادۂ گلگوں کے بھی جام پر جام اڑائے جاتے تھے۔ ان کا دسترخوان شاہی دسترخوان کی طرح چناجاتا تھا۔ زرّیں قبا اور دوشالہ پوش رفقاء کھلتے پر ... ہوتے تھے۔ جب ہوادار پر سوار ہو کر سیر کو نکلتے تھے تو سیکڑوں رقاصاں پری پیکر حلقہ میں گھیرے ہوتی تھیں اور رفیقوں کا جمگھٹ پہلو بہ پہلو رہتا تھا چار برس تک دونوں ناظم رہے۔ زر تحصیل کا لاکھوں روپیہ اپنے عیش و عشرت میں صرف کیا ... نہ اٹھا کر سرکار میں بھی نہ بھیج دیا۔ رستم خاں کے سگے بھائی قاسم خاں داروغہ

۔ تاریخ اودھ جلد چہارم

ڈیوڑھی ہوئے۔ اُن کی تنخواہ پانچ سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئی۔ فتح مراد کی بہن کرامت النسا جنھوں نے شروع میں ملکہ زمانیہ کو بطور لڑکی کے پرورش کیا تھا شریکِ دولت ہو کر محل میں داخل ہوئیں مگر جب بدنصیب رستم نے دربار تک رسائی کی کوشش کی تو اُس کو گرفتار کر کے ضلع بانگر کے قلعہ میں بند کر دیا گیا۔ اور نصیر الدین حیدر کے انتقال تک وہیں محبوس رہا اُن کی رحلت پر لکھنؤ آیا۔ مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد لقمۂ اجل ہو گیا۔ ماما پیاری فیلبانی جس نے نواب سلطان عالیہ بیگم کو بحالت شیر خوارگی پرورش کیا تھا وہ خاص محلدار ہوئی اُس کا بھی بڑا عروج ہوا۔ منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں وزیر اعظم نے چاہا کہ ملکہ زمانیہ کو بادشاہ کی نظروں سے گرادیں چنانچہ اولاً اُنھوں نے یہ تدبیر کی کہ اُن کی جاگیر میں فساد کرایا اور خبریں متواتر بادشاہ کے گوش گزار کرائیں اور خود بھی عرض کیا کہ بیگم صاحبہ کی جاگیر میں بہ سبب بدانتظامی اردگرد کے تمام علاقہ میں بدامنی ہو گئی ہے۔ روپیہ کا وصول ہونا ممکن ہو گیا ہے۔ اگر یہ علاقہ راجہ بختاور سنگھ کو جن کی عمل داری بیگم صاحبہ کی جاگیر کے چاروں طرف ہے دے دیجائے تو راجہ مذکور بیگم صاحبہ کو روپیہ پہونچاتے رہیں گے اور انتظام بھی درست ہو جائے گا تجویز معقول تھی بادشاہ نے منظور کر لی اور کل جاگیر راجہ کے حوالہ کر دی۔ جاگیر کی آمدنی زر گزارہ ہو کر یہی درماہہ قرار پایا۔

ایک روز بادشاہ کے حسب الارشاد اُن کے سب اقربائے قریبہ ملکہ زمانیہ کو نذر دینے آئے سبھوں نے چار و ناچار نذر پیش کی مگر جب اُن کے چچا نواب محمد علی خاں نصیر الدولہ کی باری آئی تو اُن کی آنکھوں سے مسلسل اشک جاری ہو گئے۔ قدرتِ خدا کو دیکھتے تھے پھر جب بادشاہ ہوئے تو ملکہ زمانیہ کو بہ سبب اس کے کہ اُن کے پوتے نواب ممتاز الدولہ کو ملکہ زمانیہ کی بیٹی نواب سلطان عالیہ بیگم منسوب ہوئی تھیں اپنی سمدھن سمجھ کر متواتر

لے

بُلوایا مگر وہ اُن کے دلی راز سے واقف ہو چکی تھیں وہ بھی کبھی نہ گئیں۔ ہمیشہ عذر علالت کہلا بھیجا۔

نصیر الدین حیدر کے تاجدار اودھ ہونے کے بعد ملکہ زمانیہ کا بڑا دور دورہ ہوا وہ خزانہ جو فیض آباد سے بہو بیگم صاحب کا ضبط ہو کر آیا تھا اور تیس لاکھ روپے (سکہ بنگالہ) جو اب تک کوٹھے میں رکھے ہوئے تھے یہ کل رقم اُن کی تحویل میں داخل ہوئی۔ اس کے علاوہ وہ کئی لاکھ روپیہ بھی موصوفہ کو مرحمت ہوا جو تاج الدین حسین خاں نے اپنے عہد نظامت میں غلام حسین چکلہ دار سلطان پور کے متروکہ میں سے ضبط کر کے شاہ غازی الدین حیدر کے عہد دولت میں بھیجا تھا۔ اُس کے ماسوا روزمرہ مالا ہائے مروارید اور طرح طرح کے بیش بہا جواہرات سے لبریز کشتیاں اور اشرفیوں کی تھیلیاں ہاتھیوں پر لدی ہوئی اُن کے خزانہ میں داخل ہوتی تھیں

ایک روز بادشاہ ملکہ زمانیہ کے محل میں تشریف لائے ایک رقعہ ہاتھ میں تھا ملکہ زمانیہ نے پوچھا مرزا ہاتھ میں کیا ہے۔ فرمایا پچاسی لاکھ روپیہ فیض آباد سے آیا ہے۔ انھوں نے کہا مجھے دے دو۔ یہ سنتے ہی رقعہ ہاتھ سے پھینک دیا۔ گویا بڑا بوجھ تھا۔

ملکہ زمانیہ کے بادشاہ سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اس امر کا اُن کو بیحد قلق تھا اسی آرزو میں ہر نوچندی جمعرات کو حضرت عباس کی درگاہ نہایت تزک احتشام سے جاتی تھیں اور دس ہزار روپیہ نذر و نیاز و انعام جلوس میں صرف کرتی تھیں اُن کی سواری اس کر و فر سے نکلتی تھی کہ دو سو ہاتھی نقرئی اور طلائی حوضوں اور کارچوبی جھولوں سے آراستہ جلوس میں ہوتے تھے۔ اور دو بُرجی رتھوں میں بہت سی مغلانیاں اور خواصیں ہوتیں۔ طلائی مرصع پنکھے جن میں بادلے کی کرن چو طرفہ ٹکی ہوتی۔ مہریاں ہاتھوں میں

---

۱ تاریخ اودھ جلد چہارم ۲ فسانہ عبرت ۳ قیصر التواریخ جلد اول۔

۴ تاریخ اودھ مولانا نجم الغنی جلد چہارم۔

لیے ہوتیں۔ خواصی کے آدمی سورج مکھی اور چتر لگائے ہوتے۔ سیم وزر میں غرق پالکیاں نالکیاں ساتھ ہوتیں ایک گنگا جمنی خوشنما سکھ پال میں جس پہ زر بفت کا چھتکا ہوتا اس میں ملکہ زمانیہ ہوتی تھیں۔ خواجہ سراؤں اور شاگرد پیشہ لوگوں کے ہجوم سے سواری کے آس پاس کسی کا گزر نہ ہوتا تھا۔ غرض کہ جو کچھ لوازمہ سلطنت تھا وہ سب ملکہ زمانیہ کے محل میں موجود تھا۔ صرف اُن کے باورچیخانہ کا خرچ تین سو روپیہ یومیہ تھا باوجود اس جاہ وحشم کے حکیم مہدی بادشاہ سے عرض کیا کرتے کہ حضور ایک ادنیٰ عورت کے ساتھ یہ گرمجوشیاں اور اُس کو اس مرتبہ عظیم پر پہنچانا کسی طرح زیب نہیں دیتا چنانچہ حکیم صاحب کی شعلہ زبانی نے ملکہ زمانیہ کی آتش محبت کو بادشاہ کے دل سے سرد کردیا اور گو اس سے ملکہ زمانیہ کا وقار کم ہوگیا مگر وہ خزانہ جو قاروں کے خزانہ سے زیادہ تھا وہ بدستور اُن کے قبضہ میں رہا۔

ایک روز حکیم مہدی علی خاں منتظم الدولہ نے دیکھا کہ کیواں جاہ خلعت جرنیلی سے سرفراز ہوکر کاغذات سپاہ پر دستخط کر رہے ہیں اُس پر اُنھوں نے نہایت آزردہ ہوکر کاغذ اُن کے ہاتھ سے لے کر بآواز بلند کہا کہ اس دایہ بچہ کو امور سلطنت سے کیا واسطہ بادشاہ حکیم مہدی کی اس زبان آوری سے بہت ناخوش ہوئے۔

نواب محمد علی خاں کیواں جاہ کی شادی نواب رکن الدولہ محمد حسن خاں پسر[1] نواب سعادت علی خاں کی بیٹی سے ہوئی۔ نواب رکن الدولہ کی شادی نواب عباس علی خاں کی بیٹی سے ہوئی تھی مگر اُن سے موافقت نہ ہوئی نہ کوئی اولاد پیدا ہوئی رکن الدولہ کے دو بیٹے شمس الدولہ اور آفتاب الدولہ دوسرے محل سے تھے اور جو لڑکی کیواں جاہ کو منسوب ہوئی وہ کسی دوسری مسماۃ سے تھی۔

کیواں جاہ کے صرف ایک بیٹے والا قدر نواب وزیر مرزا تھے جو چھتی کوٹھی

---

[1] قیصر التواریخ

میں سکونت پزیر ہونے کی وجہ سے چوکھی والے نواب مشہور ہوگئے تھے۔ گر وہ دختر رکن الدولہ سے نہ تھے بلکہ کسی دوسری عورت سے تھے

تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوکر پہلے شاہ نصیر الدین حیدر نے کیواں جاہ کو جرنیل فوج بنا دیا۔ اور محمد علی خاں اقبال الدولہ کو اُن کی نیابت پر مامور کیا بعدہٗ ملکہ زمانیہ کے زور دینے پر اُنھوں نے کیواں جاہ کو اپنا ولی عہد قرار دیا اور اُن کی اور سلطان عالیہ اُن کی ہمشیرہ کی شادی میں تیس لاکھ روپے صرف کیے۔ علاوہ بریں نومبر و دسمبر ۱۸۲۷ء میں بادشاہ نے کئی بار ریذیڈنٹ کو یہ بھی باور کرایا کہ کیواں جاہ میرے پورے بیٹے ہیں اگر یہ واقعہ صحیح نہ ہوتا تو میرے چچا رکن الدولہ اپنی بیٹی کی شادی اُن کے ساتھ کرنے کو کیوں رضامند ہوجاتے اور میں خود اُن کی شادی میں بیس لاکھ روپے کیوں صرف کرتا موصوف نے اس پر بھی بس نہ کی بلکہ گورنر جنرل کو یقین دلانے کے لیے کہ کیواں جاہ میرے بیٹے اور ولی عہد ہیں اُن کو لکھنؤ سے کان پور روانہ کیا کہ لارڈ کومبر میر (Lord Combermere) کا استقبال کر کے اُن کو لکھنؤ لے آئیں۔ چنانچہ سید[۲] کمال الدین حیدر ناقل ہیں

> حسب خبر آمد آمد لارڈ کومبر میر کمانڈر انچیف ہوئی۔ شاہ عالم پناہ نے حسب دستور قدیم مرزا کیواں جاہ اپنے ولی عہد کو بہت عظمت و شان سے مع ارکین دولت برائے استقبال روانہ کیا اور وزیر اعظم نواب معتمد الدولہ کو بھی اُن کے ساتھ کیا چنانچہ حسب دستور رحمت گنج تک تشریف فرما ہوئے۔ لارڈ صاحب نے اُن سے ایسی عزت و توقیر سے ملاقات کی جیسا کہ ولی عہد کے شایان شان ہوتا ہے اگرچہ صلب بادشاہ سے نہیں ہیں۔"

---

[۱] قیصر التواریخ جلد اول   [۲] Sleeman's Journey through Oudh)

نوٹ:۔ قیصر باغ کے جنوبی پھاٹک سے لال باغ کی طرف سے جاتے ہوئے یہ وقایع دلپذیر پر

۱۸۳۲ء میں بادشاہ نواب قدسیہ محل پر فریفتہ تھے اسی زمانہ میں موصوفہ کے حاملہ ہونے کی خبر مشہور ہوئی بادشاہ انھیں کے فرزند کو اپنا جانشین کرنا چاہتے تھے چنانچہ یکم فروری سنہ مذکور کو انھوں نے گورنمنٹ کو لکھ بھیجا کہ کیواں جاہ میرے نطفہ سے نہیں ہیں۔ یہ ما نے ملکہ زمانیہ کے زیر اثر ایسا بیان کر دیا تھا اور انھیں اپنی ولی عہدی سے خارج کر دیا اس طور پر کیواں جاہ کی چاردن کی چاندنی ختم ہو گئی۔

کیواں جاہ نے ملکہ زمانیہ کی حیات ہی میں بتاریخ ۱۶ رمئی ۱۸۴۳ء مرض ہیضہ سے عین جوانی میں انتقال کیا اور کربلائی میر خدا بخش کے احاطہ میں داخلہ کے صدر پھاٹک کے سامنے دفن ہوئے۔ کیواں جاہ کے فرزند نواب وزیر مرزا نے آغاز بلوغ میں محلہ بھدیواں میں قیام کر کے بہت کچھ سامان امارت فراہم کیا۔ بعد ازاں کوٹھی معشوق منزل بقیمت چالیس ہزار روپیہ خرید کر اس میں منتقل ہو گئے اور کچھ جدید عمارتیں بھی کوٹھی کے قریب بنوائیں۔ نواب وزیر مرزا نے سیر چشمی خوش اخلاقی و وضعداری سے زندگی بسر کی۔ ان کا خطاب نواب والا قدر تھا ان کو شعر و سخن سے بھی ذوق تھا اور بھاکا زبان کے ماہر تھے۔ اکثر ٹھمریاں کہا کرتے تھے قدر تخلص تھا۔

ٹھمریوں میں قدر پیا تخلص کرتے تھے۔ غدر کے بعد انتقال کیا بہت کثیر الاولاد تھے میونسپل بورڈ لکھنؤ نے چھوٹی کوٹھی کے قریب ایک سڑک کا نام نواب والا قدر روڈ انھیں کی یادگار میں رکھا ہے۔ اُن کے خاندان کے لوگ لکھنؤ میں موجود ہیں۔ نواب سلطان عالیہ بیگم

---

۵ Sleemen's Journey Through Oudh

نوٹ:۔ قیصر باغ کے جنوبی پھاٹک سے لال باغ کی طرف جاتے ہوئے یہ عالی شان دو منزلی کوٹھی بائیں جانب واقع ہے اس کو عظیم اللہ خاں حجام مخاطب بہ اعظم الدولہ مصاحب و داروغہ حضرت محمد علی شاہ بادشاہ نے بنوایا تھا۔ واجد علی شاہ کو یہ کوٹھی بہت پسند تھی اور چونکہ وہ قیصر باغ سے بالکل ملی ہوئی تھی اس لیے انھوں نے چار لاکھ روپیہ کو خرید کر (بقیہ ۱۱۶ پر)

کی شادی فریدوں مرتبت ممتاز الدولہ حسین علی خاں بہادر تہور جنگ مبارز الملک ابن نواب ناصر الدولہ اصغر علی خاں سے ہوئی۔ عنایت باغ (مکان محمد آفرین علی خاں خواجہ سرا نواب ناظر) سکونت کے لیے بادشاہ نے عنایت کیا۔ یہ دونوں شادیاں شاہ نصیر الدین حیدر کی زور ازوری سے ہوئیں۔ ناصر الدولہ محمد علی شاہ بادشاہ کے فرزند اکبر تھے۔ مگر موصوف خاص محل سے نہ تھے۔ بلکہ بادشاہ خانم کے بطن سے تھے۔ ناصر الدولہ کی شادی بزمانہ فرماں روائی نواب سعادت علی خاں اہتمام الدولہ مظفر علی خاں کی بڑی بیٹی کے ساتھ بہت تکلف سے ہوئی تھی۔ ممتاز الدولہ انھیں سے پیدا تھے۔

ناصر الدولہ نے اپنے والد کی حیات ہی میں تپ محرقہ سے انتقال کیا ورنہ محمد علی شاہ کے بعد وہی اودھ کے بادشاہ ہوتے چنانچہ قانون اودھ کے مطابق ممتاز الدولہ محجوب الارث ہو گئے اور محمد علی شاہ کے دوسرے بیٹے امجد علی شاہ تاجدار اودھ ہوئے۔

سلطان عالیہ کی بدمزاجی غرور و تمکنت اور دیگر ناگفتہ بہ واقعات سے ممتاز الدولہ جیسے نیک دل اور ملائم شخص کی جان بھی ضیق میں رہتی تھی۔ موصوف کے سلطان عالیہ سے دو اولادیں ہوئیں۔ ایک بیٹا نواب ذکی علی خاں مخاطب بہ سعید الدولہ اور ایک بیٹی عفت آرا بیگم عرف تگن صاحبہ۔ نواب سعید الدولہ نے شاہی اسپتال واقع دکٹوریہ اسٹریٹ کے سامنے عالی شان کربلا تعمیر کرائی۔ ان کی پہلی شادی پرنس خرم بخت مرزا یحییٰ علی خاں خلف محمد علی شاہ کی بیٹی سے ہوئی مگر انھوں نے لاولد انتقال کیا۔ اس کے بعد موصوف نے دوسری شادی اپنی مرضی اور پسند سے بی عزیزن کے ساتھ کر کے انھیں ممتاز محل کے خطاب سے ممتاز کیا ان سے نواب کے یہاں ایک بیٹی عصمت آرا بیگم عرف پتن صاحبہ پیدا ہوئیں۔ جن کا تعزیہ جنم حضرت امام حسین علیہ السلام بڑی دھوم دھام اور صرف کثیر سے اٹھا کر تالکٹورہ ۳۲ع

(بقیہ حاشیہ) اس کا نام معشوق منزل رکھا مگر عوام میں وہ کوٹھی کوٹھی مشہور ہوئی بعد غدر جب نیلام کی گئی تو ایک شاہ جی کے نام بارہ ہزار کو چڑھی۔ ان سے نواب وزیر مرزا نے چالیس ہزار کو خریدا

سے اُٹھنا موقوف ہو گیا۔ نجمن صاحبہ کی شادی نواب قمر الدین حیدر عرف چھوٹے صاحب عالم خلف نواب مصطفیٰ علی خاں برادر منظم شاہ اودھ واجد علی شاہ سے ہوئی تھی۔ بگم موصوفہ نے عین شباب میں انتقال کیا۔

ملکہ زمانیہ کی سیرت کی بابتہ سید کمال الدین حیدر رقم طراز ہیں:۔

"نواب ملکہ زمانیہ نے اپنی جود و ہمت سے سب کو نہال کر دیا۔ اُن کی سیر چشمی و خوش نیتی سب بگیات پر فوق لے گئی اور سوانح عمری مرزا محمد کاظم میں بھی مرقوم ہے" او (ملکہ زمانیہ) سرکار عظیم الشان داشت۔ ہزار ہا مردم ملازم او بودند و فیض از او بہ خلق خدا جاری می بود۔"

ملکہ زمانیہ نے ایک نہایت وسیع وعالی شان امام باڑہ جس کی مینت کاری اور رنگ آمیزی نہایت خوشنما و دل کش تھی بمقام گولہ گنج باہتمام محمد احسن خاں ۱۲۵۶ھ / ۱۸۴۰ء میں تعمیر کرایا۔ جس کے لق و دق صحن میں ایک نہر بھی تھی۔ امام باڑہ کی انہیں میں جانب غرب ایک مسجد بھی انھیں کی بنوائی ہوئی موجود ہے۔ اب پوری عمارت مع مسجد نہایت بوسیدہ حالت میں ہے غروب رویہ دوکانات متعلق امام باڑہ منہدم ہو چکی ہیں۔ مسجد کے کچھ حصے بھی منہدم ہو گئے ہیں۔ امام باڑہ مع آراضی فروخت ہو چکا ہے۔ تاریخ تعمیر امام باڑہ درج ذیل ہے۔

جناب ثانی مریم معظمہ ملکہ	کہ در زبان ندارد نظیر خوش صلا
امام باڑہ بنا کرد بے بدل بے مثل	عیاں برائے زمیں شد بنا عرش علیٰ
بہ اہتمام جناب محمد احسن خاں	بطرز نو شدہ تیار ایں خجستہ بنا
بنا خلد بگویم اگر روا باشد	چرا کہ ہست مزار امام راہنما
امام آں کہ فدا سر نمود بر اُمت	قتیل تیغ جفا و ذبیح راہ خدا
گلیم فکر رسا گفت سال تاریخش	امام باڑۂ بے مثل سید الشہدا

۱۲۵۶ھ

۳۰ اکتوبر ۱۸۴۵ء کو موصوفہ کا راج سہاگ لٹ گیا۔ اُن کے شوہر کے بدخواہوں نے

زہر دے کر اُن کی شمع حیات گل کر دی شوہر کے انتقال کے بعد چھ برس تک وہ اور زندہ رہیں۔ ۲۲ دسمبر ۱۸۴۳ء کو بزمانۂ شہریاری حضرت امجد علی شاہ رہ خلد اسکے گھر سدھاریں اور اپنے ہی امام باڑہ میں خاک کے بستر پر موت کی میٹھی نیند سو رہی ہیں۔ اب نہ قبر پر شمع روشن ہوتی ہے نہ پھولوں کی چادر ڈالی جاتی ہے۔ نہ کوئی فاتحہ کو آتا ہے۔ امام باڑہ کی ظاہری شان و شوکت بھی باقی نہیں رہی چوڑیاں بھی بوجہ بوسیدگی تیغہ کر دی گئی ہیں۔ البتہ جو کچھ ہاتھ اُٹھا کر راہِ خدا میں دے دیا تھا وہی اب کام آتا ہوگا۔

تاج محل

بھچو ملوائن متوطن حسن پور بند هوا و مقیم شہر لکھنؤ دولتِ حُسن سے مالامال تھی اُس کی ایک لڑکی حسینی نامی تھی۔ وہ بھی ناچ گانے میں طاق اور حسن و جمال میں شہرۂ آفاق تھی۔ شادی بیاہ کے جلسوں میں مجرا کرنے بھی جایا کرتی تھی۔ ایک عالم اُس کے شمع رُخ کا پروانہ ہو رہا تھا نصیر الدّین شاہ اودھ بھی اس قتالۂ عالم کے حُسن کرشمہ ساز اور غمزۂ شرابرد کے گھائل ہو گئے، اور داخل محل کر کے "خورشید محل" خطاب عطا کیا اس کے بعد ایک روز بادشاہ نے بندا گا اپنا تاج خورشید محل کو پہنا دیا اور نواب تاج محل خطاب دے کر ممتاز و سربلند فرمایا۔

کچھ دنوں کے بعد مرزا حسین اللہ بیگ جو سواروں میں نوکر تھے تاج محل کے باپ مشہور ہوئے۔ بیگم کی ماں کی سفارش سے نواب گنج چھ لاکھ روپیہ سال کی اُن کو جاگیر عطا ہوئی۔ داروغہ ڈیوڑھی ہوئے۔ اُن کی نئی امارت سپاہ گری کے ساتھ ہوئی۔

نصیر الدین حیدر بتاریخ ۱۸ اکتوبر ۱۸۲۷ء اورنگ سلطنت پر جلوہ گر ہوئے۔ تخت نشینی سے ایک سال کے اندر ہی اُن کا عقد تاج محل کے ساتھ ہوا۔ اور بتاریخ یکم مارچ ۱۸۲۹ء انھوں نے باسٹھ لاکھ چالیس ہزار روپیہ سکہ چلن بہ تقرر سود پانچ روپیہ فیصد سالانہ گورنمنٹ انگریزی کو بطور قرض دوام دے دیئے جس کے معاوضہ میں حسب منشاء تاجدار اودھ گورنمنٹ انگلیسیہ منجملہ دیگر بیگمات تاج محل کو مبلغ چھ ہزار روپیہ ماہوار بطور وثیقہ ادا کرنے کی پابند ہوئی۔ نیز یہ طے پایا کہ یہ وثیقے دوامی طور پر بیگمات نامزد شدہ اور اور اُن کے بعد اُن کے ورثا کو ملتے رہیں گے اگر کوئی محل لاوارث ہو تو اُس کو اختیار ہو گا کہ جس کسی کو اور حسب غرض اور مقصد کے لیے منظور ہو وصیت کر دے۔ مگر برٹش گورنمنٹ نے

یہ اختیار اپنے ہاتھ میں رکھا کہ وہ جب مناسب خیال کرے کسی وارث کو وہ کل رقم ادا کر کے جس کے سود سے اُس کو وثیقہ ملتا ہے وثیقہ دینا موقوف کر دے۔

۱۸ اکتوبر ۱۸۲۹ء کو شاہ نصیرالدین حیدر نے اپنی تاجپوشی کا سالانہ جشن بڑے کر و فر اور دھوم دھام سے منایا۔ اس موقع پر ایک معزز انگریز خاتون کو بھی دولت سرائے سلطانی میں باریابی کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔ انھوں نے اپنی ایک سہیلی کو اپنے مکتوب میں بیگمات شاہی کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے:

"شاہ حال نصیرالدین حیدر کی بیگمات نہایت نفیس شاہانہ لباس زیب تن کیے تھیں اور ان باہر دار لگل زمانہ حسینوں کی مانند معلوم ہوتی تھیں جن کا تذکرہ الف لیلےٰ میں آیا ہے۔

اُن کی ایک بیگم تاج محل اتنی حسین و جمیل اور گلعذار ہیں کہ انھیں دیکھ کر میرا طائر خیال اُس خالدار رخ کی طرف منتقل ہو گیا گویا وہ اپنی پوشاک عروسی میں ملبوس زرق برق جوہنی کی دلہن کی طرح بنی ٹھنی بیٹھی ہے۔ گوری اور سانولی عورتوں میں اتنی پیاری اور موہنی شکل اور سراپا نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی میری نظر سے کبھی نہیں گزری وہ نک سک سے بالکل درست تھیں اور ایسی نرگسی آنکھیں اور رخسار ایسے چشم فلک نے بھی کبھی نہ دیکھے ہوں گے۔ اُن کی شادی کو صرف ایک یا دو برس گزرے ہوں گے اور ابھی اُنھوں نے صرف چودہویں سال میں قدم رکھا ہوگا۔ گو شباب ان پر پھٹا پڑتا ہے۔ قد بھی اُن کا نہایت موزوں ہوتا ہے۔ ہاتھ پاؤں چھریرے اور خوشنما ہیں۔ چہرے پر حد درجہ کا بھولا پن ہے۔ غرضکہ اُن کا سراپا ایسا پاکیزہ اور دل کش ہے کہ اگر تم صرف ایک نظر دیکھ لیتیں تو اُن کے بادۂ حسن سے مدہوش ہو جاتیں۔

اُن کی پوشاک گہرے سُرخ رنگ کے زربفت کی تھی اور بالوں میں حقیقتاً

موتی پڑے ہوئے تھے جن کی لمبی لمبی لڑیاں جن کے سروں پر بڑے بڑے آبدار موتی تھے بالوں کے ساتھ مل جل کر علیحدہ علیحدہ گردن تک لٹک رہی تھی۔ اور سر کے دونوں جانب زلفوں میں خوشنما پیچ و خم دے کر چارلس دوم Charles II شاہ انگلستان کی پرشکوہ اور ستارہ بیگمات کی طرح پٹیاں جمائی گئی تھیں۔ پیشانی پر ایک مختصر سا طلائی حلقہ تھا جس کے زیریں حصہ میں نصف پیشانی تک بڑے بڑے سڈول اور آبدار موتی لٹک رہے تھے جن کے بیچ بیچ میں زمرد کی مڑیاں[1] تھیں۔

اس چیز کے بالائی جانب ہما کی شکل کا ایک زیور زیب فرق کیے تھیں جس کے پروں سے موتیوں کی بڑی بڑی لڑیاں نکل کر سر کے بالائی حصہ پر پھیل گئی تھیں[2] جس طرح ہم لوگ اپنے بال اوپر کی طرف چڑھا لیتے ہیں اُن کے گوشوارے بڑی بڑی بالیوں کی قطع کے تھے جن میں سے موتیوں کی بڑی بڑی لڑیاں جن کے درمیان زمرد کی مڑیاں تھیں ا چاروں طرف لٹک رہی تھیں۔ ان لڑیوں کے موتی تدریج بڑے ہوتے گئے تھے[3] ناک میں نتھ ... بجی تھی جس میں بڑے تدو قامت کے گول اور سڈول موتی تھے۔ جن کے وسط میں زمرد کی چنی تھی اور ہار وما لے تو اتنی کثرت سے زیب گلو کیے تھیں کہ اُن کی تفصیل بیان سے باہر ہے۔

اُن کی آستینیں لمبی تھیں جو کہنی کے مقام سے کھلی ہوئی تھیں اور اُن کی چوڑی چکلی پوشاک جسم کے زیریں حصہ کو پورے طور سے ڈھانکے ہوئے تھی جس میں بالائی حصہ جسم کے لیے ایک تنگ اور چست کرتی جوڑ دی گئی تھی جو گلے کے مقام پر کھلی ہوئی تھی[4]

جب وہ خرامِ ناز کرتی تھیں تو کتنی خادمائیں اُن کی پوشاک سنبھالنے کو ساتھ

---

[1] چاندنیکے سے مراد ہے۔ [2] جھپکے سے مراد ہے۔ [3] تھالوں سے مراد ہے۔
[4] غالباً مغلئی وضع کی پشوازت مراد ہے۔

چلتی تھیں، اور جب وہ کوچ بر رونق افروز ہوتی تھیں تب بھی متعدد پیش خدمتیں اُن کی پشت پر کھڑی رہتی تھیں۔ تاکہ جب نقل و حرکت سے اُن کے بال زربفت کی رضائی میں جو وہ اوڑھے ہوئے تھیں اُلجھ جائیں تو یہ لوگ پھر قرینہ سے کر دیں۔ یہ حسن کی دیوی آجکل دوسرے محلات کے لیے بہت ہی رشک و حسد کا باعث بنی ہوئی ہے اور بادشاہ سلامت اور اُن کی والدہ معظمہ دونوں اُن کو بہت عزیز رکھتے ہیں، اور اعزازی خطابات سے بھی افتخار بخشا ہے"

فانی پارکس (Fanny Parkes) ایک فرانسیسی خاتون بزمانۂ حکومت شاہ نصیر الدین حیدر بہ سلسلۂ سیاحت بندر دار السلطنت لکھنؤ میں بھی وارد ہوئی تھیں انھوں نے اپنے سفرنامہ میں تاج محل کے متعلق تحریر کیا ہے کہ:۔

"تاج محل کے داخلِ حرم ہونے سے قبل بادشاہ کو اپنے ولایتی محل دختر والٹر سوداگر المخاطب بہ نواب مخدرۂ علیا کی بہت چاہت اور الفت تھی مگر تاج محل سے شادی ہو جانے کے بعد بادشاہ اُن کی چاہ میں ایسے ڈوبے کہ ولایتی محل کی مطلق پروانہ رہی اور اُن کا ستارۂ اقبال بالکل غروب ہو گیا"

نصیر الدین حیدر رنگیلے، رنگین اور متلون مزاج انسان تھے ان میں یہ صفت بھی تھی کہ ہے کہ اُن کا پیمانۂ دل تو بادۂ الفت سے لبریز رہتا ہے مگر منظورِ نظر پوشاک کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ چنانچہ تاج محل جیسی قمر طلعت دیری پیکر عورت بھی زیادہ عرصہ تک اُن کو اپنے حلقہ اثر میں نہ رکھ سکی، اور تھوڑے ہی زمانے کے بعد اعلیٰ حضرت دوسری نواب حسینی المخاطب بہ بادشاہ محل کی زلفِ پر پیچ میں گرفتار ہو کر انھیں کا کلمہ پڑھنے لگے اور تاج محل کی طرف سے سرد مہری ہو کر اُن کا آفتابِ عروج پورے طور پر گہن میں آ گیا۔

ایک دوسرے مقام پر موصوفہ تحریر کرتی ہیں:۔

"تاج محل بادہ گلگوں سے بھی شوق کرتی ہیں، اور بادشاہ کی مے نوشی کا کل سازو سامان انھیں کی محل سرا میں رہتا ہے۔"

نصیر الدین حیدر نے بماہ جولائی ۱۸۳۷ء زہر خورانی سے انتقال کیا۔ ان کے بعد محمد علی شاہ اُن کے چچا پانچ برس تک تخت شاہی پر جلوہ افروز رہے۔ اُن کے بعد اُن کے فرزند امجد علی شاہ بھی بمدت پانچ سال تاجدار اودھ رہے۔ اُن کی رحلت پر اُن کے پسر دوم جان عالم واجد علی شاہ نے تخت موروثی پر جلوس فرمایا۔

اس دس سال کی مدت میں جو واقعات بیگمات شاہی کے متعلق رونما ہوئے اُن کی نسبت سید کمال الدین حیدر مصنفہ قیصر التواریخ حسب ذیل رقم طراز ہیں:۔

"صاحبات محل، ملکہ زمانیہ، نواب مبارک محل صاحبہ، ولایتی محل، ممتاز محل، سرفراز محل، تاج محل، نواب ملکہ جہاں صاحبہ، فارغ البال رہتی تھیں۔ اور ظل حمایت صاحب ریزیڈنٹ میں باستراحت تمام خواب راحت میں آرام کرتی تھیں۔ ہر چند بسبب ظنون فاسد جو خلاف شاہی ہوتے تھے اور متواتر مداخلت بے محل اختیار سے اکثر وزرائے سلطنت سے مخالفت ظاہر ہوئی کس واسطے کہ حفظ ناموس مسلاطین کرام حاکم وقت پر لازم ہے۔ چنانچہ نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں نے بہت تاکید اس انتظام میں بحکومت چاہی اور امیر منشی احساب ریزیڈنٹ بسفارش بحیلہ وثیقہ چاہتے تھے کہ مداخلت بیجا کریں، نواب نے رو برو صاحب ریزیڈنٹ معقول کیا اور بعض وزرا نے دھمکا کر اپنی صورت نفع نکالی اور بیگموں کا انتظام قرار واقعی نہ کیا۔ بیگمات نے بھی اپنی عادات قدیم سے ہاتھ نہ اٹھایا۔"

چنانچہ ۱۸۴۷ء میں بعہد دولت حضرت واجد علی شاہ تاج محل نے بیت سے پاؤں نکالے اور بدروشی پر کمر باندھی۔ اسی اثنا میں اُن کے یہاں ایک لڑکی کی ولادت ہوئی۔ اُن کے

کرتوتوں کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اُن کی بدچلنی اور بے راہ روی کا تمام دنیا پر روشن ہو گئی اور شہر میں بڑا غلغلہ اُٹھا۔ گھر گھر چرچے ہونے لگے۔ میر کلب حسین ابن جناب سید علی صاحب مجتہد العصر تاج محل سے تعلق رکھنے کی علت میں گرفتار ہو گئے اور بحکم نواب ناظر محلات شاہی سزایاب ہو کر قید و بند کی سختیاں بھی جھیلیں۔

واجد علی شاہ نے بخیال مزید حفظ ناموس شاہ نصیر الدین حیدر تاج محل کے مکان پر چوکی پہرہ بھی بٹھا دیا۔ اس پر موصوفہ نے سخت بیزاری اور ناراضگی کا اظہار کیا اور بادشاہ کو مطعون بھی کیا کہ وہ اس حیلہ سے مجھ کو اپنے قابو میں لانا چاہتے ہیں مگر واجد علی شاہ اس الزام کو بالکل بے سر و پا بتلاتے تھے اُن کا بیان تھا کہ خود تاج محل مجھ پر ڈورے ڈالتی تھیں اور لگاوٹ کر کے مجھے اپنے دامِ اُلفت میں گرفتار کرنا چاہتی تھیں۔ اسی غرض سے انھوں نے قطب علی خاں ستار باز اور اپنی مغلانی کو بھی میرے پاس بھیجا تھا مگر میں نے بپاس لحاظ اپنے بزرگ شاہ نصیر الدین حیدر انھیں صاف جواب دیدیا کہ مجھے یہ فعل منظور نہیں ہے۔

واجد علی شاہ کی اس سخت گیری کو سلیمن صاحب ریذیڈنٹ اودھ نے بھی ناپسند کیا۔ اور ان کو تحریر کیا کہ تاج محل کے مکان سے پہرہ ہٹا لیں۔ لیکن اگر مناسب خیال فرمائیں تو نگرانی کے لیے ایک محل دار مقرر کر دیں۔ علاوہ بریں ایک حکمنامہ بھی سر دیقہ دار بیگم کے نام جاری کر دیا کہ ہم نے محلات کی نگرانی اور دیکھ بھال کے لیے ایک محل دار مقرر کی ہے تاکہ وہ بیدار رہ کر روزانہ بیگمات کے حرکات و سکنات سے مطلع کرتی رہے۔ اس کی تنخواہ صاحبات محل کے ذمہ ہو گی۔ اس کے علاوہ ایک داروغہ بھی سرکار شاہی سے مقرر ہوا تاکہ وہ بیگمات کے پوشیدہ حالات سے مطلع کرتا رہے۔ اس جدید انتظام سے بیگمات کے حواس غائب ہو گئے ہر طرف نقرئی و طلائی گھوڑے دوڑنے لگے مگر کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

واقعات مرقومہ بالا کی تائید و تصدیق سلیمن صاحب کے مراسلوں سے بھی ہوتی ہے

---

۱ محل خانہ شاہی

جو اسی زمانہ میں ریذیڈنٹ اودھ تھے اور سلطنت اودھ کے نظم و نسق کے متعلق سرکار انگلیشیہ
کو اپنی رپورٹ ارسال کرنے کے لیے اودھ کا دورہ کر رہے تھے۔ اس واقعہ کے بارے میں
موصوف اپنے سفرنامہ اودھ کی جلد دوم میں تحریر کرتے ہیں:۔

"تاج محل اب تک زندہ سلامت ہیں۔ اُن کو چھ ہزار روپیہ ماہوار پنشن بذمہ داری
برٹش گورنمنٹ برابر مل رہی ہے۔ اُن کے یہاں ایک لڑکی کی پیدائش کے بعد
یہ مناسب خیال کیا گیا کہ اُن کو زیر نگرانی رکھا جائے تاکہ مزید ولادت ہونے سے
شاہ نصیر الدین حیدر کی زیادہ رسوائی و بدنامی نہ ہو۔"

ایک خط موصوف نے اسی واقعہ کے متعلق کپتان برڈ (Captain Bird) اسسٹنٹ
ریذیڈنٹ اودھ کو بھی بتاریخ ۵ ردسمبر ۱۸۴۹ء اپنی قیام گاہ نواب گنج سے حسب ذیل
مضمون کا روانہ کیا تھا۔

"تاج محل کے متعلق میں نے رچنڈ صاحب (Richmond) اسسٹنٹ ریذیڈنٹ
کے حکم کے مطابق کارروائی کی کہ اگر اعلیٰ حضرت (واجد علی شاہ) کو منظور ہو تو
تاج محل پر ایک محل دار مسلط کر دیں مگر سپاہیوں کو واپس بلالیں۔ اور آپ کو
اس امر پر زور دینا چاہیے کہ میرے حکم کے بموجب تاج محل کے مکان سے سپاہی فوراً
ہٹا لیے جائیں۔"

ایک اور خط بتاریخ ۱۰ ردسمبر ۱۸۴۹ء موصوف نے اپنی فرودگاہ بہرائچ سے کپتان برڈ کو
حسب ذیل مضمون کا بھیجا تھا:۔

"تاج محل کے متعلق میرا آخری حکم یہ تھا کہ وہ ایک محل دار کو جسے بادشاہ نامزد
کریں، اپنے مکان میں قیام کی اجازت دیں۔ لیکن اُن کو اس امر پر مجبور نہ کیا جائے کہ
سپاہیوں کا پہرہ بھی ان کے مکان پر قائم رہے۔ میں اس مضمون کا ایک مراسلہ
جہاں پناہ کو بھی بھیج چکا ہوں اور میرے حکم پر قطعی طور سے عمل درآمد ہونا چاہیے

تاج محل نہایت آوارہ، ضدی اور بے باک عورت ہے کہ اگر وہ میرے حکم سے سرتابی کرکے بادشاہ کی مقرر کردہ محل دار کو اپنے یہاں قیام نہ کرنے دے گی تو میں سخت سے سخت کارروائی کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔

یہ امر واقعہ ہے کہ نواب تاج محل اور میر کلب حسین دونوں ایک دوسرے کے ایسے عاشق زار اور بادۂ الفت سے اتنے متوالے اور سرشار ہو رہے تھے کہ باوجود سرکاری پابندیوں اور بندشوں کے ان کے سیلاب عشق میں سر مو فرق نہ ہوا بلکہ دونوں مجبورین باصدق و صفا آتش فراق میں اور زیادہ جلنے لگے۔ خواب و خور حرام ہو گیا۔ درد فرقت سے کسی پہلو قرار نہ آتا تھا۔ بالآخر حکمت عملی سے ملاپ کی یہ صورت پیدا کی کہ کسی طرح کا خدشہ اور وسوسہ نہ رہا۔

پہلے تاج محل بحیلۂ زیارت عتبات مقدسہ لکھنؤ سے روانہ ہوئیں، کچھ روز کانپور میں بازار رام نرائن میں قیام کیا پھر عراق روانہ ہو گئیں۔ میر کلب حسین کو ان کی جدائی سوہان روح تھی۔ چند دنوں کے بعد وہ بھی علیحدہ سے عراق پہنچ گئے۔ وہاں دونوں بلا تامل رشتۂ محبت سلک نکاح میں منسلک ہو گئے اور آزادی و شادمانی سے زندگی بسر کرنے لگے۔

لکھنؤ میں مشہور ہے کہ نواب تاج محل ایک کروڑ روپیہ کی مالیت کے جواہرات اور دیگر سامان اپنے ہمراہ لے گئی تھیں۔ تاج محل کی لکھنؤ سے روانگی کی تاریخ اور سنہ کا پتہ باوجود جستجو کے نہیں چلا مگر سید کمال الدین حیدر لکھتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء میں زمانۂ حکومت مرزا برجیس قدر (پسر واجد علی شاہ) حضرت محل والدہ برجیس قدر نے بڑے اخراجات حکومت مبلغ ایک لاکھ روپیہ تاج محل سے بھی وصول کیے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ عظیم تک تاج محل لکھنؤ میں مقیم تھیں، اس کے بعد عملداری سرکار انگلشیہ میں حالات موافق پاکر سفر عراق اختیار کیا کیونکہ سکونت لکھنؤ ترک کرنے کے بعد نہ تاج محل کبھی لکھنؤ آئیں نہ ان کی کوئی لڑکی آئی نہ میر کلب حسین آئے

دوران قیام عراق میں میر کلب حسین کے تاج محل سے دو لڑکیاں پیدا ہوئیں جو بڑی بیگم اور چھوٹی بیگم مشہور ہوئیں۔ جب یہ لڑکیاں سنِ شعور کو پہونچیں تو ان کی شادی کی فکر ہوئی۔

میر کلب حسین اُن کی کتخدائی اپنے خاندان والوں کے ساتھ کرنا چاہتے تھے۔ میر مہدی حسین اور میر جعفر حسین پسران میر باقر حسین کو جو امام باڑہ غفرانمآب کے قریب رہتے تھے لکھنؤ سے عراق بلوا کر بڑی بیگم کی شادی میر مہدی حسین سے اور چھوٹی بیگم کی میر جعفر حسین سے کردی۔ دونوں بھائی کھرے سید اور خاندان اجتہاد سے تعلق رکھتے تھے مگر بد قسمتی سے مفلسی کا چوتالہ دونوں کے یہاں بج رہا تھا۔ اس رشتہ بندی سے سوکھے دھانوں پانی پڑا اور دونوں کی مرجھائی ہوئی کھیتیاں سرسبز و شاداب ہو کر لہلہانے لگیں۔ میر مہدی حسین کے کوئی اولاد بڑی بیگم سے نہ ہوئی۔ میر جعفر حسین کے یہاں صرف ایک لڑکی ہوئی جس کا نام کلثوم بیگم رکھا گیا۔ لڑکیوں کی شادی خانہ آبادی سے فراغت پانے کے بعد میر کلب حسین نے سفر آخرت اختیار کیا۔ میر جعفر حسین اُن کے قبل ہی دنیا کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ پھر بڑی بیگم اور اُن کے بعد چھوٹی بیگم بھی داغِ مفارقت دے گئیں۔ ان پیہم صدمات روحانی نے تاج محل کو آزاد جسمانی لاحق ہوگئے۔ آخر کار ۱۸۷۶ء مطابق ۱۲۹۳ھ میں جیتاں جہاں کی یہ تاج اور گلشنِ خوبی و رعنائی کا یہ خوش رنگ اور بے نظیر پھول بھی ظالم موت کے ہاتھوں فنا ہو کر سرزمین عراق ہی میں سپرد خاک ہوا۔ اُن کی آنکھ بند ہوتے ہی اہل دنیا دوڑ پڑے۔ نواب اقبال الدولہ (پسر نواب شمس الدولہ ابن نواب سعادت علی خاں) نے جائداد کا تصفیہ کرایا۔ لکھنؤ کے ایک ذات پاک مقیم عراق نے مرحومہ کا گراں بہا تاج اور بیش قیمت اسباب کھسکا دیا۔ تین دن تک مسلسل اسباب ڈھوئے گئے۔ کچھ سرکار میں بطور امانت جمع کر دیئے گئے بہت کچھ خود لے گئے کچھ مال ڈاوڈ ساسون David Sassoon کی سپرد کی

لہ قیصر التواریخ جلد اول

میں دیدیا گیا جو وہاں کے بت وسیع یہودی سوداگر تھے۔

بروقتِ انتقال تاج محل مولوی مہدی حسین لکھنؤ میں تھے۔ تاج محل کی ایک حبشی کنیز نے اُن کو اطلاع دے کر عراق بلوایا۔ تاج محل کچھ عرصہ سے مولوی مہدی حسین سے ناخوش تھیں، جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ داروغہ تاج محل کی بیٹی کو سبز باغ دکھا کر عراق سے لکھنؤ لے آئے تھے اور یہاں اُن سے نکاح کر لیا تھا اس سبب سے تاج محل اُن کی صورت دیکھنے کی روادار نہ تھیں اور میر مہدی حسین بھی شرم سے اُن کا سامنا کرتے تھے۔ اُن دوسری بیوی سے میر مہدی حسین کے دو بیٹے میر عابد حسین اور میر نظیر حسین اور ایک بیٹی جنتی بیگم پیدا ہوئیں۔ جب میر مہدی حسین عراق پہونچے تو نواب اقبال الدولہ تعلیقہ کرا چکے تھے اور بہت کچھ بیش بہا مال و اسباب خُرد و بُرد بھی ہو چکا تھا۔ عراق پہونچکر میر مہدی حسین نے اقبال الدولہ کے مکان کی تلاشی چاہی مگر بالیوز (ریذیڈنٹ) نے بوجہ اُن کے اعزاز و مرتبہ کے اجازت نہ دی۔

ان گُتھیوں کو سلجھانے اور مال و اسباب کو بذریعہ عدالت واپس لینے کے لیے زر نقد کی اشد ضرورت تھی۔ کلثوم بیگم اُس وقت نابالغ تھیں، چنانچہ میر مہدی حسین نے اپنی بھتیجی کے ولی کی حیثیت سے تاج محل کی پنشن فروخت کر دی اور کلثوم بیگم کی شادی سے بھی بطور سرپرست سبکدوش ہونا چاہا۔ اس غرض سے لکھنؤ میں مناسب بَر کی تلاش ہونے لگی۔ کئی روپیہ کے بھوکے شریف زادے جن میں ایک مشہور شاعر میر کاظم علی جاوید بھی تھے اس سونے کی چڑیا کے خواستگاروں میں تھے مگر نظر انتخاب میر اصغر حسین پر پڑی اور انھیں کے سر کامیابی کا سہرا بندھا۔ میر اصغر حسین بھی اُس زمانہ میں پریشان حال تھے۔ اور متصل امام باڑہ آغا باقر سکونت پذیر تھے۔ کلثوم بیگم سے شادی رچانے کے بعد اُن کا بھی ستارۂ اقبال جگمگانے لگا۔ تقریبًا بیس لاکھ روپے بطور نقد و جنس اُن کے ہاتھ لگے جس سے عسرت عشرت سے بدل گئی اور بوستانِ حیات میں تازہ بہار آ گئی۔ مشہور ہے کہ میر

مہدی حسین نے میر اصغر حسین سے تقریباً چار لاکھ روپے بہ ذریت نکاح بطور حق التی وصول کیے جن کے لیے قبل سے کچھ چخنگی بھی کرائی تھی۔ لکھنؤ واپس آ کر میر مہدی حسین نے پاٹا نالہ کا ایک قطعہ آراضی کلثوم بیگم سے مانگ کر اس پر ایک شاندار عمارت تعمیر کرائی جس میں حسین آباد کا آہنی پھاٹک نیلام میں خرید کر لگایا۔ اسی سبب سے یہ عمارت آہنی پھاٹک والی عمارت مشہور ہوئی۔ موصوف نے مجالس عزا بھی بڑے حوصلہ اور شان سے منعقد کیں جن میں ہزار ہا آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا اور جس کی خوش انتظامی زبان زد خلائق تھی۔ میر صاحب کو شعر و شاعری سے بھی ذوق تھا۔ ناہر تخلص کرتے تھے۔ اُن کے بعد اُن کے دونوں بیٹے میر عابد حسین و میر نظیر حسین بہت اُڑ کر چلے۔ زمین پر قدم نہ رکھتے تھے۔ اپنی بدشوقیوں اور شاہ خرچیوں سے کل دولت اُڑا دی۔ کئی لاکھ کا گھر خاک کر دیا۔ تنکا تک باقی نہ رکھا فضول خرچیوں کا یہ عالم تھا کہ چو اسپہ گاڑی سواری کے لیے رکھی۔ اُن کا اصطبل گھوڑوں کی کثرت سے سوداگر کا گھوڑ سال معلوم ہوتا تھا۔ کتوں کے پٹوں اور گھوڑوں کے سُموں تک میں گھڑیاں لگا دیں۔ بالآخر اسی عادت بد کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو کر بڑی تنگدستی اور پریشانی میں دونوں بھائیوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

تاج محل کے دو بھائی رمضان علی خاں اور آغا صاحب اور ایک بھتیجے احمد حسن خاں پسر رمضان علی خاں لکھنؤ میں موجود تھے مگر اُن کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔

مولوی اصغر حسین جب اپنی نو عروس کلثوم بیگم کو عراق سے لکھنؤ لائے تو سکندر باغ میں کرمن صاحب کی کوٹھی میں قیام کیا۔ پھر ۱۸۶۹ء میں محلہ نرہئی متصل حضرت گنج میں دو قطعہ عالی شان مکانات تعمیر کرا کے وہاں منتقل ہو گئے۔ موصوف نے بھی بہت رئیسانہ ٹھاٹھ دکھائے۔ اُن کی سواری کی فٹن میں گھڑی اور آئینہ تک لگا رہتا تھا۔ ماہ محرم میں پانچویں تاریخ کو اُن کا علم بڑے ساز و سامان اور شاندار جلوس کے ساتھ درگاہ حضرت عباس جاتا تھا۔ میر صاحب کو بھی شعر و سخن کا بہت مذاق تھا فاخر تخلص تھا

مجلسیں اور مشاعرے اُنھوں نے بھی دھوم دھام سے کیے۔ کچھ عرصہ تک لکھنؤ میں قیام کرنے کے بعد کلثوم بیگم بوجہ وبا ہیضہ عراق چلی گئیں۔ پھر بعض وجوہ سے وہیں قیام کیا۔ لکھنؤ واپس نہ آئیں اور تخمیناً ایک سال کے بعد ایک بیٹا اپنی یادگار چھوڑ کر اس دارِ ناپائدار سے بہشت کے لیے رخصت ہو گئیں۔

تاج محل کی املاک کوچہ چھوٹی شہزادی متصل پاٹانالہ میں تھی مگر اب وہ قائم نہیں ہے اب اُن کی صرف شہروار کٹرہ بزازن بیگ میں متصل باغ شوکت الدولہ مرزا احمد موسوم لطیفہ تاج محل موجود ہے جس میں اُن کے خاندان کے لوگ مدفون ہیں۔ عراق میں تاج محل کے تین قطعہ مکانات ملحق بیک گراؤ اور ایک مسجد روضۂ کربلائے معلیٰ کے قریب واقع تھی۔ مکانوں میں بیک وقت تیس چالیس زائرین کے قیام کی گنجائش تھی اُنھیں کے لیے مکانات وقف تھے اور وہیں مجالس بھی ہوتی تھیں۔

عراق میں اُن کا ایک اور وقف بھی ہے جس کی آمدنی سے آٹھویں روز مجالس ہوتی ہیں اور وظائف بھی دیے جاتے ہیں۔ اس کل املاک کا نام تاج محل تھا۔ سُنا ہے سُنا ہے اب اس کو سرکار عراق نے معاوضہ دے کر حاصل کر لیا ہے اور یہ بھی اقرار کیا ہے کہ اس کے عوض میں دوسری عمارت تعمیر کرا دی جائے گی۔ یہ بھی بذریافت معلوم ہوا ہے کہ ماہ جون ۱۹۳۶ء میں جب یہ عمارت کھودی گئی تو ایک دیوار سے اشرفیوں کی تھیلیاں برآمد ہوئی ہیں۔

نواب تاج محل، اُن کی دونوں بیٹیوں اور نواسی کی قبریں روضۂ کربلا کی غلام گردش میں واقع ہیں۔ جھاڑ فانوس اور دیگر سامان آرائش سے مزین ہیں اور قرآن خوان بھی بغرض ایصال ثواب مقرر ہیں۔

نصیر الدین حیدر کے حبالۂ عقد میں آنے سے قبل تاج محل کی کچھ املاک جھوائی ٹولہ

[illegible] نواب [illegible] الدولہ منشی عبدالطیف

میں ایک قطعہ آراضی مغل پورہ چوک میں اور سکونتی مکان راجہ راجپال کی حویلی کے پاس منجھری ڈلہ میں تھا۔

نواب بادشاہ محل

بی حسینی شاہ نصیر الدین حیدر کے دربار گہر بار میں مجرا کرنے جایا کرتی تھیں۔ بادشاہ اُن کی بانکی اداؤں اور ترچھی نگاہوں کے ایسے والہ و شیدا ہوئے کہ اُن کے ساتھ عقد کر کے داخل محل کر لیا اور بادشاہ محل خطاب دے کر سربلند و ممتاز فرمایا۔ بقول سید کمال الدین حیدر مصنف تواریخ اودھ بادشاہ محل کے بانی مبانی اپنے رسوخ کے واسطے نواب منتظم الدولہ ہوئے۔ اُنھیں اپنی بیٹی کیا۔ آقا محمد اُن کی ماں کے آشنا کو اپنا مقرب کیا۔ وہ اس محل کے پدر مصنوعی ہوئے۔ چونکہ نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں ۱۴ر نومبر سے لے کر دسمبر ۱۸۳۲ء تک نصیر الدین حیدر بادشاہ کے وزیر رہے اور آخر الذکر ۱۰ ار دسمبر ۱۸۳۱ء کو قدسیہ محل سے عقد کر کے اُن کے ایسے گرویدہ ہو گئے کہ اُن کے انتقال تک کوئی دوسرا محل نہیں کیا اس لیے یہ بآسانی قیاس کیا جا سکتا ہے بادشاہ محل کے ساتھ نصیر الدین حیدر کا عقد ۱۴ر نومبر ۱۸۳۰ء سے لے کر ۱۰ار دسمبر ۱۸۳۱ء تک کسی مہینے میں ہوا۔

بادشاہ محل کے جو واقعات سید کمال الدین نے بیان کیے ہیں اُن کی تصدیق و تائید فانی پارکس (Fanny Parkes) کے مرقومہ حالات سے بھی ہوتی ہے۔ یہ ایک فرانسیسی خاتون تھیں جو بزمانۂ نصیر الدین بہ سلسلہ سیاحت ہند شہر لکھنؤ بھی آئی تھیں اور اُس زمانہ کے تاریخی واقعات قلم بند کر کے دو ضخیم جلدوں میں بزبان انگریزی لندن میں شایع کرائے تھے۔ اپنے سفرنامہ میں بادشاہ کے متعلق وہ تحریر کرتی ہیں۔

"نواب حکیم مہدی نے اپنا اثر و رسوخ زوال پذیر دیکھ کر ایک رقاصہ کو اپنی

منہ بولی بیٹی کیا۔ نصیرالدین حیدر اُس کے ناز و کرشموں پر پہلے ہی سے ملوث ہو چکے تھے۔ وزیر کی ترغیب اور تحریص نے اُن کی آتش شوق کو اور بھڑکا دیا
اس کا نام گیسنی (حسینی) ہے اس میں کوئی خاص دل فریبی اور رعنائی نہیں ہے مگر بادشاہ سلامت پر بہت چھا گئی ہے۔ تخمیناً چودہ ماہ کا عرصہ ہوا یہ پچیس روپیہ یومیہ پر ریذیڈنسی میں مجرا کیا کرتی تھی اور اتنے ذلیل طبقہ کی عورت ہے کہ کوئی سائیس بھی اُس سے شادی رچانا پسند نہ کرے گا۔

اب بادشاہ نواب کو اپنا خسر ظاہر کرتے ہیں اور اُن سے ارشاد کیا کرتے ہیں کہ میں نے تو آپ کی بیٹی سے شادی کر لی مگر ابھی تک آپ نے اُس کی ماں سے نکاح نہیں کیا بہتر ہے کہ آپ اُن کی ماں کو حبالۂ عقد میں لے آئیں۔ نواب یہ کہہ کر بات ٹال دیا کرتے ہیں کہ اب میرا سن و سال شادی کے لائق نہیں رہا۔ مگر بادشاہ اکثر اوقات یہ فرما کر کہ نواب صاحب آپ کا عقد کب تک ہو گا انھیں چھیڑا کرتے ہیں تاج محل جو حسن و جمال میں اپنی نظیر نہیں رکھتیں اب تک بادشاہ کی نہایت چہیتی اور دل نواز بیگم تھیں۔ مگر حسینی کے عروج سے اب ان کا رنگ پھیکا پڑ گیا مگر بادشاہ بی حسینی پر بہت ریجھے ہوئے ہیں اور انھیں کے چاؤ چوچلے اور لاڈ پیار رہیں۔ تاج محل اب مئے گلگوں سے بھی شوق کرنے لگی ہیں اور بادشاہ کی مے نوشی کا کل سامان انھیں کے محل میں رہتا ہے۔

جب بادشاہ کانپور تشریف لے گئے تو اپنے ہمراہ ان دونوں محلات کو بھی لے گئے تھے۔ دونوں بیویاں بہت ہی حشم و خدم سے گئی تھیں۔ نصیرالدین حیدر نے چار لاکھ روپیہ کے نوٹ بادشاہ محل کو برائے وثیقہ عنایت کیے تھے۔ ابھی اور زیادہ نہ وصول ہوئے تھے کہ اُن کا ستارۂ اقبال غروب ہو کر قدسیہ محل کی رتی چمک گئی

نصیرالدین حیدر نے ۷ جولائی ۱۸۳۷ء کو سفر آخرت اختیار کیا۔ اُن کی رحلت کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد بادشاہ محل بھی جنھوں نے اپنے تر مژگاں سے نصیرالدین حیدر

کو گھائل کر دیا تھا۔ کسی مہلک مرض میں مبتلا ہو کر خود تیرِ قضا کا نشانہ ہو گئیں۔ نصیر الدین حیدر کے انتقال پر اُن کے جانشین حضرت محمد علی شاہ نے حکمتِ عملی سے وہ چار لاکھ روپیہ کے نوٹ جو برائے وثیقہ عطا ہوئے تھے واپس لے کر بادشاہ محل کی دو ہزار روپیہ ماہوار کی تنخواہ مقرر کر دی۔ موصوفہ کے انتقال پر بوجہ لاولدی ان کی تنخواہ ضبط سرکار ہو گئی اُن کی والدہ پریشان و سراسیمہ رہیں۔ والد کربلائے معلیٰ چلے گئے۔ کئی برس وہاں قیام کرنے کے بعد اسی پاک و مقدس سرزمین میں پیوندِ خاک ہو گئے

بادشاہ محل کے منزلہ میں کچھ کنیزیں بھی تھیں جو مرزا محمد واجد علی کو مرحمت ہوئیں جو اپنے پدر امجد علی شاہ کے بعد تخت نشین ملک اودھ ہو کر سلطان عالم واجد علی شاہ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ مرزا واجد علی نے وہ کنیزیں اپنی خدمت کے لیے رکھ لیں۔ اور باقی کی شادیاں کر دیں۔ جو کنیزیں شہزادہ واجد علی کے تصرف میں آئیں ان کے نام موصوف نے فرخندہ بخش اور شاہ بخش رکھے۔ کچھ عرصہ کے بعد فرخندہ بخش حاملہ ہو گئی۔ اُس پر اس کو فرخندہ خانم صاحبہ خطاب دے کر سرفراز کیا اور پردہ بھی بٹھا دیا۔

ایام مقررہ گزرنے کے بعد فرخندہ خانم کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ محمد علی شاہ لڑکی کے دادا نے اس کا نام نواب شمس النسا بیگم رکھا مگر ماں کی شومیٔ قسمت سے فرشتۂ اجل نے صغر سنی ہی میں اس لڑکی کے نقشِ ہستی کو صفحۂ دنیا سے مٹا دیا اسی سبب سے اس کی ماں اسامی ہی رہی۔ محل کے رتبہ پر فائز نہ ہو سکی۔ اگر بدبختی سے یہ غنچہ بن کھلے مرجھا نہ جاتا تو حسب دستور خاندانِ شاہی اودھ اُس کی ماں کا محل کے درجہ تک ترقی کرنا یقینی تھا۔

بادشاہ محل کی یادگار ایک محلہ وارڈ دولت گنج لکھنؤ میں محلہ ڈیوڑھی بادشاہ محل جھوائی ٹولہ سے متصل موجود ہے اسی محلہ میں بادشاہ محل کا ایک وسیع دو منزلہ مکان تھا

مگر استرکاری باقی رہ گئی تھی۔ تخمیناً ۱۸۹۵ء تک یہ مکان قائم تھا اس میں ایک سانولے رنگ کی ضعیفہ صاف و ستھرا لباس پہنے یادِ خدا میں مصروف رہتی تھیں۔ غالباً وہ بادشاہ محل کی ماں یا کوئی اور عزیزہ تھیں۔ اُن کے انتقال پر یا اُن کی حیات میں پہلے ملبہ مکان کھود کر فروخت ہوا۔ آراضی مکان کچھ عرصہ تک اُفتادہ پڑی رہی اُس کے بعد وہ بھی بِک گئی اب کسی شخص نے اس آراضی کو مول لے کر اُس پر ایک دو منزلہ مکان تعمیر کرایا ہے۔

صاحبہ محل

نام حسینی خانم، قوم کی حلال خور، مگر گدڑھیا کا کنول یا گدڑی کا لعل تھیں شکل و شمائل سے حور کی بچی معلوم ہوتی تھیں۔ شاہ نصیر الدین حیدر اُن کے چاند سے مکھڑے پر چکور کی طرح فریفتہ ہو گئے اور داخل حرم کر کے انھیں حضرت صاحبہ محل کا خطاب ہی نہیں عطا کیا بلکہ اُن کے ناز و غمزوں کے ٹوکرے بھی اُٹھاتے رہے۔ حسینی خانم بھی شل جاروب ہمیشہ آنکھیں فرش راہ کرتی رہیں بجز اطاعت و فروتنی کبھی سر نہ اُٹھایا۔

۱۸۳۷ء میں بیوہ ہو جانے کے بعد موصوفہ سفید اور سادے کپڑے پہنتیں۔ سفید پائجامہ سفید جامدانی کا کرتہ اور ڈھاکہ کی ململ کا سفید ڈوپٹہ اوڑھتی تھیں۔ ہاتھوں میں سونے کے بتاشے۔ انگلی میں دُرِ نجف کی انگوٹھی اور پیروں میں سفید کاشانی مخمل کا گھیتلا جوتا ہوتا۔ حیدری گنج میں نواب عظمت الدولہ کی کربلا کے قریب اُن کا صحت خانہ تھا۔ تقریباً تین سو روپیہ ماہوار پنشن ملتی تھی نصیر الدین حیدر کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد انھوں نے پھر ثواب کمایا اور سید محمد شاہ متخلص بہ سردار سے عقد ثانی کر لیا۔ میاں بیوی کا ہمیشہ آمیزہ رہا اور باہمی صفائی بھی رہی نہ کبھی گندی باتوں کی نوبت آئی نہ کسی کا دل میلا ہوا

اس مناکحت سے سرفراز کو تو چترال کے مہتر کا مرتبہ حاصل ہو گیا بیوی کی کمائی موٹی پنشن کھاتے اور مزے اُڑاتے رہے بیوی بھی اُن کو شل گوگا پیر سمجھتی رہیں اور بہت پاکدامنی سے بسر کی۔ غرضکہ دونوں میں ہمیشہ جھاڑ و پنجہ کی طرح اتحاد رہا۔ کبھی کسی نے ایک دوسرے پر غلیظ نہ اچھالا۔

محمد شاہ سے اُن کے ایک لڑکی بھی پیدا ہوئی جو ایک سید کو بیاہی گئی اس لڑکی کا ایک لنگڑا بیٹا محمدی حسین نامی تھا اس کی بھی ایک لڑکی تھی جو ایک سید ہی کو بیاہی گئی۔ صاحبہ محل کا ایک بھائی بھی اشرف نامی تھا جس کو رمضانی خانم منسوب تھیں۔

تخمیناً سنہ ۱۹۰۱ء میں یہ گل رعنا بھی اپنی چند روزہ بہار دکھا کر مُرجھا گیا اور بے جان ہو کر لکھنؤ ہی میں پیوند خاک ہو گیا۔ بعد رحلت پنشن موقوف ہو گئی یہی وثیقہ کی شرط تھی۔

پھول محل

یہ بینی رام کُباری فروش کی لڑکی تھی جو قوم کا بقال اور دوہرے ڈیل کا گورا چٹا خوش رو انسان تھا۔ گول دروازہ سے متصل محلہ چکلہ میں رہتا تھا اور داد و ستد کا بیشہ کیا کرتا تھا۔

جب[1] کہاروں کا جمعدار یعنی راجہ مہرا (راجہ مہرا) اس جہان سے رخصت ہوا تو اس کے چھ سات لاکھ روپے بے کود کا دش بینی رام کے ہاتھ لگے۔ اس روپیہ کی بدولت اس نے عاملوں سے پرتہ داری کے ذریعہ تہ کثیر پیدا کیا۔ اسی زمانہ میں وہ عاشورن نام کی ایک شاہد بازاری کے دام اُلفت میں گرفتار ہو گیا۔ کچھ دنوں تو رسمی تعلقات رہے پھر اس کو گھر بٹھا کر پابند کر لیا۔ اُس کے بطن سے ایک لڑکا احمد علی اور ایک لڑکی پیدا ہوئی جو حسن و جمال میں آفت روزگار تھی۔ بقول شاعر:-

---

[1] تاریخ اودھ

حُسنِ ملیح گورا بدن آبِ شباب / متوالی آنکھیں جیسے کہ پُر ساغر شراب

جب بینی رام نے سفرِ آخرت اختیار کیا تو ایک بیٹا رام دیال نامی اپنی ہم قوم بیوی سے چھوڑا جو مہاجنی کی کوٹھی اور تمام مال و اسباب کا مالک ہوا۔ رام دیال نہایت بلند حوصلہ وجاہ پسند انسان تھا مگر اُمّی محض ہونے کی وجہ سے پر پرواز نہ تھے۔ باوجود اس خامی کے اس نے بسلسلہ جواہر فروشی نصیر الدین حیدر شاہ اودھ کے دربار تک رسائی پیدا کی۔

اس وقت اس جواں بخت جواں سال تاجدار کی حُسن پرستی کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ رام دیال نے اپنی سوتیلی بہن دُختر عاشورن کو بادشاہ کی خدمت میں تحفۃً پیش کر دیا جنھوں نے اس گل اندام کو داخلِ حرم کر کے "پھول محل" خطاب دیا اور اس کے بھائی رام دیال کو بھی راجہ کا خطاب عنایت کیا۔ راجگی کا طرّہ امتیاز حاصل ہونے پر رام دیال کا غنچہ دل شگفتہ ہو گیا اور عہدۂ وزارت کی دھن بھی دل میں سمائی۔ میر میر فضل علی اعتماد الدولہ وزیر اعظم کے ایکایک مستعفی ہو جانے پر راجہ رام دیال کا دامن گوہرِ مراد سے بھر گیا اور بادشاہ نے امور سلطنت کی انجام دہی اقبال الدولہ پسر ظفر الدولہ کپتان فتح علی خاں مرزا جعفر ابن مرزا حاجی اور راجہ رام دیال کے سپرد کر دی۔ اس منصب عالی پر فائز ہونے کے بعد بقول سید کمال الدین حیدر مصنف قیصر التواریخ راجہ رام دیال کا بھی دربار مثل دربار وزیر اعظم ہونے لگا اور شہر کے جتنے مفتری، جعل ساز اور چاشت خور تھے سب جمع ہوئے۔

منشی عبد الاحد و تاریخ دل پذیر کے نزدیک چونکہ تینوں وزرا ناکردہ کار اور کم عمر تھے اس لیے اپنے عہدۂ جلیلہ کے فرائض بحسن و خوبی انجام دینے سے قاصر رہے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد عیش و عشرت میں پڑ کر گھچھرے اُڑانے لگے اور بادہ گلگوں سے بھی مدہوش رہنے لگے جس پر تخمیناً دس ماہ کے بعد شاہ اودھ نے راجہ رام دیال مع دیگر وزرا کو برخاست کر دیا اور نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں کو فرخ آباد سے بلا کر تبایخ ۲۸ ذیحجہ

سنہ ۱۸۳۰ء قلمدانِ وزارت اُن کے سپرد کر دیا۔

مولانا نجم الغنی مؤلف تاریخ اودھ نے ان واقعات کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ اعتماد الدولہ کا زوال راجہ رام دیال کے عروج کا باعث ہوا اور تمام سلطنت میں اس کا حکم جاری ہونے لگا۔ مگر راجہ بالکل اَن پڑھ اور کُندۂ ناتراش تھا جب سر ہربرٹ میڈک (Sir Herbert Maddock) ریذیڈنٹ ہو کر آئے تو اُنھوں نے ایک روز رام دیال کی مزاج پُرسی کی جس کے جواب میں اُس نے بجائے "نفخ" کے کہا میرے پیٹ میں "نفس" بہت رہتا ہے۔ یہ سُن کر ریذیڈنٹ تہ کو پہونچ گئے کہ یہ شخص علم و فضل سے بالکل بیگانہ ہے اور کسی مقتدر اور ذمہ داری کے عہدہ کی قابلیت اور اہلیت نہیں رکھتا۔ چنانچہ اُنھوں نے یہ بات بادشاہ کے گوش گزار کر کے اُن پر اپنا منشا بھی ظاہر کر دیا کہ رام دیال جیسے شخص کا مدار المہام ہونا سلطنت کے لیے باعثِ بدنامی ہے۔ اُس کے بعد راجہ کی آمد و رفت ریذیڈنسی میں موقوف ہو گئی اور پرچہ پیام چوبدار کے معرفت جانے لگا۔ اگر کوئی مشکل کام پیش آتا تو نجم الدولہ کے ذریعہ سے انجام پاتا۔ مگر رام دیال سے ریذیڈنٹ کی ناراضگی کا خاص سبب یہ تھا کہ ایک روز اُنھوں نے رام دیال سے دریافت کیا کہ کیواں جاہ کس کے نطفہ سے ہیں اور ساتھ ہی اُس کے راجہ کو ہدایت بھی کر دی کہ یہ بات اپنے تک رکھنا۔ مگر راجہ پیٹ کا ہلکا تھا بات ہضم نہ کر سکا اور اپنی سرخ روئی جتانے اور اثر جمانے کو یہ واقعہ حرف بحرف بادشاہ سے بیان کر دیا جس پر ایک روز اُنھوں نے برسبیل تذکرہ ریذیڈنٹ سے دریافت کیا کہ آپ کیواں جاہ سے کیوں ناخوش ہیں۔ یہ سُن کر ریذیڈنٹ دم بخود رہ گئے اور دل میں سمجھ لیا کہ یہ حرکت رام دیال کی ہے۔ اُسی روز سے راجہ ریذیڈنٹ کی نظروں سے گر گئے بعدہ بادشاہ نے بھی اُن کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں اور اُن کے حکم سے ٹیڑھی کوٹھی میں گرفتار ہو کر اپنے ہی مکان سکونت میں نظربند کر دیے گئے اس طور پر چار دن کی چاندنی ختم ہو گئی

اور اُن کے حواشی بھی اپنی اصلی حالت پر آ گئے۔ منشی رام سہائے تمنّا مؤلف احسن التواریخ نے بادشاہ کی بے رُخی اور راجہ کی نظر بندی کے حسب ذیل اسباب بتائے ہیں:۔

"میڈوک صاحب نے بعائنہ تحریرات سابقہ اخراج رام دیال و معزولی سرکار نیابت پر کمر ہمت چُست کی۔ اتفاقات وقت سے کچھ جعل در ثبوت ثانی ان اشخاص کی ثابت ہوئی، ریذیڈنٹ نے بادشاہ سے عرض کی کہ اگر اخراج رام دیال میں حضور کو تأمل ہے تو وہ ریذیڈنسی میں محبوس کیا جائے گا۔ ناچار بادشاہ نے قید کیا اور ساکبر علی خاں فرزند امیر الدولہ حیدر بیگ خاں بارہ دن تک کار نیابت انجام دیتے رہے۔ بعد اُس کے منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں نائب ہوئے"

راجہ رام دیال کی اسیری کے بعد بھی پھول کل تو بادشاہ کے گلے کا ہار بنی رہیں مگر راجہ باسی اور بے باس پھولوں کی طرح جہاں پناہ کے دل سے بالکل اُتر گئے اور اُن کا چمن آرزو ہمیشہ کے لیے اُجڑ کر رہ گیا

راجہ رام دیال کا عالی شان مکان چوڑی والی گلی متصل گول دروازہ میں بوسیدہ حالت میں موجود تھا مگر سنہ ۱۹۵۲ء کی برسات میں منہدم ہو گیا۔ مکان سے متصل ایک محلہ بھی موسومہ فرش راجہ رام دیال اب تک اُن کے نام سے موسوم ہے۔ اُن کے باپ بینی رام کا بھی ایک وسیع باغ محلہ نواز گنج کے قریب ابتک موجود ہے جو کسی کے ہاتھ بک چکا ہے اب اس میں کاشتکاری ہوتی ہے مگر داخلہ کا عالی شان پھاٹک اُس کی اگلی عظمت کا پتہ دیتا ہے۔ باغ اب تک سُپاری والے کا باغ یا سُپاری باغ کے نام سے مشہور ہے۔

نواب مخدرۂ علیا

ولایتی محل شاہ نصیر الدین حیدر

شاہانِ اودھ میں نصیر الدین حیدر ولایتی اشیاء اور یوروپین طرز معاشرت کے بہت دلدادہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے قصرِ شاہی کے کمروں میں انگریزی طرز کا فرنیچر نہایت سلیقہ سے مغربی طریقہ پر سجایا تھا اور اُن کے کئی مصاحب بھی یوروپین تھے۔ جن کے نام یہ تھے۔

(۱) مسٹر رائٹ۔ معلّم۔ جو بادشاہ کو انگریزی زبان کی تعلیم دیتے تھے۔

(۲) مسٹر بانٹرز۔ جو جرمنی کے ایک اعلیٰ درجہ کے مصوّر اور ماہر موسیقی تھے۔

(۳) مسٹر کریڈلی۔ جو مہتمم کتب خانہ تھے۔

(۴) کپتان میگنس۔ جو باڈی گارڈ یعنی محافظ ذاتِ شاہانہ تھے۔

(۵) ڈی رسیٹ۔ یہ خط تراش تھا۔ اس کی رسائی ریذیڈنٹ کی سفارش پر ہوئی تھی۔ اس نے بادشاہ کے بال انگریزی وضع کے سنوار کر اُن میں خوشنما پیچ و خم پیدا کیے تھے جو اُن کے گورے چٹے چہرے پر نہایت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ یہ حجّام بادشاہ کی ناک کا بال ہو رہا تھا اور اُس کو مصاحبت کا افتخار بھی حاصل تھا۔ اکثر شراب اور دیگر ولایتی چیزیں اُسی کی معرفت خریدی جاتی تھیں۔ اسی وجہ سے ایک قلیل مدت میں اُس نے لاکھوں روپیہ پیدا کر لیا تھا اور جب تھوڑے عرصہ کے بعد وہ برخاست ہوا تو چوبیس لاکھ روپے اس کی جیب میں جا چکے تھے۔

ان مصاحبین کے علاوہ ایک اعلیٰ درجہ کا فرانسیسی رکابدار بھی ملازم تھا جو بادشاہ

Private Life of an Eastern King ؀

کے لیے نہایت لذیذ ولایتی کھانے اور مٹھائیاں تیار کرتا تھا۔ شاہی کوچبان بھی آئرلینڈ کا باشندہ تھا مگر آخرالذکر دونوں ملازموں کو مصاحبت شاہ کا شرف حاصل نہ تھا۔

بادشاہ زیادہ تر انگریزی لباس کوٹ پتلون، نکٹائی وغیرہ زیب تن کرتے تھے اور ہیٹ یعنی چھجہ دار انگریزی ٹوپی بھی استعمال کرتے تھے۔ دربار میں بھی بجائے مسند کے تخت پر کرسی کے اوپر نشست کرتے تھے۔

منجملہ دیگر لوازمات کے ایک محل بھی ولایتی کیا تھا جس کو "مخدرہ علیا" کا خطاب دیا تھا۔ ولایتی محل کرنے کی مثال اُن کے پدر بزرگوار شاہ زمن غازی الدین حیدر قائم کر چکے تھے جنھوں نے اولاً کرنل عیش کی دختر سے عقد کرکے اُن کو مبارک محل کا خطاب دیا تھا اور بارِ دگر ڈاکٹر شارٹ کی بیٹی سے شادی رچا کر اُن کو نواب سلطان مریم کا خطاب دیا تھا۔

مخدرہ علیا شاہ نصیر الدین حیدر کی انگریز نژاد بیگم مسٹر جارج ہاپکنس والٹرز (Mr. George Hopkins walters) کی بیٹی تھیں جو انگریز سواروں کے ایک دستہ میں نصف تنخواہ پر بحیثیت ایک افسر کے ملازم تھے اور دارالحکومت لکھنؤ میں بخت آزمائی کی نیت سے آئے تھے۔ یہاں اُن سے بیوہ مسز ورہرٹی جو ایک انگریز سوداگر مسٹر کلوڈن کی بیٹی تھیں۔ محبت کے پینگ بڑھے۔ مسٹر ورہرٹی قبل ازیں ایک لڑکا اور ایک لڑکی چھوڑ کر سفر آخرت اختیار کر چکے تھے۔

جب بیوہ مسز ورہرٹی اور مسٹر والٹرز میں رابطہ مودت و موافقت ترقی پذیر ہوا۔ تو دونوں بہ سبب یک جان و دو قالب ہونے کے رشتہ مناکحت میں منسلک ہوئے اور شیر و شکر ہو کر زندگی بسر کرنے لگے۔ اس یک جائی کا نتیجہ ایک لڑکی کی شکل میں نمودار ہوا جو مس والٹرز کے نام سے موسوم ہوئی اس کے بعد مسٹر والٹرز بھی بمقام لکھنؤ رحلت کر گئے اور بیوہ مسز ورہرٹی اپنے بیٹے اور دونوں بیٹیوں کو ساتھ لے کر کانپور چلی گئیں اور وہیں

سکونت اختیار کرلی۔

دونوں لڑکیاں قبول صورت تھیں اور اُن کی ماں اپنی سیم تن نازک بدن اور گلعذار لڑکیوں کا ہاتھ بلا لحاظ رنگ و نسل، مذہب ملت کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں دینا چاہتی تھیں جو بہت زردار ہو اور انھیں عیش چین سے رکھ سکے۔

بخش علی ڈوم جس کا آبائی پیشہ طوائفوں کی سنگت میں طبلہ نوازی تھا مسز والٹرز کے یہاں بطور کوچبان کے ملازم ہو اتھا اُس نے کانپور میں مسز والٹرز سے لگاوٹ کر کے آشنائی کی بناڈالی اور مسز والٹرز کو ترغیب دی کہ اپنی دونوں نازنین اور پری جمال لڑکیوں کو لکھنؤ واپس لے چلیں جہاں اُن کی بہت قدر و منزلت ہوگی اور اُن کے ملنے والے جو شاہ اودھ کے نمک خوار ہیں اُن تک رسائی پیدا کرنے میں ہر امکانی مدد دینگے

جب شاہ نصیر الدین حیدر بعد انتقال اپنے پدر شاہ زمن غازی الدین حیدر ۱۸۲۷ء میں رونق افروز سلطنت ہوئے تو یہ دونوں پری رو اور گل اندام لڑکیاں بادشاہ کو ملاحظہ کرائی گئیں۔ وہ نظر پڑتے ہی مس والٹرز کی زُلف گرہ گیر کے اسیر ہوگئے۔ اُن سے عقد کر کے محلات معلیٰ کے زمرہ میں داخل کرلیا اور "مخدرہ علیا" کا خطاب بھی عطا کیا۔

مخدرہ علیا کے سوتیلے بھائی جوزف والٹرز اور سوتیلی بہن نے بھی مسیحی مذہب ترک کیا اور سب کے سب حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ جوزف والٹرز کا نام "امیر مرزا" رکھا گیا اور سوتیلی بہن کا اسم "اشرف النساء بیگم" قرار دیا گیا اور جس طریقہ سے مخدرہ علیا کی والدہ اور بخش علی اب تک زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ بادشاہ کی نظر میں نہایت ناپسندیدہ تھا اس لیے ان دونوں کا نکاح بھی بموجب شرع اسلام ہو گیا اب بخش علی بخش علی خاں ہو کر مخدرہ علیا کے باپ مشہور ہوئے اور بہت ٹھاٹھ سے امیرانہ زندگی بسر کرنے لگے۔ بادشاہ نے ان سبھوں کیلیے مناسب عملہ کا بھی انتظام کر دیا۔ واقعات مرقومہ بالا بہ نباہ

سفرنامہ کرنل سلیمن (Sleeman) صاحب ریذیڈنٹ اودھ تحریر کیے گئے مگر مولانا نجم الغنی مؤلف تاریخ اودھ نے مخدرۂ علیا کے جو ابتدائی حالات بیان کیے گئے ہیں وہ ان سے کسی قدر مختلف ہیں۔ وہ تحریر کرتے ہیں!۔

"مخدرہ علیا کی صورت بہت معمولی تھی۔ یہ تعلیم یافتہ تھی، زبان انگریزی کے علاوہ اردو فارسی بھی اچھی طرح کھ پڑھ لیتی تھی۔ دونوں بہنیں جب اپنی ماں کے پاس رہتی تھیں تو اپنے گزارہ کے لیے دولت مند شرفا کے زین پوش کارھا کرتی تھیں۔ شکل وصورت دونوں کی واجبی تھی۔ اُس نے اپنی تصویر نصیر الدین حیدر کو بھیجی جو دیکھ کر فریفتہ ہو گئے تخت نشینی کے بعد ماں سمیت طلب کیا اور پچاس ہزار روپے نقد اور لاکھوں کا سامان دے کر مخدرہ علیا خطاب دیا۔ اس کی ماں پہلے بخش علی میراثی سے بیاہی ہوئی تھی۔ جب اُس کی بیٹی بادشاہ کے محل میں داخل ہوئی تو بخش علی ولایتی محل کا باپ مشہور ہوا اور برگشہ میاں گنج میں ولایتی محل کی جاگیر پر مسلط ہو گیا اور اس قدر صاحب امارت و ثروت ہوا کہ اس کی تعزیہ داری کا شہرہ لکھنؤ میں مشہور عام ہو گیا۔ نواب مرزا اسی کی اولاد سے تھے۔

سید کمال الدین حیدر صاحب قیصر التواریخ بھی مخدرہ علیا کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:۔

"شاہ نصیر الدین حیدر کا دوسرا نکاح معرفت بخش علی خاں والد کی چھوٹی بیٹی کا ہوا۔ اُسے خطاب "مخدرہ علیا" ملا۔ میاں گنج، رسول آباد، اُناؤ چھ لاکھ کی جاگیر ملی۔ بخش علی خاں اُن کے باپ مشہور ہوئے خلعت نانرہ نواب ہوئے۔ ناظم جاگیر و دار وغہ ڈیوڑھی ہوئے۔ دینی حالی ظرفی سے بڑا جاہ و حشم دکھایا۔

۸ر اکتوبر ۱۸۲۳ء کو شاہ نصیر الدین حیدر کی تخت نشینی کا سالانہ جشن بڑی دھوم دھام سے ہوا اس روز ایک انگریز خاتون مسز پارکر بھی محل خانہ میں بیگمات شاہی سے ملاقات کرنے گئی تھیں۔ وہ مخدرہ علیا کی نسبت تحریر کرتی ہیں :-

"یہ نئی نویلی ملکہ قریب قریب یوروپین تھیں مگر تاج محل کے مقابلہ میں ان کی رنگت ذرا بھی شوخ نہ تھی میری رائے میں ان کی صورت شکل معمولی ہے مگر مستورات لکھنؤ ان کو بہت حسین و جمیل خیال کرتی ہیں۔ تاج محل سے شادی کے قبل وہ بادشاہ کی بہت چہیتی اور لاڈلی بیوی تھیں۔ ان کی پوشاک بھی تاج محل سے زیادہ شاندار تھی۔ ان کے سر پر ایک مختصر سا تاج پہنے تھیں جس میں گراں بہا ہیرے نصب تھے اور ایک خوشنما ہلال اور کلغی بھی لگی تھی۔ وہ ایک انگریز کی لخت جگر ہیں اور محل خانہ سلطانی میں بود و باش کے لیے ان کو پورا سلیقہ تھا۔ فارسی اور اردو میں بھی وہ بلا تکلف لکھ پڑھ سکتی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ وہ بادشاہ کو انگریزی سکھا رہی ہیں مگر جب میں نے اُن سے انگریزی میں گفتگو شروع کی تو افسوس سے کہا میں یہ زبان بھول گئی اور انگریزی میں جواب نہ دے سکیں۔ میرے خیال میں وہ والدہ محترمہ شاہ نصیر الدین حیدر نواب بادشاہ بیگم سے خائف رہتی ہیں کیونکہ جب میں نے اُن سے دریافت کیا کہ کیا آپ کو زنان خانہ کا قیام اچھا معلوم ہوتا ہے تو انھوں نے بجائے الفاظ میں جواب دینے کے صرف سر کو جنبش دے کر اپنا مافی الضمیر ظاہر کر دیا کہ بالکل نہیں اور ان کے چہرہ پر افسردگی چھا گئی۔ بظاہر اُن کے رنج و غم کا سبب نئے محل سے رشک و حسد معلوم ہوتا ہے کیونکہ گو وہ اور تاج محل ایک ہی کوچ پر بیٹھی تھیں مگر کسی دوسرے سے بات چیت تک کرنا گوارا نہ کی۔"

مخدرہ علیا کے وثیقہ کی صورت یہ ہوئی کہ یکم مارچ ۱۸۲۹ء کو شاہ نصیر الدین حیدر

نے گورنمنٹ انگلشیہ سے ایک معاہدہ کر کے باسٹھ لاکھ چالیس ہزار روپے سکہ چلن بشرح سود پانچ روپیہ فی صدی سالانہ بطور قرض دوام حوالہ کردیے جس کے معاوضہ میں گورنمنٹ انگلشیہ چار بیگمات کو حسب ذیل وثیقے دینے کی پابند ہوئی۔

نواب ملکہ زمانیہ۔ دس ہزار روپے ماہوار
نواب تاج محل ۔ چھ ہزار روپے ماہوار
نواب مخدرہ علیا۔ چھ ہزار روپے ماہوار

نواب زینت النساء دختر ملکہ زمانیہ یعنی نواب سلطان عالیہ بیگم جو نواب ممتاز الدولہ کو منسوب تھیں۔ چار ہزار روپے ماہوار نیز یہ قرار پایا کہ یہ وثیقے دوامی طور پر بیگمات متذکرہ کے ورثا کو ملتے رہیں گے۔ اگر کوئی محل لاوارث ہو تو اس کو اختیار کلی حاصل ہوگا کہ جس کسی کو اور جس غرض و مقصد کے لیے چاہیں وصیت کردیں مگر برٹش گورنمنٹ نے یہ اختیار اپنے قبضہ میں رکھا کہ وہ جب مناسب خیال کرے کسی وارث کو وہ کل رقم ادا کرکے جس کے سود سے وثیقہ ملتا ہے زر گزارہ دینا موقوف کردے۔

بادشاہ نے بماہ جولائی ۱۸۳۷ء زہر خورانی سے انتقال کیا۔ اس سانحہ کے بعد مخدرۂ علیا دولت سرائے سلطانی کی سکونت ترک کرکے اپنی والدہ اور نجش علی خاں کے پاس ریذیڈنسی[1] میں اپنے ذاتی مکان میں منتقل ہو گئیں۔ اور بزمانۂ حیات بادشاہ جو گراں قدر و بیش بہا جواہرات اور دیگر قیمتی سامان انھوں نے جمع کیا تھا وہ بھی اپنے ہمراہ لے گئیں۔ مخدرۂ علیا کے ساتھ اُن کے بھائی امیر مرزا اور اُن کی سوتیلی بہن اشرف النساء بھی رہتی تھیں۔

جب مخدرۂ علیا محل میں داخل ہوئی تھیں تو بادشاہ کو جو چاہت اور محبت

---

[1] احاطہ بیلی گارد

ملکہ زمانی کی تھی اس میں گہن لگ گیا تھا۔ اُس کے بعد جب تاج محل کی نگاہِ ناز کا جادو بادشاہ پر چل گیا تو اس محل کا ستارۂ اقبال بہت تیزی سے چمکا اور بادشاہ کو جو دلی لگاؤ اور رغبت مخدرۂ علیا سے تھی وہ یک قلم کافور ہو گئی چنانچہ موصوفہ آتش رشک حسد سے جلنے لگیں اور انتقامی جذبہ سے مغلوب ہو کر پردہ کے اندر ہی اندر گل کھلانے لگیں۔ اُن کی یہ روش بیوہ ہو جانے کے بعد بھی بدستور قائم رہی۔ ۲۹ ستمبر ۱۸۳۹ء کو مخدرۂ علیا کی ماں نے انتقال کیا اور صحن مکان ریذیڈنسی میں سپردِ خاک کی گئیں ما بعد بخش علی خاں یا تو اشرف النسا سے عقد کر کے یا یوں ہی اُن کے گلشن حسن سے گلچیں کرنے لگے۔ اسی اثنا میں مخدرۂ علیا کے آثار حمل نمودار ہوئے۔ ۹ نومبر ۱۸۴۰ء کو وہ سخت بیمار پڑیں کیونکہ اپنے دامن عصمت کو بے داغ اور پاک و صاف ظاہر کرنے کے لیے انھوں نے بغرض اسقاط حمل کوئی بہت تیز دوا استعمال کی تھی جس کے اثر سے زبان بند ہو گئی اور ایسی غشی اور بیہوشی طاری ہوئی کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہی۔ یہ حالت تین شبانہ روز قائم رہی آخر کار ۱۲ نومبر ۱۸۴۰ء کی شام کو اُن کا طائر روح جسد خاکی سے پرواز کر گیا اور اُن کی لاش بقول سلیمن صاحب ریذیڈنٹ اودھ ریذیڈنسی والے مکان کے صحن میں اُن کی ماں کی قبر کے برابر تہِ خاک کر دی گئی۔ محمد علی شاہ بادشاہ کی خواہش تھی کہ حسن گنج بارہ والی کربلا تعمیر کردہ شاہ نصیر الدین حیدر میں اپنے شوہر کے پہلو میں دفن کی جائیں مگر بعض وجوہ سے یہ خیال ترک کر دیا گیا۔

جس مکان میں بخش علی رہتے تھے وہ بگڑی ہوئی صورت میں احاطۂ ریذیڈنسی کے اندر تا حال موجود ہے۔ یہ مکان نواب آصف الدولہ نے مسٹر ایس، ایم ٹیلر (Taylor) ایک انگریز کو جو بسلسلۂ تجارت لکھنؤ میں مقیم تھے برائے سکونت عطا کیا ۵ جنوری ۱۷۹۶ء کو باجازت نواب موصوف ٹیلر صاحب نے بوساطت مسٹر لمسڈین (Lumsden) ریذیڈنٹ اودھ مکان مذکور مسٹر جارج پرین ڈرگاسٹ کے ہاتھ فروخت کر دیا جنھوں نے

بتاریخ ۲۶ فروری ۱۸۶۳ء اس کو بدست مسٹر جان کلوٹن بیع کردیا جن کا ذکر اوپر آچکا ہے
بعد انتقال مخدرۂ علیا مکان مذکور پر اشرف النساء کا قبضہ رہا جن کو بحکم برٹش
گورنمنٹ مخدرہ علیا کی پنشن اور استردادکہ بھی ملا اور مکان مذکور سے متصل ایک مسجد اور
امام باڑہ یا خود انھوں نے تعمیر کرایا یا اُن کے باتحویل اُس کی تکمیل ہوئی۔

مخدرۂ علیا کا مکان موسومہ "بیگم والی کوٹھی" قلب احاطہ ریذیڈنسی میں واقع
ہے۔ مسٹر جوہانس کے مکان کو جاتے ہوئے لب سڑک اس مکان کا ایک بلند اور عظیم
الشان پھاٹک تھا۔ کوٹھی سیدھی سادھی مگر شاندار یک منزلی عمارت ہے۔ کوئی
آرائشی کام اس میں نہیں بنا ہے۔ کوٹھی میں چند نفیس کشادہ اور بلند کمرے تھے جن میں
بزمانۂ غدر بوجہ محفوظ مقام ہونے کے عورتیں اور بچے رکھے گئے تھے اور بعد غدر اس
میں چند یوروپین افسران مع اپنے متعلقین کے قیام پذیر تھے۔ مگر شرف النساء کی ممانعت
پر کسی نے مسجد میں قدم نہیں رکھا۔ کوٹھی بھی اب غیر مسقف ہے اور قابل سکونت نہیں رہی
امام باڑہ شمال رویہ ہے جس کے دونوں پہلوؤں میں غلام گردش ہے اور جانب مغرب
غلام گردش کی چھت کے ایک حصہ پر امام باڑہ سے متصل ایک نہایت خوش نما اور شاندار
مسجد ہے جس کی ساخت اور گل کاری قابل دید ہے مگر ایک گنبد قدرے منہدم ہوگیا ہے
غدر میں ان عمارتوں کو بھی کافی نقصان پہونچا تھا۔ مسجد کے میناروں اور دروں پر
گولیوں کے ہزاروں نشان چیچک کے داغوں کی طرح نمودار ہیں۔

امام باڑہ میں بعض نقش و نگار اور گل بوٹے نہایت دل کش اور خوشنما بنے ہوئے
ہیں جو اُس زمانے کے معماروں کی استادی اور چابک دستی کا پتہ دیتے ہیں مگر چھتیں
اس کی بھی کھلی پڑی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جیسا خوب صورت نوک پلک سے درست اور
جاذب نظر آرائشی کام اس مسجد اور امام باڑہ میں بنا ہے ویسا ریذیڈنسی کی کسی عمارت
میں نہیں بنا ہے۔

دورانِ ہنگامہ غدر اشرف النساء نے برٹش گورنمنٹ کی قابل قدر خدمات انجام دی تھیں اور کرنل بروس ([illegible]) کو جو اس وقت اودھ میں بعہدۂ انسپکٹر جنرل پولیس فائز تھے لکھنؤ کے حالات سے برابر مطلع کرتی رہتی تھیں

بعد وفات مسٹر والٹر بیوہ وہرٹی اُن کے انتقال کی تاریخ تک کی تنخواہ اور اپنے گزارہ کے لیے دعویدار ہوئیں مگر اُن سے کہا گیا کہ جب تک متوفی کے ساتھ اپنی شادی کی سند نکاح پیش نہ کروگی اس وقت تک تم کو ایک حبہ نہ ملے گا۔ بیوہ وہرٹی سند مطلوبہ پیش کرنے سے قاصر رہیں جس پر اُن کا دعویٰ داخل دفتر کر دیا گیا۔

اشرف النساء اور اُن کے بھائی امیر مرزا بخش علی خاں سے ساتھ رہتے تھے جو مخدرۂ علیا کی دولت و دہش سے جو اشرف النساء کو ملی تھی لکھنؤ اور کان پور میں علیحدہ علیحدہ محلے رکھ کر بہت شان سے امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔

مخدرہ علیا کی وفات پر اُن کی ہمشیرہ اشرف النساء نے ایک وصیت نامہ ریذیڈنٹ کی خدمت میں پیش کرکے ظاہر کیا کہ یہ میری بہن کے تکیہ کے نیچے تقریباً ایک سال سے رکھا ہوا تھا جب اُن کو معلوم ہوا کہ میرا وقت آخر ہے تو اُنھوں نے یہ کہہ کر کہ یہ میری آخری وصیت ہے اس کو میرے حوالہ کر دیا اس وصیت نامہ کی رو سے حسب ذیل اشخاص کو پنشن دلائی گئی تھی۔

نام	رقم		
بخش علی خاں	ایک ہزار روپیہ ماہوار		
علی حسین	۷۵	〃	〃
محمد حسن بھیان	۴۰	〃	〃
مرزا علی	۳۰	〃	〃
مہدی بیگم	۲۰	〃	〃
اکبر	۱۵	〃	〃

میاں سلطان	۱۵	روپیہ	ماہوار
امام بخش	۳	"	"
سید حسین	۳۰	"	"
مشیخ ہینگن	۲۰	"	"
سعدو بیگم	۲۰	"	"
رام دین	۱۲	"	"
سدھاری	۱۵	"	"
اللہ رکھی	۱۵	"	"

اس طرح منجملہ چھ ہزار روپیہ ماہوار کے مبلغ دو ہزار روپیہ ماہوار یعنی ایک ثلث کی پنشن متوسلین کو دیدی گئی تھیں اور باقی ماندہ دو ثلث یعنی چار ہزار روپے ماہوار کی وصیت اپنی بہن اور بھائی کے حق میں کی تھی۔

ریذیڈنٹ نے اس وصیت نامہ کو گورنمنٹ میں پیش کرکے اس کو جعلی ظاہر کیا جس پر اُن کو ہدایت کی گئی کہ یہ دریافت کرکے رپورٹ کریں کہ اشرف النساء اپنی بہن کے متروکہ اور پنشن کی تنہا وارث قرار دی جائیں تو جن لوگوں کو بروئے وصیت پنشن دلائی گئی ہے انھیں کوئی عذر تو نہ ہوگا۔ اگر وہ لوگ رضامند ہوں تو اشرف النساء اپنی ہمشیرہ متوفیہ کی تنہا وارث قرار دیدی جائیں اور وصیت نامہ کالعدم تصور کیا جائے۔

سب نامزدگان کے رضامند ہوجانے پر ریذیڈنٹ کو ہدایت کردی گئی کہ وہ مخدرۂ علیا کی پنشن اشرف النساء کے نام جاری کردیں یا وہ زر اصل ادا کردیں جس کے سود سے پنشن ادا کی جاتی ہے مگر ریذیڈنٹ نے پنشن کو قائم رکھنا زیادہ مناسب خیال کیا اور گورنمنٹ نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا۔

مخدرۂ علیا درحقیقت اولاد جائز نہ تھیں اس لیے اُن کی بہن یا بھائی کو اُن کی

پنشن پانے کا کوئی حق نہ تھا مگر یہ امر ریذیڈنٹ سے پوشیدہ رکھا گیا تھا بلکہ یہ جب سرکاری مراسلات میں بھی انھوں نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ شاید اسی اندیشے نے کہ مخدرۂ علیا کا وارث جائز نہ ہونے کی صورت میں کل پنشن کا روپیہ کربلائے معلیٰ بھیج دیا جائے گا ان لوگوں کو جعلی وصیت نامہ تیار کرنے پر آمادہ کیا تھا اور جیسے ہی گورنمنٹ نے شرف النسا کو حسوفیہ کا وارث تسلیم کر لیا سب دعویدار اپنے اپنے دعووں سے دستبردار ہو گئے

محمد علی شاہ چاہتے تھے کہ یہ روپیہ اودھ میں سڑکوں اور پلوں کی تعمیر میں صرف کیا جائے اور ریذیڈنٹ نے بھی اس رائے کو پسند کیا تھا۔ مگر چوں کہ سرکار انگلیشیہ مخدرۂ علیا کے اولاد ناجائز ہونے کے راز سے بالکل ناواقف تھی اس لیے اس امر پر رضامند نہ ہو سکی

مخدرۂ علیا کے بھائی امیر مرزا خاں کی تعلیم و تربیت بحیثیت ایک شیعہ مسلمان کے ہوئی جو اپنے راسخ العقیدہ مسلمان ہونے پر ہمیشہ فخر و مباہات کرتے تھے۔ موصوف نہایت موٹے تازے تن و توش کے آدمی تھے اسی لیے امیر مرزا خاں "موٹل" کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ اُن کی پہلی کتخدائی نواب نور علی خاں رئیس بلہور اس کی بیٹی الخیرالنسا بیگم عرف بگا صاحبہ ساکن کشمیری محلہ سے ہوئی تھی جو نواب کی ایک بیوی احمدی بیگم کے بطن سے تھیں دوسری شادی ناظمہ صاحبہ سے ہوئی جو ایک رئیس کی زوجہ مطلقہ تھیں۔ بعدۂ باسی کڑھی میں اُبال آیا اور موصوف نے بڑھاپے میں جوانی کا ایسا جوش و خروش دکھایا یعنی ایک زن بازاری جان دی جان کے رُخ زیبا اور ناز و انداز پر دم دینے لگے وہ بھی دل رُبائی میں طاق اور عشوہ گری میں مشاق تھی اُس نے بھی قدم دے دے کر نقد دل کے علاوہ لاکھوں روپے کے جواہرات اُن سے اینٹھ لیے بالآخر دونوں سلک نکاح میں منسلک ہو گئے مگر کوئی اولاد ان بیویوں سے نہ ہوئی۔ نواب محمد کاظم علی خاں

ا Biographical Sketches by J. W. Beale

عرف منجھو صاحب ساکن گھسیاری منڈی لکھنؤ جو عرصہ تک آنریری مجسٹریٹ رہے انھیں
نواب امیر مرزا خاں کے چشم و چراغ ایک دوسری اسامی سے تھے۔ ولایتی محل کے انتقال پر
جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اُن کی ہمشیرہ اشرف النساء بیگم قابض جائداد متوفیہ ہوئیں
اور علاوہ لاکھوں روپے کے جواہرات کے جائداد منقولہ و غیر منقولہ اور ایک کروڑ چالیس
لاکھ روپیہ کے تمسکات (Government securities) بھی اُن کے ہاتھ
لگے اُن کی وفات پر امیر مرزا خاں متروکہ متوفیہ پر بحیثیت وارث قابض ہوئے جنھوں
نے اپنی بد شوقیوں اور شاہ خرچیوں سے تقریباً کل دولت اُڑا دی اور چھیاسٹھ سال تک
باغ دنیا کے مزے لوٹنے کے بعد بتاریخ ۱ جنوری [illegible] اس عالم فانی سے رخصت
ہو گئے اور کربلا میتا لکھنؤ میں تہ خاک ابدی نیند کے مزے لے رہے ہیں۔ جادی جان
نیز موصوف کے دیگر اعزہ و رشتہ دار بھی اسی کربلا میں دفن ہیں جو اب بہت بوسیدہ حالت
میں ہے بخش علی کو اپنی حشمت اور رسوخ کی بدولت چند سال کے لیے ضلع رسول آباد کا
ٹھیکہ بھی ہاتھ آ گیا تھا جس کے درمیان ہو کر کان پور سے لکھنؤ کو سڑک آتی ہے۔ مگر
بقول حضرت سعدی ؎

خوئے بد در طبیعتے کہ نشست
نرود جز بغیر مرگ از دست

باوجود کثیر دولت و ثروت کے وہ پھر بھی اپنے ہتھکنڈوں سے باز نہ آئے۔ اُن
کے جتھے کے افراد سڑک رسول آباد پر مسافروں اور راہگیروں کے ساتھ نہایت بیدردی
اور سنگدلی سے لوٹ مار کیا کرتے تھے اور ہر قسم کے ظلم اور زیادتیوں کے مرتکب ہوتے
تھے اسی لیے یہ سڑک اُس زمانے میں بہت مخدوش اور پُر خطر ہو گئی تھی۔ شاید ہی کوئی
دن ایسا گزرتا ہو جب اُس پر قتل و غارتگری کی کوئی واردات نہ ہوتی ہو۔
جب یہ امر پایہ ثبوت کو پہونچ گیا کہ بخش علی کا بھی ان انسانیت سوز کارروائیوں

میں دخل اور لگاؤ ہے اور وہ کئی خوں خوار اور بے رحم رہزنوں اور لٹیروں سے ساز باز کیے ہوئے ہیں جو شارع عام پر استحصال بالجبر کے مرتکب ہوتے ہیں اور معصوم و بے گناہ مسافروں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگتے ہیں تو اُن سے ٹھیکہ نکال لیا گیا جس پر وہ کئی مہینے شہر میں روپوش رہے بالآخر بحکم ریذیڈنٹ سرحدی پولیس کے سرگرم اور بیدار مغز سپرنٹنڈنٹ لفٹننٹ ڈنیسٹن ([illegible]) نے بماہ اکتوبر ۱۸۴۹ء انھیں نہایت ہوشیاری سے گرفتار کر کے مقدمہ چلایا اور سرکار شاہ اودھ سلطان عالم واجد علی شاہ سے دو ہزار روپے بھی بطور انعام گرفتار کنندگان کو عطا کیے گئے اور یہ ثابت ہو جانے پر کہ ان جابرانہ اور ظالمانہ کارروائیوں میں بخش علی کا بھی لگاؤ ہے جو خفیہ طور پر قزاقوں اور ڈاکوؤں سے میل رکھتے ہیں۔ اُن کو بحکم عدالت سزائے قید بھگتنا پڑی نیز حکم ہوا کہ جو سامان اُن کے ساتھیوں نے مسافروں سے زبردستی چھین لیا ہے اُس کو واپس کریں یا اُس کا معاوضہ ادا کریں۔ خانہ تلاشی پر اُن کے عشرت کدہ سے بہت سی شکیل و خوب رو شادی شدہ و ناکتخدا لڑکیاں بھی برآمد ہوئیں جن کو سڑک پر گزرتے وقت اُنھوں نے اُن کے والدین یا خاوندوں سے بزور قوت چھین کر داخل حرم کر لیا تھا۔ یہ سب لڑکیاں اپنے اپنے گھروں کو پہونچا دی گئیں اور اُن کو مناسب معاوضہ بھی دیا گیا۔ بخش علی کی سزایابی کے بعد یہ سڑک بالکل محفوظ ہو گئی اور لوگ بے خوف و خطر اس پر آنے جانے لگے۔ مختصر یہ کہ نہ وہ لوگ رہے نہ اُن کی دولت و ثروت باقی رہی فقط اُن کے نیک و بد اعمال کا افسانہ دنیا میں رہ گیا۔

قدسیہ محل

قدسیہ[1] محل قوم کی ترک دفا بیگ خاں کی نواسی تھیں۔ جن کا کٹرہ لکھنؤ میں جھوائی ٹولہ
سے متصل کٹرہ دفا بیگ خاں کے نام سے اب تک مشہور ہے۔ دفا بیگ خاں کے دو بیٹے
نوروز بیگ خاں اور ہمایوں بیگ خاں اور ایک لڑکی تھی جو اسی خاندان کے ایک شخص
امان اللہ بیگ کو منسوب تھی۔ اس لڑکی کی دو لڑکیاں تھیں بڑی لڑکی کا نام بسم اللہ خانم اور
چھوٹی کا نازک ادا[2] تھا۔ بسم اللہ خانم کی شادی مرزا بجّو بیگ یا بقول دیگر میر حیدر دستار بند
ساکن کٹرہ دفا بیگ سے اور نازک ادا کی ایک شخص نواب دولہا سے ہوئی تھی۔ بسم اللہ
خانم کے دو لڑکے اس شوہر سے ہوئے ایک تو کمسنی میں سات آٹھ برس کا ہو کر داغ جدائی
دے گیا۔ دوسرا امداد الدین کے سایہ عاطفت میں پرورش پاتا رہا۔ ایک مرتبہ بسم اللہ خانم
اور اُن کے شوہر میں کسی بات پر جھڑپ ہو گئی جس پر اُنھوں نے بادشاہ بیگم صاحب محل
خاص شاہ غازی الدین حیدر کی سرکار میں پیشخدمتوں میں ملازمت کر لی پھر تاج محل
کے یہاں نوکری کی اُس کے بعد نواب ملکہ زمانیہ کی خدمت میں رہیں۔ اُن[3] آخری ملازمت
کے زمانہ میں ایک روز سہ پہر کو شاہ نصیر الدین حیدر ملکہ زمانیہ کے محل میں تشریف
لائے اور آب خاصہ طلب کیا۔ بسم اللہ خانم نے طلائی تھالی جوڑ میں پیش کیا۔ جب
بادشاہ نوش کر چکے تو تھوڑا سا بچا ہوا پانی ازراہ مذاقاً بسم اللہ خانم کے گھونگھٹ پر چھڑک دیا
جو بادشاہ سے صرف کا نام پردہ کیے ہوئے تھیں۔ اُس پر بسم اللہ خانم نے بھی تھوڑا سا پانی
جو چھلک کر تھالی میں گر گیا تھا۔ بادشاہ کی پوشاک پر چھڑک دیا۔ بادشاہ نے تیکھے ہو کر

---

[1] تاریخ نجمی حصہ چہارم [2] دربار اودھ و قیصر التواریخ [3] سیاحت نامہ مسٹر سلیمن
ریذیڈنٹ اودھ بزبان انگریزی

فرمایا تمہیں ایں جانب پر پانی چھڑکنے کی کیسے جرأت ہوئی۔ بسم اللہ خانم نے جواب دیا۔ "جب کم عمر بچے آپس میں چہلیں کرتے ہیں تو چھوٹائی بڑائی کا خیال نہیں کرتے۔" دوسرے روز بادشاہ پھر محل میں تشریف لائے اور پانی مانگا تو ملکہ زمانیہ نے بدگمان ہو کر ایک دوسری خادمہ کو پانی پیش کرنے کا حکم دیا۔

بسم اللہ خانم کی شوخ مزاجی اور حُسن و جمال پر بادشاہ ایسے ریجھے کہ دامنِ صبر ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ چنانچہ منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں نے بادشاہ کا میلانِ طبع ان کی طرف دیکھ کر وہ حکمت کی کہ موصوفہ کا شوہر گرفتاری کے خوف و دہشت سے طلاق دے کر کانپور بھاگ گیا۔ بادشاہ تو پہلے ہی سے موصوفہ کی محبت میں متوالے ہو رہے تھے۔ اب بےچینی اور بےقراری اتنی بڑھی کہ زمانہ عدت ختم ہونے کا بھی انتظار نہ کیا۔ اور تخت نشینی کے چوتھے سال بتاریخ ۱۷ دسمبر سنہ ۱۸۳۱ء[لہ] اندر میعاد عدت موصوفہ سے عقد کر کے اُن کو مخدرۂ زمان مہد عظمیٰ بلقیس دوراں ملکہ آفاق قدسیہ سلطان مریم بانو بیگم صاحبہ خطاب عطا فرمایا۔ مگر عوام میں وہ صرف قدسیہ محل یا قدسیہ بیگم کے نام سے مشہور رہیں۔ شاید اسی عقد فاسد کی وجہ سے منشی عبدالاحد مصنف وقائع دل پذیر نے تحریر کیا ہے کہ شاہ نصیر الدین حیدر اور قدسیہ محل میں تعلق ناجائز تھا۔

بوقت نکاح بادشاہ کا سن تخمیناً ۲۸ سال کا اور بیگم کی عمر تخمیناً ۲۱ برس کی تھی۔ کل محلات نے قدسیہ محل کو نذریں پیش کیں مگر ملکہ زمانیہ اور مخدرہ علیا ولایتی محل کسی طرح رضامند نہ ہوئیں۔ مرزا حسن بیگ جو سواروں میں نوکر تھے۔ اب وہ قدسیہ محل کے باپ مشہور ہوئے اور نواب مظفر الدولہ خطاب پایا۔

لہ تاریخ اودھ حصہ چہارم

اُن کے کبر و نخوت اور بانکپن کی کچھ حد نہ تھی۔ دوسروں کا کیا ذکر خود نواب معین الدولہ اُن سے ہزار منت و خوشامد سے گفتگو کے خواستگار رہتے تھے۔ بہار علی خاں قدسیہ بیگم کی محل سرا کے نواب ناظر مقرر ہوئے جب اُن سے اور حسین علی خاں بکبوہ سے خاص در دولت پر جھگڑا ہو گیا تو حسین علی خاں کی اہانت کے لیے اُن کے سر سے پگڑی اُتاری گئی اور شہر بدر ہو کر کانپور چلے گئے۔ بہار علی خاں نوکری سے موقوف ہوئے اور اُن کے بجائے یاقوت علی خاں نواب ناظر ہوئے۔ کلثوم بیگم (آتو جی) قدسیہ محل کو لکھنا پڑھنا سکھانے پر مامور ہوئیں۔ یہ بہت تیز طبیعت پڑھی لکھی دست قلم تھیں محل میں اُن کا اختیار کلی اور بڑا دور دورہ ہوا۔ قدسیہ محل اُن کو بہت قدر و منزلت سے رکھتیں اُن کا لڑکا قادر علی خاں داروغہ ڈیوڑھی ہوا۔ اُس کا بھی طوطی بولنے لگا۔ جھوائی ٹولہ کے حکیم حاذق محمد یعقوب صاحب اس محل کے طبیب خاص مقرر ہوئے۔ سید کمال الدین حیدر جنھوں نے بعد میں قیصر التواریخ لکھی۔ قدسیہ بیگم کے بیٹے میرن صاحب کے جو شو ہر اولی سے تھے اتالیق مقرر ہوئے۔ ان خاص اشخاص کے علاوہ بہت سی مغلانیاں مصاحبین، اپیش خدمتیں، حلبہ والیاں، چوٹی گوندھنے والیاں۔ گانے والیاں۔ توشہ خانہ والیاں۔ کہاریاں۔ بھرلیں۔ چھٹی تو لینیاں۔ محلداریں ایک سے ایک طرحدار اور دستبعداد عملہ میں ملازم ہوئیں۔ خاص مصاحبوں میں نوروزی خانم۔ درباری بیگم حسینی بیگم، اماسی بیگم اور موتی خانم تھیں۔ اور توشہ خانہ کی داروغہ عباسی خانم تھیں نصیب جاگنے کے بعد بیگم کے بیسیوں قرابت دار غیب سے پیدا ہونے لگے۔ پہلے تنگدستی اور عسرت کے زمانہ میں جو اُن کے سایہ سے بھاگتے تھے وہ اب انھیں کے زیر سایہ پناہ لینے لگے۔ اُن کی غربا پروری کے ڈنکے بجے۔ خیر خانوازی چار دانگ عالم میں مشہور ہوئی

لہ زنوز الاطبا

فیاضی اور سخاوت میں تو حاتم کو بھی مات کرتی تھی ۔ روپیہ اشرفی کو کنکر پتھر سمجھتی تھیں ۔ اُن کی داد و دہش کا دروازہ سب کے لیے کھلا تھا ۔ مستحق و غیر مستحق کا امتیاز نہ تھا ۔ جس کو دیا اس کے حوصلہ سے زیادہ دیا ۔ اُن کی سرکار سے کوئی خالی ہاتھ اور نامراد نہ پھرا ۔

قدسیہ محل کی شکل و صورت کے بارے میں مؤرخین میں قدرے اختلاف ہے ۔ مولانا نجم الغنی مؤلف تاریخ اودھ ناقل ہیں کہ بسم اللہ کی صورت ایسی دلآویز نہ تھی مگر سلیمن صاحب ریذیڈنٹ اودھ کے نزدیک وہ صاحب حسن و جمال تھیں ۔ منشی عبدالاحد مصنف وقائع دل پذیر بھی بیان کرتے ہیں کہ بیگم دولت حسن سے مالا مال تھیں مگر مصنف دربار اودھ رقم طراز ہیں کہ اُن کا رنگ سبزہ تھا جس میں ایک قسم کی تیرگی تھی ۔ مگر اُن کی زبان میں سحر تھا ۔ شیریں کلام ایسی تھیں کہ گفتگو کرتے وقت منہ سے پھول جھڑتے تھے ۔ طبیعت ایسی شگفتہ پائی تھی کہ روتے کو ہنسا دیں ۔ شوخی و طراری تو مزاج کے خاص جوہر تھے ۔ اپنی عالی ظرفی ، بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی سے بادشاہ کے دل کو بالکل موہ لیا تھا اور وہ ہر وقت زانو سے زانو ملائے بیگم کے پاس بیٹھے رہتے تھے ۔ دم بھر کی جدائی بھی شاق تھی ۔ قدسیہ محل کا رنگ ایسا جما کہ اُن کے سامنے دوسرے محلات کا رنگ پھیکا پڑ گیا ۔ بوجہ اپنے اثر و اقتدار کے موصوفہ امور سلطنت میں بھی دخل دینے لگی تھیں ۔ نواب روشن الدولہ کی منصب وزارت پر تقرری انھیں کی سفارش کا نتیجہ تھی ۔ پہلے بادشاہ کا عندیہ لینے کو انھوں نے روشن الدولہ کی عرضی بوقت شب تخلیہ میں بادشاہ کو دی ۔ اُس کو بادشاہ نے پڑھ کر شمع کی لو میں جلا دیا ۔ بیگم نے سمجھ لیا کہ خاموشی نیم رضا ہے ۔ اور روشن الدولہ وزارت عظمیٰ پر فائز ہو گئے ۔

مشہور ہے کہ بسم اللہ خانم کے لڑکپن میں ایک روز میر اکبر علی جو سواروں میں نوکر تھے اور علم سامُدرک کے بڑے ماہر تھے اُن کے کسی بزرگ سے ملنے آئے ۔ جو اس وقت کسی کام میں مکان کے اندر مشغول تھے ۔ بسم اللہ خانم ڈیوڑھی میں میر صاحب کے لیے گلوریاں لے کر آئیں ۔ میر صاحب نے دفع الوقتی کے لیے بسم اللہ خانم کے ہاتھ کی لکیریں

دیکھنے لگے اتنی دیر میں اور لوگ بھی آ گئے۔ جب میر صاحب بسم اللہ خانم کا ہاتھ دیکھ چکے تو بڑے ادب سے لڑکی کو آداب و تسلیمات بجا لائے اور کہا جب خدا آپ کو ملکہ کا مرتبہ عطا کرے تو اس غریب سید کو نہ بھولیے گا۔ جملہ حاضرین میر صاحب کی پیشین گوئی کو بے بنیاد سمجھ کر مذاق اُڑانے لگے مگر بات صحیح ثابت ہوئی اور بسم اللہ خانم کو عُروج ہوا تو اُنھوں نے سب سے پہلے میر اکبر علی کو بلوا کر دس ہزار روپیہ اُن کی نذر کیے۔

ثقات لکھنؤ راوی ہیں کہ جو رنگریز قدسیہ محل کے کپڑے رنگتا تھا۔ وہ اپنی لڑکی کی شادی کے لیے بیگم سے کچھ مالی امداد کا طالب ہوا جب اُس سے دریافت کیا گیا کہ کتنی رقم درکار ہے تو اُس نے صرف کئی سو روپیہ بتلائے۔ اس پر حکم ہوا کہ آج سے ہماری ڈیوڑھی پر نہ آنا۔ رنگریز ہکا بکا ہو گیا کہ آخر مجھ سے کون ایسی خطا ہو گئی جس کی پاداش میں یہ سزا تجویز ہوئی چنانچہ جب عفوِ تقصیر کا خواستگار ہوا تو معلوم ہوا کہ بیگم صاحب اس وجہ سے ناخوش ہو گئی ہیں کہ اگر ہم سے مدد چاہی تھی تو اتنی حقیر رقم کیوں مانگی اور کئی ہزار روپے اس کو عطا کیے جس سے اُس نے پختہ مکان بنوا لیا اور لڑکی کی شادی بھی ناچ رنگ کے ساتھ بہت دھوم دھام سے کی۔

قدسیہ محل[1] نہایت حوصلہ مند اور فراخ دل تھیں۔ داد و دہش میں وہ اودھ کی تمام شاہی بیگمات پر سبقت لے گئی تھیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے بادشاہ سے کہا کہ میں نے پشمینہ خانہ نہیں دیکھا ہے۔ بادشاہ نے اہل کاروں کو حکم دے دیا کہ پشمینہ کا کل سامان بیگم صاحب کو دکھا دیا جاوے۔ کارپردازوں نے ایک مکان میں ستر لاکھ روپیہ کا پشمینہ از قسم توشک لحاف، فرش، مسند تکیہ، وغیرہ جمع کر دیا۔ بیگم نے آن کی آن میں کل سامان اپنی خادماؤں کو تقسیم کر دیا۔ ایک چیز بھی اپنے لیے نہ رکھی۔ اسی طرح کے بہت سے اُن کے واقعات ہیں[2]۔ ایک مرتبہ ایک لاکھ روپے کے سو توڑے محل میں لا کر رکھے گئے۔ شمار کرنے پر

---

[1] ہندوستان اودھ بزبان فارسی مرتبہ راجہ درگا پرشاد سندیلوی۔ [2] سوانح عمری مرزا محمد کاظم

ایک توڑا کم نکلا اُس کی ہر طرف تلاش ہونے لگی۔ ایک پیش خدمت نے وہ توڑا پائخانہ میں رکھا ہوا پایا مگر نواب بیگم نے کہا۔ یہ توڑا اب شامل نہ کرنا ورنہ کل توڑے نجس ہو جائیں گے۔ چنانچہ فوراً حلال خور کو بلوا کر وہ توڑا اُسی وقت اُس کے حوالے کر دیا گیا

چودہ سو روپیہ یومیہ کا اُن کے باورچی خانے کا خرچ تھا اس کے علاوہ مطبخ شاہی سے سینکڑوں خوان لذیذ کھانوں کے اُن کے لیے آتے تھے۔ وہ بھی تقسیم کر دیئے جاتے تھے۔

قیمتی قیمتی پوشاکیں[1] جو بیگم زیب بدن کرتی تھیں۔ وہ ایک روز پہننے کے بعد کسی ملازمہ کو دے دی جاتی تھیں انھیں دوبارہ استعمال نہیں کرتی تھیں۔ اُس کے علاوہ اُن کی فیاضی اور دریا دلی کی بدولت ہزاروں کنواری لڑکیاں بیاہی گئیں۔ نادر علی خاں جب روز صبح کو موصوفہ کی طرف سے پانچ ہزار روپیہ مومنوں اور مسکینوں کو تقسیم کرا لیتا تھا تب موصوفہ خاصہ تناول کرنے دسترخوان پہ بیٹھتی تھیں۔

جاڑے[2] کے موسم میں لاکھ سوا لاکھ روپے جیبنے کی رضائیاں بنتی تھیں گرمیوں میں اُن کی ہوا نظر نہ آتی تھی کہ کدھر اڑ گئیں۔

قدسیہ محل[3] نے کہا اشرفیوں کا ڈھیر نہیں دیکھا محل میں فوراً انبار ہو گیا۔ بادشاہ نے کہا اگر لطف دیکھنا چاہو تو لٹا دو اور وہ سب لٹا دی گئیں۔

ایک روز[3] ایک نوشاہ اپنی نو عروس کو رخصت کرائے لیے جاتا تھا۔ برات دولت سرائے سلطانی کے پاس سے ہو کر گزری جس میں روشن چوکی اور دوسرے باجے بج رہے تھے۔ مگر دُلہن کے ساتھ جہیز کا سامان نہ تھا۔ بیگم نے باجہ کی آواز سن کر دریافت کیا " یہ باجہ کیسا بج رہا ہے " معلوم ہوا دولہا اپنی دُلہن کو رخصت کرائے لیے جاتا ہے

---

۱ سوانح عمری مرزا محمد کاظم۔ ۲ فسانۂ عبرت نوشتہ مرزا رجب علی بیگ سرور

۳ بوستانِ اودھ از راجہ درگا پرشاد سندیلوی۔

حکم ہوا دولہن کو ابھی حاضر کرو۔ چوبدار و ملازمین شاہی دوڑے گئے اور دولہن کی پینس ڈیوڑھی میں لے آئے۔ وہاں سے خادمائیں دولہن کو گود میں اُٹھا کر بیگم کے روبرو لے گئیں بیگم نے دولہن کا منھ دیکھا۔ صورت شکل پسند آئی اور فوراً اپنے زیورات کا صندوقچہ منگا کر دُلہن کو جڑاؤ زیوروں سے لاد دیا۔ اور محل کی خادماؤں کو حکم دیا "خبردار بغیر رونمائی دیئے کوئی دُلہن کا منھ نہ دیکھے۔" محل میں کئی سو عورتیں ملازم تھیں سبھوں نے حسب حیثیت کوئی نہ کوئی چیز سونے یا چاندی کی دے کر دُلہن کا منھ دیکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آن کی آن میں زیورات کا ایک انبار لگ گیا۔ اُس کے بعد دُلہن رخصت کر دی گئی اور وہ سب زیورات بھی اُس کے ساتھ کر دیے گئے۔ بیگم کی ایک ادنیٰ نظرِ عنایت سے تھوڑی ہی دیر میں دُلہن مالا مال ہو کر سسرال پہنچی۔

بھری برسات کا زمانہ تھا ایک روز موسلادھار پانی برس رہا تھا۔ بیگم بالائی منزل کے ایک کمرہ میں تشریف رکھتی تھیں۔ وہیں خاصہ طلب کیا کئی خادمائیں کھانے کے خوان سر پر رکھے زینہ پر چڑھ رہی تھیں کہ دفعتاً سب پیر پھسل کر آگے پیچھے گر پڑیں اور کل کھانا بھی برباد ہو گیا۔ بیگم نے یہ واقعہ دیکھ کر قہقہہ مارا اور خندہ پیشانی سے کہا "کچھ ہرج نہیں ہے تم خوف نہ کھاؤ" اور اپنے پاس بلا کر سب کو چوٹ کھانے پر انعام دیا

باوجود[1] اس قدر اُلفت و محبت کے بادشاہ اور قدسیہ محل میں بعض اوقات شکر رنجی بھی ہو جاتی تھی مگر ۱۲ اگست ۱۸۴۳ء کو بقول مسٹر سلیمن (Sleeman) بادشاہ پر ایسا غصہ سوار ہوا کہ وہ جامہ ہی سے باہر ہو گئے۔ اور اُسی حالت میں فرطِ غیض سے فرمایا کہ میں نے تجھ کو خاک سے پاک کیا۔ اور ادنیٰ حالت سے ملکہ کے رتبہ کو پہونچا دیا۔ مگر اب انشاء اللہ پھر اُنھیں وہاں ہی کو پہنچا دوں گا۔ قدسیہ محل کی طبع نازک اس تلخ کلامی کے بارِ گراں کی متحمل نہ ہو سکی۔ اور اپنے نقشِ حیات کو مٹانے کی غرض سے سنکھیا

کھالی۔ زہر اپنا کام کر گیا۔ بادشاہ بعد کو بہت متاسف ہوئے اور ہر قسم کا علاج معالجہ بھی کیا مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ پہلے تو وہ اُن کے کرب و بے چینی کو ملاحظہ کرتے رہے مگر جب دم لبوں پر آگیا اور جان بچنے کی کوئی اُمید نہ رہی تو بدحواس ہو کے گھوڑ دوڑ کے میدان والی جگہ والی کوٹھی کی عمارت میں چلے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ بیگم کو یہ فکر دامنگیر تھی کہ وارث تاج و تخت اُنھیں کے بطن کا ہو اسی دُھن میں اُنھوں نے اپنے پہلے شوہر کو جس نے طلاق دے دی تھی زنانی پوشاک پہنوا کر کئی بار محل میں بُلوایا تھا جس کی اطلاع بادشاہ کو ہوگئی تھی۔ اور یہی واقعہ اس قضیہ کا اصلی سبب تھا۔

مولانا نجم الغنی نے اس واقعہ کو زیادہ تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے وہ تحریر کرتے ہیں:۔

"بادشاہ کو فرزند کی تمنا ہزار دل سے تھی۔ آتو جی قدسیہ محل کی دل سے ہواخواہ تھی اُس نے اس بات پر چاہا کہ نطفہ کسی اور شخص کا بادشاہ کے نام سے بہم پہنچایا جائے۔ لیکن قدسیہ محل کسی دوسرے شخص کی ملاقات پر رضامند نہ ہوئی۔ ناچار مرزا بُجھو بیگ پہلے شوہر کو جو طلاق دے کر لکھنؤ سے بخوف گرفتاری کانپور کی طرف بھاگ گیا تھا۔ روپیہ کی طمع دے کر ہزار فریب سے طلب کیا۔ وہ ناکہ شہر تک آیا تو یہاں سے ایک مقفل صندوق میں اور آلات تحائف کے ساتھ محل سرا میں پہنچا اور کئی مہینے تک پردہ میں اپنا کام کیا۔ خدا کے حکم سے قدسیہ محل حاملہ ہوئی لیکن انگا چاند خیریت سے نہیں گزرا یعنی وہ حمل فرزند ہفت ماہ کا ساقط ہوا اور یہ خبر تمام محل میں پھیل گئی کہ پیاری محل داروغہ نے ملکہ زمانی کے کہنے سے سحر وجادو کے زور سے یہ حمل ساقط کرا دیا۔ بادشاہ کو بہت غم و اندوہ ہوا۔ اور اس محلدارنی کا شمشیر غضب سے کام تمام کر دیا۔ جب یہ نازک تدبیر نتا نہ

سلہ تاریخ اودھ حصہ چہارم

سے خالی گیا تو آتو جی نے دوسری مرتبہ پھر مجّو بیگ کو کانپور سے بلا کر اس خیال سے کہ در پردہ راز فاش نہ ہو رنگ ترغیب جمایا جس سے بادشاہ نے دل کشا کوٹھی میں قیام اختیار کیا۔ یہاں آتش فرزند سینہ میں مشتعل تھی اور کلام جگر سوز یاس و ملال کے زبان پر جاری تھے۔ ایک دن ایک خواص نے بادشاہ سے اپنی حفظ جان اور حرمت کی سوگند لے کر پچھلی ساری کیفیت گوش گزار کردی اور کہا کہ نورن دائی اس معاملہ سے بخوبی واقف ہے یہ بات سنتے ہی بادشاہ کو بہت غصہ آیا۔ اور قدسیہ کی طرف سے بالکل توجہ پھیرلی اور نورن کی طلبی کے لیے حکم دیا۔ فتنہ پردازوں نے جب دیکھا کہ اب راز فاش ہوتا ہے اُس دائی کو پوشیدہ لکھنؤ سے کان پور کی طرف بھگا دیا اور وہ ہاتھ نہ آئی دریائے غم کی موج بادشاہ کے سر سے گزر گئی اور بادشاہ کو بے انتہا پریشانی اور اندوہ پیدا ہوا ایک دن قدسیہ محل نے بادشاہ کی خلوت گاہ میں آنے کا ارادہ کیا" ارشاد ہوا کہ " اب مجھ کو تجھ سے کوئی کام نہیں اور نہ تجھ کو مجھ سے کوئی سروکار باقی ہے" قدسیہ محل نے عرض کیا کہ " جناب کی طبیعت میری طرف سے پھر گئی۔ دشمنوں کے کہنے سے ناشاد پر آمادہ ہیں اور حیلہ ڈھونڈھ کر میری خرابی کے درپے ہیں۔ حضور غور فرمالیں کہ میں عمدہ بیگم کی طرح نہیں ہوں کہ اول تو اُس کو اپنی خدمت میں سرفراز کیا۔ بعدہٗ ایک رکیک جرم پر بے حرمت کیا اور سر کے بال منڈا کر بھنگی کے حوالے کر دیا۔ میں نے حضور سے ہنجیہ یہ بات عرض کی ہے کہ خدا نخواستہ جس دن بندگانِ حضور کی نگاہ میری طرف سے پھر گی اُسی روز زندہ نہ رہوں گی۔ نقد حیات نذر محبت کر دوں گی یہ سُن کر بادشاہ نے بے تکلف جواب دیا کہ " میں نے کسی کو یہاں جان نثار راہِ

وہی تھی زہر منگوا کر نورزی خانم نے ایک جلیس کے پاس رکھوا دیا اور اسی دن غسل آخری کر کے پوشاک بدل کر جان دینے پر آمادہ ہوئی۔ پچاس ہزار روپے اور کچھ ہزار اشرفیاں توشہ خانہ میں موجود تھیں میرن صاحب بیٹے کو جو شوہر اول سے تھا بلا کر چار ہزار روپے دیئے۔ کمال محبت کے ساتھ سینے سے لگایا اور پیار کر کے رونے لگی اور زرِ نقد اپنے نوکروں میں تقسیم کیا اور ریاض حسرت کی باتیں کرنے لگی۔ خواصوں نے بہت فہمائش کی لیکن اجل دامنگیر تھی وہ پیا ہوا زہر نورزی کے ہاتھ سے لے کر کھا لیا۔ ۲۱ اگست ۱۸۳۴ء کو یہ واقعہ ظہور میں آیا۔ جب یہ جانکاہ معاملہ محل میں گزرا۔ اور استفراغ شروع ہوا بادشاہ کو کیفیت اس کی کھلی۔ مرزا علی وغیرہ طبیبوں اور روشن الدولہ کو طلب فرمایا لیکن قدسیہ محل نے جو جان پر کھیل چکی تھی معالجہ قبول نہ کیا۔ غرض اسی کشمکش میں اس کا کام تمام ہو گیا۔ بادشاہ نے اس غم میں سیاہ رنگ کا ماتمی لباس پہنا۔ لذت دنیا سے کنارہ کیا۔ ایک مدت تک آنکھ شیشۂ ساغر سے نہ ملائی بلکہ فرطِ رنج و الم میں یہ کلمات زبان سے سرزد ہوتے تھے کہ "مجھ کو کسی کی صورت اچھی نہیں معلوم ہوتی" غرض زندگی بھر اس غم کے ہاتھوں سے نجات نہ پائی۔ مرزا کمال الدین حیدر مصنف قیصر التواریخ نے جو قدسیہ محل کے شوہر اول کے بیٹے میرن صاحب کے اتالیق بھی تھے۔ قدسیہ محل کے زہر کھانے پر اپنی کتاب میں کچھ مزید روشنی ڈالی ہے چنانچہ اُن کا بیان بھی ضروری سمجھ کر درج ذیل کیا جاتا ہے۔"

سبب انتقال نواب قدسیہ محل صاحبہ مختصر یہ ہے کہ حضرت شاہِ زماں کو باوجود حالتِ نعش و بیخودی کے اُن کی خیارہ کبیرِ عظیم سے موافق قرآن کے راجہ غالب جنگ مہتمم دیوان کے کہنے سننے سے کچھ کچھ مظنہ فاسد مرتکز خاطر اقدس ہونے لگا اور

عقدہ مرحل مصنوعی ترین صدق ہوگیا۔ اور بہت سی پردہ دری ہونے لگی اس جہت سے
بے اعتنائی ظاہری شروع ہوئی۔ چنانچہ بعد انقضائے ایام چہلم امام علیہ السلام بیگم
صاحبہ بنا بر تفریح طبع موسم برسات میں کوٹھی دل کشا میں تشریف لے گئیں اُس کے
بعد تقضا نے بادشاہ باغ میں اپنا مہمان کیا۔ چار دن تک وہاں بھی افسردگی رہی غرض
کا غنچہ دل نہ کھلا۔ ایک رات بادشاہ از راہ چشم نمائی بارہ دری میں راحت فرما
کے صبح کو بیگم صاحبہ کے پاس تشریف لائے۔ زبان ہزار شکوہ شکایت سے کھلی کہ "میری
شرط اول محکمات سے بجائے بائے بسم اللہ یہی تھی جسے حضرت نے منسوخ کیا۔ میں نے
عرض کیا تھا کہ اگر اس کے خلاف ہوگا یہ صورت مصحف ہستی سے مٹ جائے گی۔ معلوم ہوا
کہ حضرت کی خوشی اسی میں ہے" فرمایا" ہم نے کسی کو ایسا ثابت قدم نہیں دیکھا" عرض کی"
اب حضرت دیکھ لیں گے" غرض ان باتوں سے کبیدہ خاطر ہو کر بادشاہ باہر تشریف لائے
بیگم صاحبہ از بسکہ سخن پرور۔ غیور۔ نازک مزاج تھیں۔ بس ہو بہو سنکھیا جو کبھی جینے
پیشتر سے روز بد کے واسطے ذیب ہیکل گلو کر رکھا تھا نوش جان فرمایا اُس پر آب شورہ
لیموں کا شربت مرگ سمجھ کر پیا۔ اُس کے بعد چند دانے بھنے ہوئے بھٹے کے کھائے
دفعتاً قے خونی آئی۔ اس میں کئی ٹکڑے کلیجے کے تھے بمجرد اس کے ایک قیامت برپا
ہوئی۔ بادشاہ گھبرا کے تشریف لائے۔ بمجرد دیکھنے بادشاہ کے بیگم صاحبہ نے نگہ
حسرت و یاس کے برسائے بادشاہ نے فرمایا" اے بازی باد تمام آخر تم نے اپنا کام
تمام کیا" عرض کی" جو کہتی تھی وہ کر دکھایا" یہ کہہ کر رونے لگیں۔ حضرت زیادہ بیقرار
ہوئے۔ آخر گھبرا کر بے صبری سے چکر والی کوٹھی چھٹ تشریف لے گئے۔ اسی وقت
لباس سیاہ پہنا اور ترک لذات و راحت و آرام کیا۔ سب ارکان دولت بھی سیاہ
پوش ہوئے دوسرا محرم مصنوعی ہوا۔ نواب روشن الدولہ حکیم مرزا علی خاں اور
اطبائے حاذق جمع ہوئے ہزاروں تدبیریں کیں مگر جان نہ بچی ۲۱ راگست ۱۸۴۳ء

کو چوبیس برس کے سن میں انتقال کیا۔

جب بیگم کی کشتیٔ حیات زہر ہلاہل کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگئی تو جنازہ شب کے وقت بڑے احتشام و جلوس شاہی کے ساتھ اُٹھایا گیا۔ تمام عمائدین سلطنت و اقربائے شاہی سیاہ ماتمی لباس میں ملبوس شریک جنازہ تھے۔ بادشاہ باغ نوحہ و گریہ سے ماتم کدہ بن گیا۔ لاش کربلائے نوتعمیر بادشاہ واقع ارادت نگر میں دفن کی گئی۔ جملہ ملازمین وارا کین سلطنت نے سیاہ پوش ہوکر چہلم تک سوگ منایا۔

بروز سیوم بادشاہ اپنی کربلا تشریف لے گئے۔ اُن کی ہمدردی و غمگساری میں جنرل لو (General Low) ریذیڈنٹ اودھ بھی ہمراہ گئے۔ ریذیڈنٹ باہر رواق میں ٹھہرے رہے۔ بادشاہ اندرون روضہ تشریف لے گئے۔ قبر پر فاتحہ پڑھا فرط رنج والم سے آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ مرحومہ کا کل عملہ حسب سابق برقرار رہا جب صبح کو بادشاہ آرام خاص سے بیدار ہوتے تھے تو مرحومہ کی خادمائیں اور آتو جی بادشاہ کا دل بہلانے کی کوشش کرتی تھیں مگر اُن پر مطلق اثر نہ ہوتا تھا بالکل غم کی مورت بنے بیٹھے رہتے تھے اور اُسی طرح دربار میں تشریف لے جاتے تھے۔

کپتان مقبول الدولہ حسام الملک مرزا محمد مہدی علیخاں ثابت جنگ متخلص بہ قبولؔ نے تاریخ وفات کہی جو اُن کی لوح قبر پر کندہ ہے۔

حضرت قدسیہ بانو بیگم عالی صفات حیف از دار فنا سوئے جناں ناگاہ رفت۔

تیرہ و تار از زمیں تا چرخ شد در ماتمش	گوئیا زیر زمیں از اوج گردوں ماہ رفت
سال تاریخ وفاتش زد قلم کلک قبول	حیف بلقیسے ز پہلوئے سلیماں جاہ رفت
	۱۲۵۰ھ

مؤلف محتشم خوانی نے بھی مندرجہ ذیل تاریخ کہی۔

کیا گردش فلک نے صدمہ دیا ہے اعظم	عالم نے جس کے غم میں پہنا لباس ماتم
دار فنا سے اس نے صد حیف کی ہے رحلت	دست سخا سے جس کے تھا کامیاب عالم

ے۱ قیصر التواریخ

بے تاب و بے قراری باگریہ آہ و زاری ہر اک میں میں نے پایا اُس دن بچشم پُرنم
پندرھویں پنجشنبہ ماہ ربیع ثانی سنہ ایک ہزار دو صد پنجاہ تھے مسلّم
سالِ وفات اُس پر پوچھا تو بولا ہاتف کہ خُلد کو سدھاری قدسیہ بانو بیگم

اسی سال قدسیہ محل کے بیٹے نے بھی رحلت کی جو شہزادلی سے تھا۔ قبولؔ نے اس کی وفات کی بھی تاریخ لکھی۔

فرزند قدسیہ محل یافت وفات محزون و حزیں شدند از یں غم کہ رمہ
سالش ہم معنوی و صوری است قبولؔ بست و پنجم و محرم و یکشنبہ

بادشاہ[1] کا پیمانہ دل قدسیہ محل کی اُلفت سے اتنا لبریز ہوگیا تھا کہ اس میں کسی دوسری بیگم کی چاہت و محبّت کی مطلق گنجائش نہ رہی تھی۔ حتیٰ کہ تاج محل کی ایسی حسین و جمیل بیگم کی طرف سے بھی جن کو بادشاہ اب تک دم ہوش چاہتے تھے۔ بے التفاتی اور لاپروائی ہو گئی۔ قدسیہ بیگم کے سامنے اب دوسری بیگمیں ایسی ہی تھیں جیسی کہ جگمگاتے ہوئے چودھویں کے چاند کے روبرو جھلملاتے ہوئے تارے۔ چنانچہ اُن کی خواہش تھی کہ قدسیہ بیگم کا وثیقہ بھی دوسری بیگموں سے زیادہ رقم کا ہو۔ اس لیے انھوں نے بیس لاکھ روپے خزانہ ریذیڈنسی میں جمع کر دیے۔ تاکہ اس کے سُود سے بیس ہزار روپیہ ماہوار کا وثیقہ بیگم کے نام جاری کر دیا جاوے مگر جب موصوفہ نے خود اپنے ہاتھوں اپنا رشتۂ حیات منقطع کر دیا تو وہ رقم خزانۂ شاہی میں واپس کر دی گئی۔ قدسیہ بیگم کی جاگیر آٹھ پرگنہ جات (۱) موہرانواں (۲) گوشائیں گنج (۳) بجنور (۴) کانتھہ (۵) سرسینڈی (۶) واسومہ (۷) پرسینڈی (۸) کاکوری میں تھی۔ لالہ جیندن لال ساہوکار ان پرگنوں میں خزانچی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ بیگم نے ایک امام باڑہ چھتر منزل

۱؎ قیصر التواریخ جلد اول ۲؎ افضل التواریخ مرتبہ منشی رام سہائے تمنا ۳؎ قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۸۳

کے قریب بنوایا تھا جو غدر کے قیامت خیز زمانہ میں منہدم ہو گیا۔

نصیر الدین حیدر نے محل مذکور کو تاریخ عقد سے یوم انتقال تک مبلغ دو کروڑ روپیہ میوہ خوری کے لیے دیے تھے۔ اس میں آللے تللے خرچ کرنے کے بعد مبلغ چوالیس لاکھ روپے بچ رہے تھے مگر بادشاہ نے اس رقم کو ہاتھ نہ لگایا۔ ۲۰ راکتوبر ۱۸۲۷ء کو بوقت تخت نشینی شاہ نصیر الدین حیدر مبلغ دس کروڑ روپیہ نواب سعادت علی خاں کے جمع کیے ہوئے خزانہ میں موجود تھے مگر جب موصوف نے ۷ رجولائی ۱۸۳۷ء کو رحلت کی تو صرف ستر لاکھ روپے خزانہ سے برآمد ہوئے جن میں چوالیس لاکھ روپیہ کی رقم قدسیہ بیگم والی بھی شامل تھی۔

بادشاہ اور قدسیہ بیگم کا ساتھ صرف پونے تین برس رہا۔ اس مدت میں تنہا موصوفہ نے تین کروڑ روپے خرچ کیے۔ ابتدا میں تو قدسیہ محل اور بادشاہ کی سوتیلی ماں بادشاہ بیگم میں خوب میل جول رہا مگر آخر میں جھگڑے بکھیڑے پیدا ہو گئے۔ اور ایک دوسرے کو نہایت اہانت آمیز باتیں کہنے لگیں۔ جب قدسیہ محل عالم بالا کو سدھاریں اور بادشاہ بیگم کو معلوم ہوا کہ بادشاہ اس لیلیٰ متوفیہ کے فراق میں مجنوں ہو رہے ہیں تو اُن کی ماتا جوش میں آئی اور چاہا کہ اپنے ہجران نصیب بیٹے کے غمزدہ دل پر تسلی و تشفی کا پھایا رکھیں چنانچہ وہ بغرض تعزیت روزمرہ کی معمولی پوشاک میں تشریف لے گئیں اور بادشاہ کی دلداری کے لیے سمجھایا کہ "تمھاری جان سلامت ہے تو بہت سی حور طلعت دپری پیکر عورتیں تمھاری خدمت میں آئیں گی" مگر ان کلمات سے بادشاہ اور زخم برجراحت ہوئے اور شکایتاً کہا "آپ نے ماتمی لباس کیوں نہیں پہنا۔ اگر آپ کو مجھ سے محبت ہوتی تو ضرور شریک ماتم ہوتیں" پھر طنزاً کہا اور خود آپ کو میر فضل علی (اعتماد الدولہ جو بادشاہ بیگم کی سفارش سے وزیر اعظم ہو گئے تھے) کے انتقال کا کیا کم صدمہ ہوا تھا" بیگم صاحب نے جواب دیا "میں سیاہ پوشاک پہن کر صرف سید الشہدا

حضرت امام حسین علیہ السلام کا سوگ مناتی ہوں اور کسی کے لیے نہیں پہنتی، میں جانتی ہوں کہ سلطنت کے بدخواہوں نے تم کو میری طرف سے منحرف کر دیا ہے" یہ گفتگو کر کے بادشاہ بیگم آزردہ ہو کر چلی آئیں۔ مابعد بادشاہ نے بیگم صاحب کے ساتھ نار وا برتاؤ کیا اور اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے حکم نادری جاری کر دیا کہ وہ محل مسکونہ خالی کر کے کسی دوسرے مکان میں چلی جائیں مگر بیگم صاحبہ بھی نہایت پامردی سے مقابلہ پہ ڈٹ گئیں۔ آخر کار جب اُن کے ساتھ توہین آمیز و انسانیت سوز برتاؤ کیا گیا بلکہ خوں ریزی تک کی نوبت پہونچ گئی تو مجبوراً ناکہ شہر کے ابر الماس باغ میں منتقل ہو گئیں۔ اور بادشاہ کے انتقال تک وہیں مقیم رہیں۔

قدسیہ بیگم کی مغلانی نورودزی خانم جس نے بیس لاکھ روپیہ جمع کیے تھے گرفتار ہو گئی۔ اُسے کل رقم اندوختہ حاضر کرنے کا حکم ہوا۔ اُس نے بارسوخ درباریوں کو درمیان میں ڈال کر پانچ لاکھ روپے اس شرط پہ دینے کا وعدہ کیا کہ وہ کوشش کر کے انگریزی عملداری میں گنگا پار پہونچا دیں۔ چنانچہ اُن میں جو زیادہ باثر اور سنجیدہ مزاج تھے انھوں نے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ "مناسب ہوگا کہ مغلانی کو ملک محروسہ سے خارج کر دینے پر قناعت کی جاوے۔ اول تو اس سبب سے کہ وہ ایک مشہور ساحرہ ہے۔ دوم اس وجہ سے کہ وہ مرحومہ سے بیحد مانوس تھی اور ہم جاں نثاروں کو اندیشہ ہے کہ کہیں وہ جادو کے زور سے جہاں پناہ کی روح کو بھی مرحومہ کی روح کے پاس عالم ارواح میں نہ پہونچا دے"۔ یہ کلام سن کر بادشاہ بہت برافروختہ ہوئے اور فرمایا" میں جادوگرنیوں سے بالکل ڈرتا نہیں ہوں اور اس کا اُڑایا ہوا بیس لاکھ وصول کر کے ہی دم لوں گا"۔ مگر اُسی روز شب کو انھوں نے خواب میں دیکھا کہ قدسیہ محل اُن کی آرام گاہ میں داخل ہو کر مسہری کی طرف بڑھیں۔ اُن کا چہرہ معمول سے بھی کہیں زیادہ نورانی اور بشاش تھا۔ پھر منھ بادشاہ

سفرنامہ اودھ سلیمن صاحب ریذیڈنٹ اودھ

کی طرف کیے ہوئے آہستہ آہستہ واپس ہوئیں اور ہاتھ کے اشارہ سے اُن کو بُلانے لگیں اسی وقت بادشاہ کی آنکھ کھُل گئی۔ انھوں نے پریشان ہو کر حکم دیدیا کہ مغلانی کو فوراً گنگا پار کانپور بھیجدیا جائے۔ اُس کو پانچ لاکھ روپے نذر باریوں کی نذر کرنا پڑے اور تقریباً پندرہ لاکھ روپے کی رقم اپنے ہمراہ لے گئی۔ مگر اُس کے بعد کچھ پتہ نہ چلا کہ اس کا کیا حشر ہوا۔ چالیسویں کے دن بادشاہ تن تنہا تشریف لے گئے اور بیگم کی قبر پر فاتحہ پڑھکر بہت دیر تک روتے رہے۔ بعد ازاں باہر خیمہ میں آکر ماتمی لباس تبدیل کیا۔ چار مہینے کئی دن گزرنے کے بعد مرحومہ کے عملہ کو تنخواہ دے کر موقوف کر دیا۔ بیگم کی ماں اپنے نواسہ میراں صاحب کو لے کر جو پہلے شوہر سے تھا اپنے مکان محلہ کرپل وارڈ نمبر غلام حسین میں چلی گئیں آنو جی اور قادر علی خاں داروغہ وغیرہ مالا مال ہو رہے تھے۔ یہ لوگ نے دے کر نواب روشن الدولہ کی حمایت سے بچ گئے۔ اس طرح پر اگلی مسرت و شادمانی کا عبرت خیز اور حسرت ناک انجام ہوا۔

کنگا محل

شاہ اودھ سلیمان جاہ نصیرالدین حیدر اپنی ایک بیگم نواب قدسیہ محل کو بے انتہا چاہتے تھے مگر جب انھوں نے ۲۱ اگست ۱۸۳۴ء کو بوجوہ زہر کھا کر اپنی جان گنوادی تو بادشاہ کے اضطراب و بے چینی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ فرح بخش کی سکونت ترک کر کے وہ کبھی دولت خانہ آصفی میں قیام کرتے کبھی قصر دلکشا میں، مگر طبیعت ہر دم ملول و افسردہ رہتی تھی، نہ محفل میں دل بہلتا تھا، نہ ویرانے میں قرار آتا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر رفقاء و مصاحبین اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کو شہر کی خاک چھاننے لگے کہ جہاں سے بھی ممکن ہو مرحومہ کی شکل و شمائل کی کوئی عورت ڈھونڈ نکالیں تاکہ

(۱) تاریخ اودھ

بادشاہ کی اشک شوئی ہو۔ اور قدسیہ محل کے غم کی پھانس دل سے نکل جائے۔

شروع میں بادشاہ نے خیال کیا کہ قدسیہ محل کی ایک چھوٹی بہن نازک ادا نامی اور بھی ہے جو نواب دولہا کو منسوب ہے، اور جب کہ دونوں بہنوں نے ایک ہی کوکھ میں پیر پھیلائے تو ایک ہی شاخ کے دو پھول اور ایک ہی سیپ کے دو موتی کہاں تک ہم رنگ و ہم صفت نہ ہوں گے۔ اسی لیے ہوا خواہوں نے اس کے لیے بہت ہاتھ پیر مارے۔ مگر اس نے اپنے غریب اور محبوب شوہر کو فرمانروائے وقت پر ترجیح دی۔ اور کسی طرح اس کی جدائی گوارا نہ کی۔ معاملات نے یہاں تک طول کھینچا کہ اس کے شوہر نواب دولہا کو لکھنؤ سے میاں گنج بھیج کر زیر حراست کر دیا گیا۔ اور فتح الدولہ محمد رضا برق اس کے ہمراہ گئے تاکہ سمجھا بجھا کر اس کو بیوی سے کنارہ کشی کرنے پر آمادہ کریں۔ کئی مہینے کے بعد جناب مولوی سید محمد صاحب سلطان العلماء کے حقیقی بھائی میر سید علی بھی نواب روشن الدولہ وزیر اعلیٰ کی طرف سے نواب دولہا کو سمجھانے کی غرض سے تشریف لے گئے[1] اور بہزار جد و جہد دُرِ مقصود حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور نواب دولہا نے صیغہ طلاق جاری کر دیا۔

ادھر نازک ادا پر یہ مصیبت نازل ہوئی کہ اس کے انکار پر اس کو ایک مکان میں نظر بند کر کے چوکی پہرہ بٹھا دیا گیا مگر اس سختی سے بھی اس کا نشہ نہ اترا اور ایک روز موقع پا کر وہ قید سے نکل گئی اور کانپور میں اپنے شوہر سے جا ملی۔ صاحب "دربار اودھ"[2] بیان کرتے ہیں کہ نازک ادا کے فرار میں نواب روشن الدولہ کا ہاتھ تھا، اور طلاق سے پہلے ہی نواب دولہا کو یقین دلا دیا گیا تھا کہ تمہاری بیوی بہت جلد رہا ہو کر تم تک پہنچ جائے گی۔

نازک ادا کے غائب ہو جانے سے بادشاہ کی کاوشوں اور کاہشوں میں اور اضافہ ہو گیا، مگر چونکہ اس معاملہ میں روشن الدولہ کا قدم درمیان تھا اس لیے اصل راز کا پتہ نہ چل سکا

[1] تاریخ اودھ [2] تبصرۃ التواریخ جلد اول

بادشاہ یہی سمجھے کہ جو کچھ ہوا وہ نواب دولہا کی چالاکی سے ہوا تاہم انھوں نے لکھنؤ کا ایک ایک کونہ ڈھونڈھوایا اور جب انھیں نازک ادا کی طرف سے بالکل مایوسی ہو گئی تو پھر قدسیہ محل کی ہم شکل کی تلاش شروع کر دی۔

بہت سی لڑکیاں بادشاہ کو ملاحظہ کرائی گئیں۔ مگر نظرِ انتخاب سے سب محروم رہیں کیونکہ اگر بادشاہ کو کسی کا حسن و جمال پسند آتا تھا تو وہ سادہ مزاج ہوتی تھی اور اگر کسی میں شوخی و طرّاری پائی جاتی تو وہ دل کشی اور رعنائی سے معرّا ہوتی۔ آخر ایک روز موقع پاکر روشن الدولہ نے باتوں باتوں میں اپنے ایک عزیز قریب کی لڑکی کا ذکر بادشاہ سے چھیڑا۔ بلکہ موصوف[۱] کو پردہ کی آڑ سے دکھا بھی دیا۔

صاحبِ تاریخ اودھ[۲] نے ان واقعات کا تذکرہ کسی قدر تفصیل سے کیا ہے وہ لکھتے ہیں" روشن الدولہ نے اب دوسری تجویز یہ کی کہ قدسیہ بیگم کے چہلم کے بعد اعلیٰ حضرت کا نکاح کسی ناکتخدا لڑکی سے ہو جائے تاکہ موصوف کا غم غلط ہو۔ لیکن اس کام کو بذاتِ خود انجام دینا چاہا۔ تاکہ اُن کی گرم بازاری میں اور چار چاند لگ جائیں چنانچہ اُنھوں نے ایک روز بادشاہ کو دعوت کے حیلے سے اپنے مکان پر بلوایا اور زنان خانہ میں جہاں خواتین کا ہجوم تھا اپنے اہل و عیال کو نظر گزرانے کو پیش کیا اور مرزا باقر علی خاں سابق چکلہ دار رودہلی کھنڈ کی لڑکی بادشاہ کو دکھادی۔ اس لڑکی کا رنگ سُرخ و سفید، جلد باریک، آنکھیں بڑی بڑی ہونٹ پتلے، اور چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن تھا۔ بادشاہ کی طبیعت اُس کی طرف فوراً مائل ہو گئی اور اس کے خواستگار ہوئے۔ مگر روشن الدولہ نے عرض کیا کہ یہ لڑکی بڑی عالی خاندان ہے۔ اگر طبیعت مبارک اُس کی طرف رجوع ہے تو اُس کے باپ کو شرفا کے طریقہ پر راضی کرنا چاہیے اور جس طرح سلاطین ماضیہ اپنے جاں نثاروں کے ساتھ پیش آتے تھے اسی طرح عقد شرعی کر کے خدمتِ مبارک میں سرفرازی بخشی جائے

---

[۱] تبصرۃ التواریخ جلد اول [۲] تاریخ اودھ جلد چہارم از مولانا نجم الغنی

یہ صورت اُس کے والدین کی عزت کا موجب ہو گی، اور شادی میں عذر کی گنجائش بھی نہ رہے گی۔ بادشاہ نے روشن الدولہ کی عرض قبول فرمائی اور شادی کے سرانجام کے لیے ارشاد کیا۔

یہ لڑکی مرزا باقر علی خاں کی نورِ نظر اور مرزا حسین علی خاں سابق چکلہ دار کٹہر (روہیل کھنڈ) کی پوتی تھی۔ مرزا باقر علی خاں کو نواب روشن الدولہ کی سگی بہن گمانی خانم منسوب تھیں۔ جن سے باقر علی خاں کے صرف ایک بیٹا محمد علی خاں (سراج الدولہ) اور ایک لڑکی قمر طلعت بیگم تھی۔ بالفاظِ دیگر یہ نواب روشن الدولہ کی سگی بھانجی تھی۔
بادشاہ کی خواستگاری کے بعد روشن الدولہ نے اپنے بہنوئی مرزا باقر علیخاں سے اس طرح تذکرہ کیا کہ کسی مشاطہ نے آپ کی بیٹی کا ذکر اعلیٰ حضرت تک پہونچایا ہے وہ اُس سے عقد کے خواہاں ہیں اگر منظور ہو تو اس کار خیر میں کوئی مضائقہ نہیں انھوں نے جواب دیا میں غریب آدمی ہوں. اہلِ دنیا یہی کہیں گے کہ کام لالچ سے کیا گیا ہے۔ علاوہ اس کے بادشاہ کے سینکڑوں محل ہیں۔ تین یوم رغبت کر کے خواص پورہ میں داخل کر دیں گے۔ میری تمام عمر رسوائی ہوتی رہے گی۔ اور لڑکی الگ کہے گی کہ اباجان نے جان بوجھ کر مجھ کو ڈبو دیا۔ تیسرے یہ کہ میں مفلس وہ بادشاہ "چھوٹا گھر اور بڑا سمدھیانا" والی مثل ہو جائے گی۔ بھلا اُن کے مقابلے میں مجھ سے کیا ہو سکے گا، اگر تمام اثاث البیت فروخت کر کے کچھ انتظام کر بھی لوں تب بھی یہی حکم ہو گا کہ کوئی دکیل نکاح کے لیے چلا جائے۔ اس صورت میں تمام عمر بدنامی رہے گی کہ فلاں شخص نے اپنی بیٹی بطریق سریتہ دے دی۔ اور میری بیٹی کی پھر کبھی قدر و منزلت نہ ہو گی مگر روشن الدولہ نے انھیں شیشے میں اُتارا اور رضامند کر کے بادشاہ کے حضور میں عرض کیا کہ لڑکی کے باپ راضی ہیں مگر اس امر کے اُمیدوار ہیں کہ حضور سر پر سہرا باندھ کر مع اُمرا و اعزا اُن کے مکان پر تشریف لے جائیں۔ خانہ زاد کو اس امر میں کسی قدر دقت محسوس ہوئی۔

مگر میں نے بھی ایسی اُتش لگائی کہ مرزا الاحباب ہو گئے۔ میں نے اُن سے کہا کیا مضائقہ۔ حضرت بہ نفسِ نفیس تشریف لائیں گے مگر اُنکی شان کے موافق جہیز بھی ہونا چاہیے۔ وہ سمجھ گئے کہ کم سے کم دس بارہ لاکھ روپے صرف ہوں گے۔ آخر مجبور ہو کر خاموش ہو گئے۔ اُن کے باقی سوال میں نے قبول کر لیے اور جہیز کا بار اپنے سر لے لیا۔ اب اس لڑکی کو اپنے مکان پر مانجھے بٹھاؤں گا اور شادی کے تمام مراسم بھی ادا کروں گا۔ حضرت کوئی تاریخ سعید قرار دے کر اور سہرا باندھ کر، ریذیڈنٹ اور تمام اُمرا، اور رشتہ داروں کو ساتھ لے کر نوبت و نقارہ کے ساتھ تشریف لے جائیں اور اس امر میں کوئی مضائقہ نہیں۔ آخر وہ بھی حضور ہی کا مکان ہے۔ بادشاہ نے قبول فرمایا۔ نواب نے سب سامانِ نوعروسی تیار کیا۔

مانجھا لڑکی والوں کی طرف سے بڑے طمطراق سے بھیجا گیا۔ جس کے جلوس کا نقشہ مصنّف دربارِ اودھ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

" دو گھڑی دن رہے درِ دولت (دولت خانہ آصفی) سے روشن الدولہ کی کوٹھی تک لاکھوں آدمیوں کا مجمع تھا مکانوں کی چھتیں اور کمرے مردوں اور عورتوں سے معمور تھے درِ دولت پر بھی ارا کینِ سلطنت کا مع حواشی ایک کثیر مجمع تھا۔ یہ لوگ نہایت زرق برق لباس پہنے مصروفِ انتظام تھے۔ زنانی ڈیوڑھی پر ہزاروں فینسوں سے سواریاں اُتر رہی کہاریاں خواجہ سرا دوڑ دوڑ کے سواریوں کے اُتارنے کا اہتمام کر رہے تھے قریب شام مانجھے کے آنے کی اطلاع ہوئی۔ بادشاہ نے درِ دولت سے برآمد ہو کر پھاٹک کے بالائی کمرے میں مانجھے کا جلوس دیکھنے کے لیے قیام کیا۔ بالاخانہ بہت بلند مقام تھا اور یہاں سے دور تک نظر جاتی تھی۔ بادشاہ کے بیٹھنے کے تھوڑی دیر بعد نشان کا ہاتھی نظر آیا۔ اس ہاتھی پر مہاوت کے علاوہ ایک اور شخص بیٹھا تھا۔ جس کے ہاتھ میں نشان تھا۔ جس کا پٹکہ نہایت بیش قیمت کارچوبی اور جڑاؤ کا کام تھا، اور علم کی جگہ

ایک آفتاب نما گیند سونے کا لگا ہوا تھا۔ اس ہاتھی کے بعد دو ڈھائی سو ہاتھیوں کی قطار تھی جن میں سے پہلے چند ہاتھیوں پر ماہی مراتب تھا جو شہنشاہ دہلی نے نواب اودھ کو بطور اعزاز کے بخشا تھا۔ باقی ہاتھیوں پر لوگ سوار تھے اور ہر ایک ہاتھی پر گنگا جمنی ہودے کسے ہوئے تھے۔ اُن ہاتھیوں کے بعد قندھاریوں کا رسالہ تھا۔ اس کے پیچھے دو ویسی رسالے تھے۔ رسالوں کے بعد اختری نادری پلٹنیں تھیں۔ ہر پلٹن کے ساتھ اُس کا جنگی باجا بجتا جاتا تھا۔ پلٹنوں کے پیچھے متعدد تخت رواں تھے اور ان پر شہر کی نامی کسبیاں مجرا کرتی چلی جاتی تھیں۔ اُن کے بعد مصنوعی آرائش کے ہزاروں تخت تھے اُن کے بعد مختلف قسم کے باجے تھے۔ جن کی نغمہ سرائی سے کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی تھی۔ جب یہ ہلڑ بھی ختم ہوا تو تمام شہر کے سوانگیوں کے تخت گزرنا شروع ہوئے۔ کسی تخت پر لیلیٰ مجنوں۔ کسی پر شیریں فرہاد اور کسی پر وامق وعذرا کا سوانگ تھا۔ کسی پر بے سر لاش اور کسی پر تھالی میں سر دھرا تھا جو باتیں کرتا جاتا تھا۔ بہت سے سوانگیے تمام جسم پر سفیدہ ملے مونڈھوں پر بیٹھے سیفیں نگلتے تھے۔ کوئی منھ سے اتنا بڑا گولا اگلتا جو منھ اچھی طرح کھولنے سے بھی دانتوں میں اٹکتا تھا۔ کوئی دانت سے بچہ کر دیگ اُٹھاتا تھا جس میں ایک آدمی بھی کھڑا ہوتا تھا۔ کوئی سموچی بوتلیں چباتا جاتا تھا۔ کوئی چار چار پانچ پانچ سیفیں نگل کے سیفوں کے دستوں میں پانی بھرے ہوئے گھڑے لٹکائے ہوئے تھا۔ الغرض ان تختوں کے ساتھ عوام تماشائیوں کا بہت بڑا ہجوم تھا۔ ان تختوں کے بعد ایک سنہری چوکی پر جس پر نہایت اعلیٰ قسم کی سُرخ مخمل منڈھی ہوئی تھی اور نہایت بیش قیمت کام بنا ہوا تھا۔ ایک طلائی لوٹا اور کٹورا رکھا ہوا تھا۔ دونوں چیزیں تاروں سے چوکی کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں۔ چوکی کے گرد سینکڑوں چوبدار نقرئی طلائی عصا ہاتھوں میں لیے سلطانی بانات کی وردیاں پہنے ہٹو بچو کرتے چلے جاتے تھے۔ چوبداروں کے پیچھے ہزاروں خوان جن میں ہنڈیاں

بھری ہوئی تھیں مزدوروں نے سروں پر تھے۔ اُن کے بعد دو من دالوں کی طرف
کی عورتوں کی ہزاروں نینیں تھیں جن کے ساتھ بانکی مہریاں ریشمی لنگے پہنے تیل پانی
سے درست نینس کا ایک کونہ پکڑے ساتھ ساتھ دوڑی چلی جاتی تھیں۔

بادشاہ نے معمولی مراسم کے خلاف اس شادی میں نہایت عجلت کی۔ جب دن
مانجھا آیا اُس کے صرف ایک دن بعد ادھر سے ساچق گئی۔ پھر اُس کے دوسرے دن
اُدھر سے مہندی آئی۔ جس کے دوسرے دن بادشاہ بیاہنے کو گئے۔ بادشاہ کا دل جوش
تو اُن جھگڑوں میں پڑنے کی بالکل اجازت نہ دیتا تھا۔ مگر چونکہ وزیر دولہن کے سگے
ماموں تھے اس لیے وہ چاہتے تھے کہ کسی بات میں ہیٹی نہ ہونے پائے اور صرف یہی وجہ
اس شادی میں اتنی دھوم دھام کی۔

اس کتخدائی کے مصارف کے بارے میں مصنف "دربار اودھ" اظہار خیال
کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اودھ کے رنگیلے بادشاہ کی شادی نے لکھنؤ میں ایک عجیب دھوم
دھام پیدا کر دی۔ نواب سعادت علی خاں نے جس جز رسی اور انتظام سے خزانہ
معمور کیا تھا۔ اُن کے جانشینوں نے ویسے ہی فضول اور بیہودہ کاموں میں اُسے
اُڑانا شروع کیا۔ اس شادی میں اسراف کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رہا۔ یہ بات عام طور
سے مشہور تھی کہ شاہ حال کی شادی جس شان و شوکت اور عظم و شان سے ہوئی ہے کسی
اگلے حکمراں کی ایسی شادی نہیں ہوئی۔ الغرض یہ شادی لکھنؤ کی تاریخ میں اپنے اسراف
اور فضول خرچی کی وجہ سے بہت نمایاں شہرت کے قابل سمجھی گئی۔

ابتدائی رسوم ادا ہو چکنے کے بعد بتاریخ ۱۳ رجب ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۵ء
بروز ولادت حضرت علی علیہ السلام محفل شاہانہ آراستہ ہوئی۔ بادشاہ کے عزیز و اقارب
و عمائدین و اراکین سلطنت جنرل لو صاحب ریذیڈنٹ اودھ اور بہت سے صاحبان
والا شان اور ولایت کی عالی مرتبت خواتین بھی شریک بزم طرب تھیں۔ جنرل لو صاحب

سے کمال اتحاد اور خصوصیت سے اپنے ہاتھ سے شاہ کے فرقِ مبارک پر موتیوں اور پھولوں کے سہرے باندھے۔ بادشاہ نے اپنے دستِ مبارک سے ایک طلائی زرتار لگی ہوئی گلوری پلیٹ میں رکھ کر اُن کو عنایت فرمائی۔ صاحب نے بہت تکلف سے بے کر نوش کی غرض یہ صحبت بھی یادگارِ زمانہ ہوئی اور جب بادشاہ سہرا باندھے ہوئے محل سرا میں داخل ہوئے اور دُلہن کے پاس بیٹھے تو جملہ رسومِ شادی ادا کی گئیں بلکہ اس شادی میں ایسی رسمیں بھی ادا کی گئیں جو بادشاہ کی کسی شادی میں ادا نہ ہوئی تھیں۔ بعدازاں صبح کے سہانے وقت اپنی نوعروس کو مع سامانِ جہیز جو حسبِ بیان نواب روشن الدولہ چودہ لاکھ روپے کا تھا۔ دولت خانۂ قدیم نواب آصف الدولہ میں سہرے جلوے سے بیاہ کر لائے۔ سلامی کی توپیں سر ہوئیں۔ دُلہن کو بادشاہ جہاں "ممتاز الدہر" خطاب اور کئی لاکھ روپے کے مرصّع زیورات مثل چھپکا نتھ و بنیا اور ہاتھوں کے گلابی ہیرے جڑے ہوئے کڑے عنایت کیے۔

چوتھی چالے کی رسمیں ادا ہونے کے بعد بادشاہ نے حکم دیا کہ ہماری تمام بیگمات نئی دولہن کو نذریں گزرانیں۔ کیونکہ ہماری جو پہلے شادی ہوئی تھی وہ والدین کی مرضی سے ہوئی تھی اور یہ شادی ہم نے خود اپنی پسند سے کی ہے۔ اس رشتہ کی بدولت دُلہن کے باپ کو بہت عروج حاصل ہوا۔ اس ڈیوڑھی کے کل انتظامات انھیں کے ہاتھ میں آ گئے۔ اُن کے بیٹے علی محمد خاں نے جو روشن الدولہ کے داماد اور اس نئے محل کے بھائی تھے "سراج الدولہ" کا خطاب اور علاقہ محمدی کی چکلہ داری پائی۔ دونوں باپ بیٹوں کی بیش قرار تنخواہیں بھی سرکار شاہی سے مقرر ہو گئیں۔ شروع میں بادشاہ اس محل کو دتنا عزیز رکھتے تھے کہ کوٹھی فرح بخش سے دولت خانہ آصفی تک آٹھ گھوڑوں کی تیگ گاڑی پر بادشاہ کے ہم پہلو سوار ہوتی تھیں۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد بادشاہ کا دل اُن کی طرف سے کھٹا پڑ گیا۔ سبب یہ تھا کہ بادشاہ حسن وجمال کے ساتھ عورت میں

بے حجابی اور ناز و کرشمہ بھی چاہتے تھے۔ مگر یہ بات پردے میں بیٹھنے والی بہو بیٹیوں میں کہاں۔

ایک دن کار و بار خسروی کے بعد بادشاہ محل میں آرام کرنے کے ارادہ سے آکر مسہری پر بیٹھ گئے اور ممتاز الدہر کا انتظار کرنے لگے۔ وہ بوجہ شرم و لحاظ طلب نہ مانے کی متوقع تھیں کہ یکایک برہم ہو کر دھنیا مہری سے کہا کہ میں بہت عرصے سے بیٹھا ہوا انتظار کر رہا ہوں اور یہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتی۔ دھنیا نے عرض کیا کہ ابھی نئی نویلی ہیں اس لیے شرم کرتی ہیں۔ اس جواب سے اور زیادہ چراغ پا ہوئے اور کہا ہم کو مدت سے معلوم ہے کہ تو نواب سے ملی ہوئی ہے اسی لیے باتیں بناتی ہے۔ یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ دھنیا سمجھی کہ اس وقت بیگم کی بے طرح خبر لیں گے۔ اس لیے اس نے دوڑ کر اُن کی کمر پکڑ لی۔ جب اُنھوں نے خوب زور کیا تو دھنیا زمین پر گر پڑی۔ بادشاہ نے دھنیا کے سینہ پر چڑھ کر اتنا مارا کہ بدن میں کئی جگہ ورم ہو گیا۔ اور چلّا کر کہا بیگم صاحب اس وقت شرم و حیا کو طاق پر رکھیے اور یہاں آکر میری جان بچائیے۔ غرض کہ بیگم دوڑی ہوئی آئیں۔ بادشاہ کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے گئیں اور دھنیا کی گلو خلاصی ہوگئی[۱]۔

علاوہ[۲] اس کے بیگم کی اماں جان جو محل سرائے سلطانی میں اپنی بیٹی کے ہمراہ رہتی تھیں اپنے بھائی روشن الدولہ کی بالکل ضد واقع ہوئی تھیں۔ حالاں کہ دونوں بہن بھائی ایک ہی ماں باپ سے پیدا تھے۔ مگر دونوں کی طبیعتوں میں سیاہ و سفید کا فرق تھا۔ بھائی حد درجہ کے شاہ خرچ اور بہن پرلے سرے کی خسیس اور پیسے پیسے پر جان دیتی تھیں۔ نوعروسی کے دن بادشاہ نے دو ہزار روپے تقسیم انعامات کے لیے مرحمت کیے، وہ اُنھوں نے رکھ چھوڑے۔ کسی کو نہ دیے۔ باورچی خانہ سے جو مٹھیاں بچی ہوئی آئی تھیں اُن کو دھوپ میں سکھا کر جمع کرتی تھیں۔ ایک دن بادشاہ نے شیرینی کی فرمائش کی۔ اُنھوں نے دو روپے کی مٹھائی بازار سے منگا کر سامنے رکھ دی

---

[۱] تاریخ اودھ جلد چہارم [۲] قیصر التواریخ

جس کو بادشاہ نے ہاتھ بھی نہ لگایا۔ یہ باتیں بادشاہ کے بہت بار خاطر ہوتی تھیں۔ آخر میں[1] ایک نیا گل کھلا جس کی وجہ سے ممتاز الدہر بادشاہ کی نظروں سے بالکل گر گئیں۔ وہ یہ کہ بادشاہ نے کئی لاکھ روپے اور پینتالیس بدریاں، دو شالوں، رومالوں، جامہ داروں اور گرمیوں کی پوشاک جامدانی وغیرہ کے تھانوں کی اپنی ناموری سمجھ کر بیگم کو عنایت کیں کہ تم بادشاہ کی بیوی ہوئی ہو۔ یہ کل چیزیں اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو تقسیم کر دو کہ وہ لوگ بھی یاد کریں کہ اُن کی کسی عزیزہ کی شادی بادشاہ کے ساتھ ہوئی تھی۔

دُلہن نری صاحبزادی تھیں۔ اُن کی والدہ مکرّمہ اُن کی آتا لیقہ اور عقل کل تھیں انھیں کا حکم سب باتوں میں چلتا تھا۔ انھوں نے صرف بے جا سمجھ کر سب نقد و جنس رکھ لیا۔ کسی کو تقسیم نہ کیا۔ صبح کو جب بادشاہ بیدار ہوئے تو تقسیم کو دریافت کیا۔ بیگم کی اماں جان نے جواب دیا "آخر اس اسراف سے کیا فائدہ۔ ہم تمھارا گھر بنانے آئے ہیں یا لُٹانے کو"، یہ سنتے ہی بادشاہ کا شعلۂ غضب بھڑک اُٹھا اور اُٹھ کر باہر جانے لگے۔ بیوی نے دامن پکڑ کر روکا تو فرمایا "تو کنگلی ہے، تو کیا کسی کو دے گی"۔ محل کے باہر تشریف لائے تو راجہ غالب جنگ مہتمم دیوانِ عام سے فرمایا "راجہ ہم نے اس نئے محل کو "کنگلا محل" خطاب دیا"۔ راجہ نے اُسی خطاب سے بآوازِ بلند ایک چوبدار سے کہا "جاؤ کنگلے محل سے حضرت کا تاج لے آؤ"۔[2] اُس وقت سے بیگم کنگلے محل کے خطاب سے مشہور ہو گئیں اور چاند دن کی چاندنی اُن کی بھی ختم ہو گئی اور بمصداق "تدبیر کند بندہ، تقدیر زند

---

[1] قیصر التواریخ جلد اوّل

[2] اُس زمانے میں رواج تھا کہ جس محل میں بادشاہ کا تاج رکھا ہوتا تھا۔ وہ کل محلوں کا سرتاج سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ جس دن سے ممتاز الدہر بیاہ کر آئی تھیں اسی دن سے حسب ایمائے روشن الدولہ تاجِ شاہی انھیں کے محل میں رکھ دیا گیا تھا۔

خندہ" اُس کے ساتھ ہی نواب روشن الدولہ کے سب منصوبے بھی خاک میں مل گئے کیونکہ اگر اُن کی بھانجی کا عروج ہو کر اُن سے اولاد نرینہ ہو جاتی تو سلطنت اودھ کی حکومت اُنھیں کے خاندان میں آجاتی۔

یہ واقعہ بیگم اور اُن کے قرابت داروں کے لیے سوہانِ روح ہو گیا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ بیگم کو پندرہ سو روپے ماہوار خزانۂ شاہی سے ملتے تھے۔ اُن کے بھائی سراج الدولہ اُن کی تنخواہ پر قابض و متصرّف رہتے تھے

سراج الدولہ کا مکان چودھری کی گڑھیا پر تھا جو منہدم ہو کر فروخت ہو چکا ہے صرف اُس کا پھاٹک باقی ہے جو شاکرہ منزل کا جزو ہو گیا ہے۔ موصوف کا ایک وسیع اور عالی شان امام باڑہ بھی محلّہ نہرہ حال جگت نرائن روڈ پر حکیم مہدی علی خاں کے مقبرے کے سامنے تھا۔ یہ عمارت بھی فروخت ہو چکی ہے۔ اب اُس میں ہیوٹ انجینیرنگ اسکول قائم ہے۔

ممتاز الدہر کی محل سرا اور بارہ دری موسومہ چاندی خانہ و امام باڑہ محلہ ڈیوڑھی آغا میر میں تھا۔ اب کل عمارت فروخت ہو کر ایک مہاجن کے قبضے میں چلی گئی ہے۔ بارہ دری بوسیدہ حالت میں اب تک موجود ہے۔ اب یہ کل محلّہ چاندی خانہ کے نام سے مشہور ہو گیا ہے۔ بیگم نے غدر کے تخمیناً بیس برس بعد اپنے مکان مسکونہ چاندی خانہ میں انتقال کیا۔ لاش امام باڑہ بوٹا صاحب واقع نہرہ میں سونپی گئی۔ پھر کربلائے معلّٰی روانہ کر دی گئی۔

بادشاہِ سوم حضرت محمد علی شاہ

۱۸۳۷ء جولائی ۸ - ۱۸۴۲ء مئی ۱۱

شاہ نصیر الدین حیدر کے بعد اُن کے چچا (یعنی نواب سعادت علی خاں کے بیٹے نواب محمد علی خاں) محمد علی شاہ کا لقب اختیار کر کے اورنگ شاہی پر متمکن ہوئے مگر اُن کو آگ وخون کا دریا پار کرنے کے بعد تاج وتخت نصیب ہوا کیونکہ نصیر الدین حیدر کی سوتیلی ماں بادشاہ بیگم نے مرزا فریدون بخت عُرف منّا جان کو جنھیں نصیر الدین حیدر بالاعلان اپنا پسر ناجائز قرار دے چکے تھے۔ محض اپنی ہمہمی اور زورِ زاردری سے خلاف حکم سرکار کمپنی لال بارہ دری میں تخت پر بٹھا دیا گیا اور کرنیل لُو (Col. Low) ریذیڈنٹ اودھ پر دباؤ ڈالا کہ وہ انھیں بادشاہ تسلیم کریں اس پر بارہ دری میں بڑی خوں ریزی ہوئی۔ آگ بھی برسی اور خون کی ندی بھی جاری ہوئی بالآخر بیگم اور منّا جان کو مغلوب کر کے قلعہ چنار گڈھ بھیج دیا گیا اور وہیں دونوں نظر بند کر دیے گئے۔

نصیر الدین حیدر کے بعد حکومت کا حقدار ایک دوسرا شخص تھا اسی لیے انگریزوں نے تاج پوشی سے قبل محمد علی شاہ سے ایک سادہ کاغذ پر دستخط کرا لیے تھے تاکہ اپنی حق السعی کے معاوضہ میں بعد کو جو کچھ مناسب خیال کریں اُس میں درج کریں

(Dacoity in Excelsis by Captain Bird)

بروقت تخت نشینی بادشاہ زندگی کی آخری منزلیں طے کر رہے تھے۔ سِن شریف تقریباً ساٹھ سال کا تھا۔ وجع مفاصل (گٹھیا) کے موذی مرض سے نشست وبرخاست سے معذور تھے ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ کھانا بھی اپنے ہاتھ سے نہ کھا سکتے تھے بخت جوان تھی۔ پلنگڑی پر بیٹھے بیٹھے حکم احکام جاری کیا کرتے تھے۔

موصوف اپنے پدرِ نامدار نواب سعادت علی خاں جیسے مدبّر اور بیدار مغز فرمانروا کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے بھی باوجود کبر سنی اور معذوری سلطنت کا انتظام بڑی تندہی جاں فشانی اور ہوش مندی سے کیا۔

پانچ برس کی قلیل مدت شہر یاری میں اُنھوں نے متعدد عمارتیں بھی تعمیر کرائیں۔ امام باڑہ حسین آباد کے علاوہ موصوف نے قریب ہی ایک خوشنما تالاب سے متصل ایک شاندار دو منزلی بارہ دری اور ست کھنڈہ بنوایا۔ ابھی ست کھنڈے کے صرف چار کھنڈ بن کر ختم ہوئے تھے کہ بادشاہ خود ختم ہو گئے۔ ان عمارتوں کے علاوہ موصوف امام باڑہ حسین آباد کی پشت پر ایک عظیم الشان جامع مسجد بھی تیار کرا رہے تھے۔ وہ بھی ناتمام رہ گئی اُس کی تکمیل اُن کی رفیقہ حیات نواب ملکہ جہاں کے ہاتھوں ہوئی۔ سب سے بڑا کام اُنھوں نے یہ کیا کہ ۱۸۳۹ء میں ۳۶ لاکھ روپے خزانہ ایسٹ انڈیا کمپنی میں داخل کر کے ایک ٹرسٹ قائم کر دیا جس کی بدولت محرم کے ایام عزا میں اب تک شاہی زمانے کی ایک جھلک آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ محمد علی شاہ کی دو خاص بیویاں نواب ملکہ آفاق اور نواب ملکہ جہاں تھیں اُن کے علاوہ بہت سی اسامیاں اور خواصان خاص تھیں (سوانح عمری مرزا محمد کاظم)

محمد علی شاہ نے ۱۹ مئی ۱۸۴۲ء کو کوس رحلت بجادیا اور اپنے ہی تعمیر کردہ امام باڑہ حسین آباد میں سپرد لحد کیے گئے۔

نواب ملکہ آفاق

ملکہ آفاق کا سلسلہ خاندان دو زمرہ خطہ دہلی سے ملتا ہے۔ نواب امام الدین خاں کی بیٹی تھیں جن کی بیٹی شمس النساء بیگم . . . . . . نواب آصف الدولہ کو منسوب

تھیں۔ نواب امام الدین خاں نواب انتظام الدولہ کے بیٹے اور نواب قمرالدین خاں وزیر اعظم حضرت محمد شاہ شہنشاہ دہلی کے پوتے تھے۔ ملکہ آفاق کے بھائی محسن الدین خاں تھے جن کو نواب سعادت علی خاں کی بیٹی دلائی گئی۔ بیگم منسوب تھیں جن سے تاج آرا بیگم پیدا ہوئیں جو حضرت امجد علی شاہ کو بیاہی گئیں اور سسرال سے ملکہ کشور صاحبہ خطاب پایا۔ یہی ملکہ کشور جہان عالم واجد علی شاہ کی والدہ تھیں جنھوں نے ملکہ فرانس کے شہر پیرس میں ۱۸۵۸ء میں انتقال کیا اور وہیں سپرد خاک کی گئیں۔

ملکہ آفاق نصیر الدولہ نواب محمد علی خاں پسر نواب سعادت علی خاں کو بزمانۂ صاحب زادگی منسوب ہوئیں۔ اُن کا نام "جہان آرا بیگم" عرف کھیتو بیگم تھا جب بعد انتقال شاہ نصیر الدین حیدر اُن کے شوہر ۸ جولائی ۱۸۳۷ء کو محمد علی شاہ کا لقب اختیار کر کے بعمر ۶۳ سال سریر آرائے سلطنت اودھ ہوئے تو بیگم صاحبہ کو نواب ملکہ آفاق مخدرۂ عظمیٰ ممتاز الزمانی نواب جہان آرا بیگم عرف کھیتو بیگم" کا خطاب عطا فرمایا اور پانچ برس حکومت کرنے کے بعد ۱۹ مئی ۱۸۴۲ء کو انتقال کیا اور اپنے امام باڑہ حسین آباد میں مدفون ہوئے۔

انھیں ملکہ آفاق نے شاہ نصیر الدین حیدر کی کربلا کے جانب غرب تھوڑی سی دور پر محلہ مکارم نگر میں اپنی شہرۂ آفاق کربلا تعمیر کرائی جن کے گنبدوں اور میناروں کی سنہری کلیاں دور ہی سے جگمگاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس کربلا کا دوسرا نام "عسکریین" بھی ہے اس میں حضرت امام حسن عسکری علیہ السّلام اور حضرت امام نقی علیہ السلام کے مزارات سامرہ کی نقل بنائی گئی ہے۔

کربلائے مذکورہ بزمانہ فرمانروائی حضرت محمد علی شاہ زیر نگرانی حاجی مرزا محمد علی تعمیر ہوئی سب سے زیادہ قابلِ تذکرہ اس کے امام باڑہ کا فرش ہے جس پر دیسی ساخت کے زرد۔ سُرخ اور سبز مختلف وضع قطع کے روغنی چمکدار چوکوں کے سانچے

شطرنجی فرش تیار کیا گیا ہے جو چمک دمک اور خوش نمائی میں جاپانی چینی کے چوکوں سے بڑھ کر دکھائی دیتا ہے۔ زمانۂ شاہی میں یہ چیزیں لکھنؤ میں بنتے تھے۔ ان کے علاوہ مٹی کی سرخ و سبز رنگ کی چمکدار روغنی جالیاں اور کلیاں وغیرہ بھی تیار ہوتی تھیں۔ مگر انگریزوں کے زمانہ حکومت میں بوجہ عدم سرپرستی یہ صنعت معدوم ہو کر رہ گئی ۱۸۵۶ء تک یہ اشیاء لکھنؤ میں دستیاب ہوتی تھیں جب کہ ان کا آخری کاریگر گلاب کمہار دنیا سے رخصت ہوا تو اس صنعت کو اپنے ساتھ لیتا گیا۔

جب محمد علی شاہ کے ہاتھ میں عنانِ حکومت آئی تو خزانہ خالی تھا کیونکہ دو عہدوں سے نظم و نسق ملک میں ابتری چلی آتی تھی۔ مگر موصوف اپنے پدر زمانہ کی آنکھیں دیکھتے ہوئے سب سے پہلے معموری خزانہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ جب ایک کروڑ روپیہ ملک کی آمدنی سے فراہم ہو گیا تو ملازمین کی تنخواہیں بے باق کیں اور چوبیس لاکھ روپے بابت دین مہر ملکہ آفاق کو بھی ادا کیے۔

ملکہ آفاق سے محمد علی شاہ کے تین اولادیں حسب ذیل ہوئیں۔

(۱) ثریا جاہ مرزا امجد علی خاں جو بعد وفات محمد علی شاہ تخت نشین سلطنت ہو کر امجد علی شاہ کے لقب سے مشہور ہوئے اور پانچ برس حکومت کرنے کے بعد ۱۲ فروری ۱۸۴۷ء کو انتقال کر کے امام باڑہ سبطین آباد واقع حضرت گنج میں مدفون ہوئے۔

(۲) نواب سلطان عالیہ بیگم جو بڑی شہزادی مشہور تھیں یہ شاہ زمن غازی الدین حیدر کے نواسے نواب محسن الدولہ کو منسوب تھیں موصوفہ نے ۱۲۷۰ھ میں انتقال کیا اور نواب محسن الدولہ نے ۱۲۹۲ھ ۱۸۷۵ء میں اس دار فانی کو خیرباد کہا

(۳) نواب روشن آرا بیگم جو چھوٹی شہزادی کے نام سے مشہور تھیں۔ اُن کی شادی نواب سرفراز الدولہ کے بیٹے نواب منیر الدولہ کے ساتھ ہوئی تھی۔

سرفرازالدولہ چودھری کی گڑھیا پر رہتے تھے جہاں اُن کی جائداد منوز موجود ہے مگر اب دوسروں کے قبضہ میں ہے۔ چھوٹی شہزادی محلہ پاٹا نالہ پر متصل امامباڑہ جناب عفراساکب ایک عالی شان محل سرا میں سکونت پذیر تھیں۔ بعد غدر ۱۸۵۰ء ان کے شوہر کلکتہ ہوئے کربلائے معلیٰ کو روانہ ہوئے اور وہیں انتقال کیا اس کے بعد موصوفہ بھی زیارت عتبات عالیات کو گئیں مگر واپسی پر بمبئی میں انتقال کیا۔ لاش وہیں سے روانہ عتبات ہوئی۔

ملکہ آفاق نے بتاریخ ۲۰ اکتوبر ۱۸۵۰ء بروز پنجشنبہ قریب شام اپنی جائے سکونت حسن باغ میں ہیضہ وبائی سے خاموش زندگی بسر کرکے انتقال کیا۔ دوسرے روز انھیں کا تعمیر کردہ امامباڑہ اُن کی دائمی آرام گاہ بنا۔ بعد رحلت اُن کا لقب "مریم مکانی" ہوا اُن کی قبر پر قطعہ تاریخ وفات مندرجہ ذیل لگا ہوا ہے۔

بست چوں رخت سفر بلقیس ثانی زیں جہاں ۔۔۔ بود غوغائے قیامت از ثریا تا ثرا

در غمش بودند دریا سینہ زن از دست موج ۔۔۔ خاک بر سر بد ہوا چوں صرصر کوہ سبا

دمبدم بر صفحہ قرطاس ریزد چوں بہ اشک ۔۔۔ ہست از تحریر حالش سینہ کلکم دوتا

چوں بہ فکر سال خوردش گشت مائل خاطرم ۔۔۔ از سر گردون گرداں داد ہاتف ایں ندا

کن دعا عمار تجے چنیں ہم نیز برائے مغفرت ۔۔۔ حق بسر فردوس منزل ملکہ آفاق را

۱۲۶۶ھ

موصوفہ کی قبر کے علاوہ اس امام باڑہ میں چار اور قبریں اشخاص ذیل ہیں

(۱) سلطان عالیہ بیگم دختر ملکہ آفاق (۲) وحید النساء بیگم صاحبہ (۳) نواب سر محسن الدولہ شوہر سلطان عالیہ بیگم یعنی داماد ملکہ آفاق اور (۴) مرزا عالی قدر پسر نواب محسن الدولہ نواسہ ملکہ آفاق کی

سید کمال الدین مصنف قیصر التواریخ جلد دوم میں ملکہ آفاق کی سیرت کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"مرحومہ فی الحقیقت صاحب اوقات تھیں۔ روز و شب عبادتِ خدا میں
بسر کرتی تھیں اور مصائب خامس آلِ عبا میں مصروف رہتی تھیں اور ازراہ
مآل اندیشی چھ لاکھ روپیہ جو حضرت فردوس منزل محمد علی شاہ نے معرفت
نواب امین الدولہ وزیر اعظم بھیجے تھے۔ وہ اور باقی اپنے پاس سے ملا کر جملہ
تیرہ لاکھ کے نوٹ اپنے نواسے مرزا علی قدر کے نام سے کر دیے تھے جن کا
منافع چھ ہزار روپے ماہوار ہوتا ہے۔ بطریق قرضہ موبدہ گورنمنٹ سے معرفت
نواب منور الدولہ تھے۔ اس صرف سے امام باڑہ میں رونق رہتی تھی اور متروکہ
موافق سہم شرعیہ تقسیم ہوا۔ ایک حصہ حاکم وقت یعنی بادشاہ دوسرا جناب
عالیہ نواب ملکہ کشور بدعوی متروکہ پدری نواب حسین الدین خاں مرحوم
تیسرا حصہ بڑی شہزادی زوجہ نواب محسن الدولہ چوتھا چھوٹی شہزادی زوجہ
نواب منیر الدولہ کا ہوا۔ چنانچہ فی کس پانچ لاکھ روپے علاوہ جواہر و اسباب کے
ملا۔ اور تنخواہ دار ملازمین قدیم زن و مرد کے لیے داخل وصیت تھا کئی برس
تک یہ انتظام رہا۔ اب وہ سب نوٹ گورنمنٹ سے لے کر نواب محسن الدولہ
اپنے صرف میں لے آئے۔"

نواب محسن الدولہ کے فرزند افسر الدولہ ملک سرفراز علی خاں افراسیاب جنگ عرف
مرزا عالی قدر کی شادی نواب علی نقی خاں وزیر اعظم واجد علی شاہ کی دختر عفت آرا بیگم
مخاطب بہ عظمت بہو سے ہوئی تھی۔ نواب عالی قدر کا سکونتی مکان عین اُس مقام پر تھا
جہاں اب چوک کی کوتوالی ہے۔ نواب محسن الدولہ کا قدیمی مکان مینا بازار میں تھا۔ جو
سنہ ۵۷ء کے غدر میں منہدم ہوگیا۔ مرزا عالی قدر کا رنگ سانولا مائل بہ تیرگی تھا۔
چہرہ گول بھرا ہوا جس پر چیچک کے ہلکے ہلکے داغ تھے۔ مونچھیں بڑی بڑی ہمیشہ سیاہ مخمل
کی منڈیل نما ٹوپی زیب فرق کرتے تھے۔ سہ پہر کو ہوا خوری کے لیے ضرور سوار ہوتے تھے

استعمالات کل سواریاں نینس۔ ہوادار۔ پالکی گاڑی۔ گھوڑا۔ ہاتھی اور فٹن وغیرہ تیار رہتی تھیں مگر عموماً فٹن پر سوار ہوتے تھے۔ مشہور ہے کہ اُن کے والد کے زمانے میں بھی سواریوں کا یہی دستور تھا۔ نواب عالی قدر نے سنہ ۱۳۱۴ھ مطابق سنہ ۱۸۹۵ء میں لا ولد انتقال کیا۔ مصرع تاریخ وفات یہ ہے

مہر جہاں نشان عالی قدر

سنہ ۱۳۱۴ھ

بادشاہ چہارم حضرت امجد علی شاہ

سنہ ۱۸۴۲ء — سنہ ۱۸۴۷ء

انھوں نے اپنے پدر نامدار حضرت محمد علی شاہ کی وفات پر ۱۶ / مئی سنہ ۱۸۴۲ء کو تاج شاہی زیب فرق کیا اور صرف پانچ برس کی مختصر مدت تک اورنگ شاہی پر جلوہ فگن رہنے کے بعد ۱۳ / فروری سنہ ۱۸۴۷ء کو سفر آخرت اختیار کیا۔ اُن کے عہد دولت میں کوئی خاص واقعہ رونما نہ ہوا۔ یہ مولوی منش انسان تھے۔ اُن کے دور حکومت میں مجتہد العصر جناب سلطان العلما کا بڑا دور دورہ تھا۔ محکمہ آبکاری بھی اُن کے حوالہ کر دیا گیا تھا جس پر شیخ گوہر علی شیر نے اپنے مزاحیہ انداز میں کہا تھا۔

جناب قبلہ و کعبہ کو آبکاری ہے

شراب جو نہ پیئے ان وثوق زناری ہے

انھوں نے محلہ حضرت گنج بسایا۔ کانپور تک کنکروں کی پختہ سڑک بنوائی اور دریائے گومتی پر لوہے والا پل قائم کیا جس سے مخلوق کو بہت راحت نصیب ہوئی۔ اُن

کے وزیر اعظم مولوی امداد حسین امین الدولہ نے امین آباد بسایا۔ ایک سرائے تعمیر کی
دریائی ٹولہ میں روضۂ حضرت عباس بنوایا اُس کے علاوہ کئی اور عمارتیں بھی تعمیر کرائیں

ملکہ کشور صاحبہ

نواب تاج آرا بیگم نواب حسین الدین خاں کی بیٹی تھیں جو فوج شاہی اودھ میں رسالدار تھے۔ اُن کی چھاؤنی وارڈ سعادت گنج لکھنؤ میں گھنٹہ بیگ کی گڑھیا کے قریب تھی۔ یہ مقام اب تک چھاؤنی حسین الدین خاں کے نام سے مشہور ہے۔ حسین الدین خاں نواب سید قمر الدین خاں وزیر شاہ دہلی کی ذریات میں تھے۔ نواب تاج آرا بیگم امجد علی شاہ کو بزمانۂ ولی عہدی بیاہی گئیں اور سسرال سے اُنھیں خاتون معظمہ بادشاہ بہو نواب ملکہ کشور صاحبہ خطاب عطا ہوا۔ سنہ ۱۸۴۲ء میں حضرت محمد علی شاہ کے انتقال پر اُن کے بیٹے امجد علی شاہ بعمر ۴۲ برس ۶ ماہ چہارم بادشاہ اودھ ہوئے اُنھوں نے ۱۸۴۷ء تک پانچ برس حکومت کی اور زمانہ بادشاہت میں اپنی مرضی اور پسند سے دو شادیاں اور کیں۔ ایک ملکہ گیتی سے اور دوسری ملکہ عہد سے۔

ملکہ کشور سے تین اولادیں ہوئیں پہلے خورشید حشمت مرزا محمد واجد علی جو بعد کو سلطان عالم واجد علی شاہ کے نام نامی سے تاجدار قلمرو اودھ ہوئے۔ دوسرے سکندر حشمت مرزا محمد جواد علی جو فوج شاہی کے سپہ سالار اعظم ہونے کے باعث عوام و خواص میں جرنیل صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ نواب اشرف النسا بیگم نواب منیر الدولہ کے بیٹے نواب سرفراز الدولہ سے کتخدا ہوئیں۔

امجد علی شاہ کے زمانۂ ولی عہدی میں ملکہ کشور بہت ہی خوش و خرم رہتی تھیں اور میاں بیوی میں بڑی محبت اور میل جول تھا مگر بادشاہ کی دوسری شادی کے بعد دونوں

میں پہلے پہل ناچاقی ہوئی۔ ابتداءً ملکہ کو اس واقعہ کی مطلق اطلاع نہ ہوئی مگر جب یہ منحوس اور روح فرسا خبر اُن کے کانوں تک پہونچی اور اس کی تصدیق بھی ہو گئی تو انھوں نے تین شبانہ روز نہ بادشاہ کا سامنا کیا نہ اُن سے بات چیت کی بلکہ کھانا پینا تک ترک کر دیا۔ آخر کار وزیر اعظم اور بعض اعیان دولت و اعلیٰ عہدہ داران سلطنت نے اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اگر سرکار اسی رویہ کو جاری رکھیں گی تو سلطنت کو نقصان عظیم پہونچنے کا اندیشہ ہے۔ اس عرض و معروض کے بعد انھوں نے اپنا خیال بدل دیا اور مثل سابق پھر ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگیں۔ ملکہ کو چھتر منزل۔ چونکھی کوٹھی اور دوارکاداس کے باغ والی عمارت واقع سڑک کان پور بہت پسند تھی۔ ان تینوں عمارتوں میں وہ بہت شوق سے رہتی تھیں۔ موسم سرما میں وہ چھتر منزل میں قیام کرتی تھیں اور معمولاً کسی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر چلمن سے دریا اور سڑک پر آیندہ روند کی سیر کیا کرتی تھیں۔ اکثر اوقات وہ کسی غریب اور بیکس عورت کو طلب کرتیں اور انعام و اکرام سے اس کو خوش کر کے رخصت کرتیں۔ چونکھی کوٹھی کو وہ موسم گرما کے لیے موزوں خیال کرتی تھیں۔ اور باغ والی کوٹھی کو برسات کے لیے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے ملکہ چند روز کے لیے چھتر منزل میں جو لب دریا واقع ہے۔ فروکش تھیں اور چڑھے ہوئے دریا کی سیر کر رہی تھیں کہ دفعتاً انھوں نے خادماؤں کو پکار کر کہا کہ دیکھو دریا میں ایک بڑھیا بہتی چلی جاتی ہے فوراً دوڑ جاؤ اور آدمیوں کو بھیج کر اس کو نکلواؤ۔

چنانچہ خادمائیں بجلی کی طرح لپک کر گئیں اور اسے نکالنے کے لیے معاً آدمیوں کو بھیج دیا۔ غریب بڑھیا کا جھونپڑا سیلاب سے بہہ گیا تھا اور وہ چھپر کا ایک کونہ پکڑے ہوئے دریا میں بہتی چلی جاتی تھی۔ نوکر اس کو آن واحد میں دریا کے باہر نکال لائے اور جسم خشک ہونے پر کپڑے بدلوا کر ملکہ کے روبرو حاضر کیا جب ملکہ اس کی پُردرد سرگزشت

سُن چکیں اور اُن کو معلوم ہوا کہ اس کا کوئی دالی وارث نہیں ہے نیز اُس کے کل رشتہ دار لقمۂ اجل ہو چکے ہیں تو اُنھوں نے اس کے لیے تین روپیہ ماہوار بطور گزارہ مقرر کر دیے جو اس زمانہ میں اطمینان سے زندگی بسر کرنے کو کافی تھے۔

کوٹھی سے ملا ہوا بڑا باغ تھا جس کے چاروں طرف بلند دیواریں تھیں۔ موسم برسات میں چھینٹا پڑنے کے بعد جب خوشگوار ٹھنڈی ہوا چلتی تھی تو ملکہ اپنی ملین خادمن کے ہمراہ جن کی تعداد ایک سو یا دو سو ہوتی تھی روشوں پر چل کر چہل قدمی کر کے لطفِ زندگی اُٹھاتی تھیں وہ اپنے مذہب کی بھی بہت پابند تھیں۔ شب کو دیر سے آرام کرتی تھیں اسی سبب سے صبح کو دیر سے بیدار ہوتی تھیں اور ملازموں کی مدد سے ہاتھ منہ دھو کر اور تھوڑی سی روغنی ٹکیہ اور بالائی کا ناشتہ کر کے اپنے توشہ خانہ میں چلی جاتی تھیں جہاں مولوی صاحب پس پردہ بیٹھ کر اُن کو کلام پاک پڑھ کر سُنایا کرتے تھے۔

اپنے شوہر کے انتقال کے بعد وہ خود رات گئے تک قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتی تھیں۔ ان کی استعداد علمی اچھی تھی اور فارسی بھی بخوبی لکھ پڑھ لیتی تھیں۔

گرمیوں میں خاصہ نوش کرنے کے قبل مربوں اور محلول موتیوں کا شربت بھی استعمال کرتی تھیں۔

پوشاک تبدیل کرنے اور دربار کر چکنے کے بعد خاصہ چنا جاتا تھا۔ ملکہ کا خاصہ محل سرا میں نہایت ہوشیار اور سلیقہ مند مامائیں تیار کرتی تھیں اور بادشاہ کا خاصہ اُن کے خاص باورچی اور رکابدار باہر کے باورچیخانوں میں تیار کرتے تھے جب بادشاہ ملکہ کے ساتھ خاصہ نوش کرنے کو تشریف لاتے تھے تو شہنائی نواز شہنائی بجاتے تھے۔ بادشاہ کا کھانا نقرئی کشتیوں اور سینیوں میں آتا تھا۔ دوپہر کو ایک توپ بھی داغی جاتی تھی جس سے پتہ چل جاتا تھا کہ اب بادشاہ دسترخوان پر خاصہ نوش کرنے کو بیٹھے ہیں۔

شام کا کھانا بعد مغرب ہوتا تھا شام کو بھی قریب قریب ڈیڑھ سو کے ایسے بیس پچیس قسم کے نہایت لذیذ اور خوش ذائقہ کھانے ہوتے تھے یعنی دو تین قسم کے پلاؤ کئی قسم کے کباب۔ کئی رنگ کے ترکاری دال اور شوربہ دار سالن حلوے اور بھجیاں وغیرہ ملکہ ہمیشہ چمچے سے کھانا کھاتی تھیں۔ ہاتھ سے نہیں کھاتی تھیں اور کھانے سے فراغت کرنے کے بعد دونوں وقت حقہ ضرور نوش کرتی تھیں۔ جب ملکہ اپنی خوابگاہ میں آرام کرنے تشریف لے جاتی تھیں تو ہمیشہ کسی قصہ گو عورت سے کوئی قصہ یا داستان کہلوا کر سنا کرتی تھیں۔ قصہ گو ملکہ کے مزاج کے موافق قصہ میں تبدیلی بھی کر دیتی تھیں۔ اگر نیند بلانے کا مقصد ہوتا تھا تو ایک خواب آور دھیمے پھیکے قصے سے جو طول دے کر آہستہ سے بیان کیا جاتا تھا یہ منشاء پورا ہو جاتا تھا۔ اگر یہ غرض ہوتی تھی کہ قصہ سن کر دل بستگی ہو اور طبیعت میں تازگی اور شگفتگی پیدا ہو یا غم غلط ہو تو کوئی دلچسپ پُرتاثیر داستان دل نشین الفاظ خوش آئند لہجہ اور دل آویز پیرایہ میں بیان کی جاتی تھیں۔ بعض اوقات شب کو بہت دیر تک قصہ بیان ہوا کرتا تھا اور کوئی نفیس اور پاکیزہ قصہ بیان کرنے کے انعام میں ملکہ کوئی بیش قیمت تحفہ عطا کرتی تھیں۔ اُن کی سرکار میں چار قصہ گو عورتوں کے رسم تھے۔ جب قصہ گو باریاب باقی تھی تو ملازمین کی باری بدل دی جاتی تھی۔ اور جب وہ رخصت ہوتی تو پھر نوکروں کی بدلی ہوتی تھی۔

ملکہ کو خود بھی قصے کہانی کہنے کا شوق تھا اور کبھی کبھی اپنی خواصوں اور مصاحبوں کو بھی سنایا کرتی تھیں۔ اُن کے قصے زیادہ تر مذہبی رنگ کے ہوتے تھے مگر قصہ گو ہر قسم کے افسانے بیان کرتی تھیں جن میں بادشاہوں اور امیر زادیوں کی عشق و محبت فقیروں کے بادشاہ ہو جانے اور شاہوں کے گدا ہو جانے اور پریوں اور راجہ اندر کے دربار کے حالات و واقعات ہوتے تھے۔ موسم سرما

میں جب ملکہ بیدار ہوتی تھیں تو بڑی تیاریاں ہوتی تھیں اور اُن کے نوکر دن کو دن بھر محنت شاقہ کرنی پڑتی تھی۔ وضعوں میں ٹھنڈا پانی اور آب گرموں میں گرم پانی بھر جاتا تھا سب سامان سویرے سے ہو جاتا تھا۔ اور ملکہ اور نہلانے والی عورتیں دن بھر کی مشقت کے لیے تیار ہو جاتی تھیں۔ ملکہ کے نہانے کے وقت بجائے صابن کے بیسن استعمال ہوتا تھا۔ اور یہی اُس زمانہ کا عام دستور تھا۔ دو دایاں بہت قدیم شادیائیں جو ملکہ کے ہمراہ اُن کے کنوارپنے سے رہتی تھیں حمام کراتی تھیں، بروقت حمام ملکہ کے ہر عضو پر کثرت سے بیسن ملا جاتا تھا اور نیم گرم پانی سے دھو ڈالا جاتا تھا۔ ہر حصہ جسم کو بار بار اسی طریقہ سے صاف کیا جاتا تھا جس سے ملکہ اور حمامی دونوں یکساں خستہ ہو جاتے تھے۔ اس زمانہ میں ہر رئیس اعظم کی محل سرا میں حسب رواج خواجہ سرا ضرور ہوتے تھے۔ محل خانہ شاہی میں بھی یہ لوگ بکثرت موجود تھے۔ مگر ملکہ نہ اُن کو پسند کرتی تھیں نہ حمام سے اُن کا کوئی سروکار رکھا تھا۔ اُن سے صرف درباروں جلوسوں اور ایسے ہی دوسرے موقعوں پر شان و شوکت دوبالا کرنے کا کام لیا جاتا تھا۔

زنانہ پہرہ دارنیاں بھی محل سرا میں موجود تھیں جو ڈیوڑھیوں اور زنانہ درجوں کے برآمدوں میں وردیاں پہنے اور ہاتھ میں پستول یا قرولی لیے پہرہ پر موجود رہتی تھیں مگر ملکہ اُن کو بھی پسند نہ کرتی تھیں اور اُن کے معاملات میں بہت کم دخل ہوتی تھیں۔ پُرانے طریقے بدستور جاری تھے مگر اُن میں ظاہرداری اور تصنع بہت کم تھا۔ در حقیقت ملکہ تکلف اور نمائش کے اس قدر خلاف تھیں کہ بغیر سخت ضرورت کے وہ دیر دولت کے باہر بہت کم جاتی تھیں۔ ہاتھی۔ اونٹ۔ گھوڑوں۔ سوار۔ پیدل۔ سپاہیوں اور ہر قسم کے پہرہ داروں کا جلوس جو حسب دستور اُن کی سواری کے ہمراہ ہوتا تھا۔ اُن کے بہت بار خاطر ہوتا تھا۔ اُن کو صرف ستھری نفیس پوشاک

اور اعلیٰ درجہ کے جواہرات کا بہت شوق تھا لیکن ضابطہ کی شاہی پوشاک زیب تن کرنے سے گھبراتی تھیں اور اکثر جلوس والی سواری سے واپس آکر کوچ پر دراز ہوجاتی تھیں اور کہتی تھیں خدا کا شکر ہے کہ اس زحمت سے نجات پائی۔ یہ تو بڑی ہی تکلیف دہ رسم ہے۔

ملکہ کی رنگت کندنی ناک نقشہ سڈول اور قد میانہ بوٹا سا تھا۔ جسم چھریرا اور خوشنما۔ آنکھیں بڑی بڑی سیاہ اور چمکدار۔ بال سیاہی مائل بھورے رنگ کے اور ہاتھ پاؤں چھوٹے اور نازک تھے۔ اپنے شوہر نامدار کی زندگی میں وہ بہت خوش و خرم رہتی تھیں مگر ضبطی سلطنت کے بعد وہ مغموم اور اداس رہنے لگیں۔ ڈیل بھاری ہوگیا۔ چستی چالاکی جاتی رہی اور ولایت جانے سے قبل اُن کی نزاکت اور خوب صورتی زائل ہوچکی تھی۔ نوروز کے دن وہ نہایت ہی نفیس اور پر تکلف پوشاک زیب تن کرتیں اور جواہرات بھی کثرت سے استعمال کرتی تھیں۔ اُن کی خادمائیں و متوسلین اُن کو بیش بہا ملبوسات سے آراستہ اور کمیاب و گراں قدر جواہرات سے گوندنی کی طرح لدی دیکھ کر بہت فخر و مباہات کرتے تھے۔ سال بھر میں صرف نوروز کے موقع پر وہ اس طرح سنوارے جانے پر رضامند ہوتی تھیں۔ ایام محرم میں تو اربعین تک وہ کپڑے بدلتی تھیں نہ ہاتھ پیروں میں مہندی لگاتی تھیں بلکہ معمولی زیورات بھی نہیں پہنتی تھیں۔ اس زمانہ میں خوشی کے کل کام مثل شادی بیاہ وغیرہ بالکل موقوف ہوجاتے تھے۔ عورتیں اور مرد علیحدہ علیحدہ مکانوں میں رہتے تھے۔ اُن کے یہاں نویں محرم کو شب بھر مرثیہ خوانی ہوتی رہتی تھی اور تمام رات کوئی پلک نہیں جھپکاتا تھا۔ یوم عاشور کو کسی کو ایک لقمہ کھانے کی یا ایک گھونٹ پانی پینے کی اجازت نہ تھی حتیٰ کہ شیر خوار بچے کو بھی جب تک تعزیے دفن نہ ہوجاتے تھے دودھ نہ دیا جاتا تھا۔ اُن کے بدخواہوں نے وہ مرتبان

کی شمع حیات کو گل کرنے کی کوشش کی۔ ایک مرتبہ تو اُن کے بیچوان کی نَے میں زہر چھڑک دیا۔ اور دوسری مرتبہ ایک سیاہ زہریلا سانپ اُن کے بستر میں رکھ دیا گو جس کو اللہ رکھے اس کو کون چکھے اُن کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ اور اُن کے بُرا چاہنے والے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ اُن کی ملاقات کا وقت صبح اور شام کے کھانوں کے درمیان مقرر تھا۔ دیہات سے ہر طبقہ اور فرقہ کی مصیبت زدہ عورتیں درخواستیں اور تحفہ تحائف لے کر اُن کی خدمت میں حاضر ہوا کرتی تھیں۔ وہ سب کی عرض و معروضات توجہ سے سُنتیں اور تا بہ امکان دادرسی کرنے پر ہمیشہ مستعد اور سرگرم رہتی تھیں۔

ظاہر بظاہر ایک نازیبا و سنگدلانہ فعل جو اُن کی طرف منسوب کیا جاتا ہے رشک و حسد کا نتیجہ تھا۔ جب امجد علی شاہ کی تخت نشینی کو ایک سال ہو گیا تو وہ ملکہ کی ایک نوجوان خادمہ کے دامِ محبت میں گرفتار ہو گئے۔ خادمہ ایک گل اندام اور پری چہرہ لڑکی تھی۔ اس کا پورا جسم حُسن کے سانچہ میں ڈھلا ہوا تھا جس میں جوانی کے نکھار اور رسیلے پن نے اور چار چاند لگا دیے تھے۔ بادشاہ اس کو تحفہ تحائف دے کر سرفراز کرنے لگے۔ ملازمہ بھی اپنے دل میں کچھ سمجھ کر بہت چل نکلی ملکہ اس راز کو تاڑ گئیں۔ ایک دن گرمیوں میں یہی ملازمہ کام کاج سے خستہ ہو کر منہ اور گردن کھولے برآمدے میں بے خبر سو رہی تھی ملکہ ادھر سے اتفاقیہ گزریں اور اس فتنہ خوابیدہ کو دیکھ کر چپ چاپ اپنے کمرہ میں چلی گئیں اس کے بعد ایک نہایت رازدار قدیم خادمہ کو جو لڑکپن سے اُن کے ہمراہ رہتی تھی بلا کر کچھ سرگوشی کی۔

تھوڑی دیر میں اس سوتی ہوئی لڑکی کی چیخ چلاہٹ اور واویلا سے محل گونج اُٹھا جس سے معلوم ہوا کہ کوئی چیز آتش بازی کے قسم سے اس کے اتنے قریب چھڑائی گئی تھی کہ اس کا چہرہ اور گردن جھلس کر رہ گئی۔ اس واقعہ کی اطلاع پا کر بادشاہ اندر

تشریف لائے تو اُن کا چہرہ مارے غصہ کے سُرخ ہو گیا۔ خادم کو وہ اصلاح کی غرض سے باہر اٹھالے گئے مگر اس کی رعنائی و نفرتی ہمیشہ کے لیے کافور ہو گئی بادشاہ نے اس کا عوض یوں لیا کہ ایک دوسری نوعمر پری جمال لڑکی سے متعہ کرکے اس کو محل میں داخل کر لیا اور زر و جواہر سے مالا مال کر دیا۔

امجد علی شاہ کے انتقال کے بعد وہ بحیثیت والدہ بادشاہ وقت حسب دستور دربار اودھ جناب عالیہ کے خطاب سے ملقب ہوئیں۔ اس سانحہ دل گداز کے بعد انھوں نے کبھی نتھ نہیں پہنی جو سہاگ کی علامت خیال کی جاتی تھی مگر اپنے دوسرے بیش بہا مرصع زیورات اور شاندار شاہی پوشاک حسب موقع استعمال کرتی رہیں اور بیوہ ہو جانے کے بعد اُن کی سواری کے ساتھ وہی جلوس ہوتا تھا جو ان کی شوہر کی حیات میں ہوتا تھا۔ یہ بات نواب خاص محل کو بہت شاق گذرتی تھی کیونکہ فرمانروائے وقت واجد علی شاہ کے محل خاص ہونے کی وجہ سے وہ اس جلوس کو اپنا حق سمجھتی تھیں

ملکہ لمبا سفر ہاتھی پر نقرئی ہودج میں یا اپنی شاہی پالکی میں کیا کرتی تھیں جس کو سُرخ وردی پہنے ہوئے کہار اُٹھایا کرتے تھے۔

ہر محل میں ملاقات کے کئی کمرے ہوتے تھے جن کے بیچ میں عموماً ایک گول میز رکھی رہتی تھی جو کسی کمیاب لکڑی یا سنگ مرمر یا بلور یا چاندی کی بنی ہوتی تھیں۔ جن پر ہر قسم کی آرائشی چیزیں مثلاً چینی کے خوش نما ظروف یا طلائی و نقرئی اور چمکدار رو غنی برتن، گملے، گھڑیاں وغیرہ رکھی رہتی تھیں۔ یہ اشیاء دہلی چین یا یورپ کی بنی ہوئی تھیں۔ میز کے چاروں طرف ولایتی طرز کے کوچ و نگل بھی ہوتے تھے اسی طرح ہر کمرے میں ایک مسہری قیلولہ کے لیے رہتی تھی جس پر قیمتی پلنگ پوش پڑا رہتا تھا۔ محل سرا میں دو طلائی مسہریاں بھی تھیں جن کو نواب سعادت علی خاں نے

بنوایا تھا۔ واجد علی شاہ دونوں کو اپنے ہمراہ کلکتہ لے گئے تھے اور دونوں کے چھ کھیٹے بچے بعد دیگرے ضرورتاً گلوا ڈالے تھے۔

ایک موقع تو یہ تھا کہ ایک روز ایک شخص خاص قسم کے پرندوں کا ایک جوڑا جو اپنے گھنے پروں کی خوب صورتی اور چال ڈھال کی خوبی کے لیے مشہور تھا، شاہ معزول کی خدمت میں بغرض فروخت لایا، دونوں کے سروں پر ایک کلغی سی تھی جس سے اُن کی خوشنمائی بڑھ گئی تھی۔ اعلیٰ حضرت کو یہ جوڑا بہت پسند آیا۔ قیمت دریافت کی تو فروشندہ نے پچاس ہزار روپیہ بتائے۔ بادشاہ نے فرمایا خیر پچاس ہزار سہی اور خزانچی کو طلب کر کے حکم دے دیا کہ قیمت ادا کر دو لیکن اس وقت تحویل میں صرف بتیس ہزار روپیہ نکلے اور اتنی رقم اتفاقی اور غیر معمولی اخراجات کے لیے عموماً محفوظ رکھی جاتی تھی چنانچہ خزانچی نے دوسری تنخواہ کی وصول یابی کے قبل کل رقم ادا کرنے میں پس و پیش کیا۔ اس پر بادشاہ بہت ناراض ہونے لگے۔ لہٰذا کل رقم بطور جز قیمت کے ادا کر دی گئی مگر پندرہ ہزار پھر بھی باقی رہے اُس وقت نہ اور زر نقد موجود تھا اور نہ بطور قرض دستیاب ہو سکا۔ اسی ضغطہ و مخمصہ میں ایک مسہری کا چھ کھٹا توڑ کر گلا دیا گیا اور باقی ماندہ قیمت ادا کر دی گئی۔

ملکہ کے خزانہ کی نگرانی زنانہ پہرہ دارنیاں کرتی تھیں۔ اس سے متصل ایک اور کمرہ تھا جس کو تہ خانہ کہتے تھے۔ مگر جیسا کہ اس لفظ کا عام مفہوم ہے۔ یہ درحقیقت زیر زمیں نہ تھا جس میں گرمی کی شدت سے محفوظ رہنے کے لیے دن کو آرام کرتے ہیں بلکہ فاضل کپڑوں اور جواہرات وغیرہ کے رکھنے کی جگہ تھی، اس تہ خانہ میں ایک بڑا صندوق "روپیوں اور اشرفیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جس کو بشبیہا کھچڑی کہتے تھے۔ یہ صندوق امجد علی شاہ کے والد حضرت محمد علی شاہ نے بھر دا کر وہاں رکھوا دیا تھا تاکہ صرف اشد ضرورت کے وقت اس سے کام نکالا جائے مگر یہ کل رقم

واجد علی شاہ کے زمانہ میں صرف ہو گئی۔

واجد علی شاہ نے اپنی ایک شادی بزمانۂ بادشاہت ۱۸۵۱ء میں نواب علی نقی خاں وزیر اعظم کی صاحبزادی نواب رونق آرا بیگم سے کی تھی جن کو خسر محل کا خطاب دیا تھا۔ اس شادی کے بعد بادشاہ اپنے خسر نواب علی نقی خاں کی بہت خاطر و تواضع کرنے لگے اور باوجود ملکہ کی فہمائش اور خلاف دستور قدیم ہونے کے ان کو اکثر دربار میں مسند شاہی پر بٹھا لیتے تھے۔ بادشاہ کی اس عنایت و بے تکلفی سے وزیر اعظم کی بیوی نواب گوہر آرا بیگم کو بڑا گھمنڈ ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ وہ ملکہ سے ملاقات کرتے وقت مقررہ سے قبل آ گئیں ملکہ بیدار ہو چکی تھیں مگر اُن کو اپنی شان اور رُعب وداب کا بڑا خیال تھا اور کسی کی مجال نہ تھی جو اس معاملہ میں خلل انداز ہو سکتا۔ اس لیے اُنھوں نے کہلا بھیجا ابھی ملاقات کا وقت نہیں آیا ہے۔ تھوڑی دیر توقف کیجیے۔ بیگم صاحب کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور برافروختہ ہو کر بآواز بلند کہنے لگیں کیا میں ملکہ کی ماں نہیں ہوں کیا میری بیٹی بادشاہ کو نہیں بیاہی ہے جو اس طرح کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کے اور کئی جملہ ادا کیے مگر ملازمین نے جواب دیا کہ اس میں ہم لوگوں کا کیا قصور ہے۔ ہم لوگ تو ملکہ صاحبہ کے تابع فرمان ہیں۔ ہم لوگوں سے شکایت بیکار ہے۔ چنانچہ وقت مقررہ پر بیگم صاحبہ کو شرفِ ملاقات حاصل ہوا۔ ملکہ نے بہت اعزاز و احترام کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ معمولی مراسم ادا ہونے کے بعد بیگم صاحبہ نے ملکہ سے اُن کے ملازمین کی شکایت کی۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے ہی اُن کو ایسا حکم دیا تھا اس میں اُن کا کوئی قصور نہیں ہے اور یہ بھی فرمایا کہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ آپ نے ادنیٰ خادموں سے زبان لڑانا پسند کیا اس پر بیگم صاحبہ نے مناسب الفاظ میں معذرت حاصل نہیں کی بلکہ اجازت حاصل کیے بغیر ہی اُٹھ کر چلی گئیں اسی روز سہ پہر کو ملکہ نے بادشاہ سے اس واقعہ کا

کا ذکر کر کے فرمایا کہ جب تک بیگم صاحبہ اپنی کج خلقی کی معذرت نہ کریں گی میں آئندہ اُن سے ہر گز نہ ملوں گی۔ بادشاہ کی رائے نے وزیر اعظم کو طلب کر کے کل ماجرا بیان کیا جس پہ دوسرے ہی روز بیگم صاحبہ ملکہ کے دربار میں حاضر ہو کر معافی کی خواستگار ہوئیں علاوہ دیگر خوبیوں کے وہ نہایت ہی نیک سرشت اور عالی دماغ خاتون تھیں سلطنت میں اُن کا بڑا رعب اور دبدبہ تھا۔ ریذیڈنٹ اور اراکین سلطنت بوجہ اُن کی نیک نفسی دور اندیشی اور معاملہ فہمی کے اُن کو بڑی وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے وہ کبھی کبھی بادشاہ کو فہمائش بھی کرتی تھیں مگر بہ سبب اُن کی بیہودگی بجربہ کاری وتدبر کے وہ اُن کا بہت لحاظ اور ادب کرتے تھے کبھی کسی بات کا جواب نہ دیتے تھے۔

ضبطی سلطنت سے قبل ریذیڈنٹ نے ایک کونسل آف ایجنسی یعنی مجلس نظامت قائم کرنے کی تجویز پیش کی تھی جس میں والدہ محترمہ بادشاہ سلامت کا جیسے پہلے ذکر کیا ہے کہ وہ نہایت ہی ہوشمند اور بیدار مغز خاتون ہیں اصلیت بھی یہ ہے کہ بعد الحاق اودھ انھوں نے انگلستان جانے کا جو عزم بالجزم کیا اور باوجود ضعیف العمری کے حسب استقلال اور تندہی سے انھوں نے سات سمندر پار جا کر بحالی سلطنت کی جان توڑ کوشش کی وہ اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ ریذیڈنٹ نے اُن کی فہم فراست کا جو اندازہ کیا تھا وہ سر مو غلط نہ تھا۔

قبل ضبطی سلطنت ایک عہدنامہ بھی منجانب سرکار انگلشیہ فرمانروائے اودھ واجد علی شاہ کی منظوری کے لیے پیش کیا گیا تھا جس کی رو سے ملکی و فوجی اختیارات قطعی طور پر برٹش گورنمنٹ کے ہاتھوں میں چلے جاتے مگر بادشاہ کا خطاب شاہِ اودھ قائم رہتا اس میں یہ بھی مذکور تھا کہ بادشاہ کا مناسب اعزاز و احترام کیا جائے گا اور قصر سلطانی دل کشا اور بیبیا پور کی املاک میں سوائے سزائے موت

صادر کرنے کے اُن کو کُل اختیارات حاصل رہیں گے بارہ لاکھ روپیہ سالانہ بطور گزارہ ملے گا اور اُن کی یک جدی قرابت داروں کو بسر اوقات کے لیے رقم علیحدہ سے ملے گا۔ جنرل اوٹرم ریذیڈنٹ نے ۳۰ جنوری ۱۸۵۶ء کو گورنمنٹ کا منشا نائب السلطنت نواب علی نقی خاں پر ظاہر کر دیا۔ یہ خبر وحشت اثر سن کر وہ بہت حیرت زدہ اور سراسیمہ ہوئے اور شاہان گزشتہ اور حکمران موجودہ کے طرز حکومت میں موازنہ و مقابلہ کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اب ہر حیثیت میں اصلاحات ہو گئی ہیں مگر ریذیڈنٹ نے انھیں یاد دلایا کہ فوج کا داخلہ ایک ضروری امر ہے اور گورنمنٹ کا منشا پورا ہو کے رہے گا۔

دوسرے روز حسب قرار داد نواب علی نقی خان وزیر اعظم نے ریذیڈنٹ سے پھر ملاقات کی اور مسودہ عہد نامہ اور اعلان ضبطی سلطنت پڑھنے کے بعد کہا کہ بادشاہ نے میری معرفت کہلا بھیجا ہے کہ مجھے سرکار انگلشیہ کا خادم تصور کیجیے میں اس کے ہر فرمان کی تعمیل کے لیے بسر و چشم حاضر ہوں اس پر ریذیڈنٹ نے جواب دیا کہ بادشاہ سلامت کو اختیار ہے کہ انگلستان جا کر اس بارے میں اپنے موافق فیصلہ کرانے کی کوشش کریں مگر جو احکامات صادر ہو چکے ہیں وہ قطعی اور لابدی ہیں ان میں کوئی ترمیم اور تنسیخ محال ہے پھر وزیر اعظم سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ اعلیٰ حضرت سے کوئی دن مقرر کرائیے تاکہ اس روز عہد نامہ لے کر میں اُن کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں۔ یکم فروری ۱۸۵۶ء کو بادشاہ نے ریذیڈنٹ کو ایک درد انگیز خط اس مضمون کا تحریر کیا کہ میں نے کبھی دیدہ و دانستہ کوئی فعل ایسا نہیں کیا جو سرکار انگلشیہ کی برہمی کا باعث ہوتا برخلاف اس کے سرکار کے ادنیٰ سے ادنیٰ خادم کو بھی خوش کرنے کی ہر امکانی کوشش کی گئی اور جو ہدایات منجانب

سرکار موصول ہوئیں ان پر پورے طور سے عملدرآمد کیا گیا۔ مثلاً لارڈ ہارڈنگ کی فہمائش کے بعد پورے ملک میں جو نیا نظام حکومت جاری کیا گیا۔ وہ روز روشن کی طرح سب پر عیاں ہے۔ چٹھی کے آخر میں نہایت عاجزانہ طریقہ پر ریذیڈنٹ سے یہ بھی التجا کی گئی تھی کہ وہ گورنر جنرل کو سمجھا بجھا کر جدید طرز عمل اختیار کرنے سے باز رکھیں۔

اسی روز جناب عالیہ کی طلبی پر ریذیڈنٹ نے زرد کوٹھی میں اُن سے اس اُمید پر ملاقات کی کہ وہ نہایت فہمیدہ خاتون ہیں۔ غالباً وہ بادشاہ کو مجوزہ شرائط کے منظور کرنے پر رضامند کردیں گی۔ پردقت داخلہ صحن دولت سرا میں مجمع کثیر تھا مگر سب لوگ حسب سابق ادب اور اخلاق سے پیش آئے۔ جناب عالیہ بھی بادشاہ کے خط کی طرح منت سماجت کرنے لگیں اور کہا آخر یہ بتائیے بادشاہ نے کیا خطا کی ہے جو سرکار اس قدر ناراض ہے اور خاتمۂ گفتگو پر زور رو کر التجا کی کہ سرکار تھوڑی مہلت عطا کرے تاکہ اس درمیان میں پورے طور پر اصلاحات عمل میں لائی جائیں اور سرکار کو بھی معلوم ہوجائے کہ بادشاہ کو ہمارے مشورہ پر عمل کرنے کا کتنا خیال ہے مگر صاحب موصوف نے روکھے پن سے انکار کردیا اور ملکہ کو یقین دلایا کہ اگر بادشاہ شرائط عہد نامہ منظور نہ کریں گے تو جو مراعات اُن کے ساتھ کیے گئے ہیں اُن سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ ۷ فروری ۱۸۵۶ء کو سلطنت اودھ ضبط ہوکر مقبوضات سرکاری میں شامل کردی گئی۔ اُس کا ملکہ کو بڑا قلق ہوا اور اُنھوں نے فرمایا کہ میں انگلستان جاؤں گی۔ وہاں کی ملکہ بھی صاحب اولاد ہیں۔ میں اُن سے مل کر سلطنت کی واپسی کی التجا کروں گی یہ سنتے ہی ملازمین اور متوسلین میں سینہ زنی ہونے لگی اور کہرام مچ گیا۔ ملازمین نے عرض کیا سرکار کو تو دریا سے بھی خوف معلوم ہوتا ہے ٹے

بڑے سمندروں کو کیسے پار کریں گی۔ مگر ملکہ مصمم ارادہ کر چکی تھیں۔ فرمانے لگیں جو کچھ بھی ہو میں جاؤں گی ضرور۔ چنانچہ اُن کے ایما سے بہار النساء اُن کی مصاحب خاص سفر کی تیاری کرنے لگیں جب سامان سفر لیس ہو گیا تو ملکہ چند ملازمین خاص ہمراہ لے کر اپنے بیٹے شاہ معزول کے پاس کلکتہ روانہ ہو گئیں باقی عملہ کو جواب دیدیا یا پنشن دے دی گئی۔

ملکہ اور نواب خاص محل میں بعض وجوہات سے رنجش تھی۔ کلکتہ پہونچ کر ملکہ نے خیال کیا کہ زندگی حباب کی طرح ناپائدار ہے۔ اس کا کوئی اعتبار اور بھروسہ نہیں۔ اس پر اتنا لمبا بحری سفر در پیش ہے۔ اگر انگلستان جانے سے قبل صفائی ہو جائے تو بہتر ہے۔ وہ اسی خیال سے ایک روز نواب خاص محل کے کمرے میں چلی گئیں، خاص محل نے ان کو آتے ہوئے دیکھ لیا اور جلدی سے اُٹھ کر کمرے کے باہر چلی گئیں۔

ملکہ بولیں "میں تو بڑی بوڑھی ہوں کہ ان کو منانے آئی ہوں اور وہ مجھ سے اغماض کرتی ہیں۔ انھوں نے میری توہین اور رسوائی میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی میں نے نہ تو کبھی اُن کو کوئی تکلیف پہونچائی نہ ملال کا موقع دیا۔" یہ سُن کر بہار النساء فوراً خاص محل کے ملازمین کے پاس گئیں اور اپنی بہن ملکہ زمانیہ عالم سے بھی سفارش کرائی اور جیسے ہی ملکہ واپس آنے کو مڑی تھیں کہ خاص محل کمرہ میں آکر اُن کے گلے سے چمٹ گئیں اور ساس بہو میں میل ہو گیا۔ ابتدا میں بادشاہ نے خود ولایت جانے کا عزم کیا تھا مگر اُن کو ایک ایسا مرض لاحق ہو گیا کہ طبیبوں نے بحری سفر اختیار کرنے سے منع کر دیا۔ ملکہ اس پر بھی اپنے ارادہ پر قائم رہیں اور ۱۰ ارجون ۱۸۵۶ء کو وہ مع مرزا اسکندر حشمت جنرل صاحب ولی عہد پرنس حامد علی

و مولوی مسیح الدین کاکوروی مختار عام شاہ معزول و بہار النساء وغیرہ انگلستان روانہ ہو گئیں جب ملکہ جہاز پر سوار ہو کر رخصت ہونے لگیں تو یہ سوچ کر کہ پھر جیتے جی ملاقات ہو یا نہ ہو وہ اپنے بیٹے شاہ معزول اور ان کے بچوں سے مل کر بہت ہی زار و قطار روئیں۔ کل ایک سو چالیس آدمی اس شاہی قافلہ میں تھے۔ پانچ سو صندوق اسباب کے ہمراہ تھے۔ بدقسمتی سے بمقام سویز آدمی کے بغل سے وہ خاص صندوق سمندر میں گر پڑا، جس میں بیس عدد جواہر بیش بہا جناب عالیہ کے تھے۔ غوطہ خوروں نے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ ۳۰ر اگست ۱۸۵۶ء کو یہ قافلہ لندن میں داخل ہوا۔ کپتان برڈ جو زمانہ حکومت واجد علی شاہ میں اسسٹنٹ ریذیڈنٹ تھے۔ وہ الحاق اودھ کے مخالف ہونے کی وجہ سے اب جناب عالیہ کی طرف سے بحیثیت ان کے سکریٹری کے بحالی مملکت کے لیے پیروی کرتے تھے۔ جناب عالیہ کی ملکہ وکٹوریہ سے ملاقات بھی ہوئی جو بہت امید افزا تھی مگر ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ میں غدر و ہنگامہ برپا ہو گیا جس سے انگلستان کی مخلوق کو اس قافلہ سے پرخاش سی ہو گئی کہ یہ سب فتنہ و فساد انھیں لوگوں کا ساختہ و پرداختہ ہے یہ رنگ دیکھ کر آفتوں کی ماری اور فلک کی ستائی ملکہ ملک فرانس کے دارالسلطنت شہر پیرس چلی گئیں۔ جہاں آلام روحانی کے زخم اور اپنے مرض کہنہ استحاضہ کی زیادتی سے بصد حسرت و یاس اپنے عزیزوں اور ہم وطنوں سے دور عالم غربت میں بتاریخ ۱۲ر فروری ۱۸۵۸ء دنیا سے سدھار گئیں اور وہیں ان کی لاش سپرد خاک کی گئی۔ جنازہ بہت دھوم دھام سے اٹھا۔ سلطان روم اور شاہ ایران کے سفرا اور ملک فرانس کے بعض وزرا اور دیگر اکابرین بھی ہمراہ جنازہ تھے۔ ایک قطعہ آراضی چار پانچ گز مربع برائے قبر دس ہزار روپیہ کو خریدا گیا اور تین ہزار روپیہ کے مصارف سے قبر پر سنگ مرمر کا چبوترہ بنوا دیا گیا۔

ماں کی تدفین کے بعد مرزا اسکندر حشمت لندن واپس آکر خود بھی بیمار پڑ گئے۔ کچھ عرصہ قبل ان کے مبرز پر ایک دنبل نکلا تھا جو ناسور ہو گیا تھا جب اس کا بہنا بند ہو جاتا تھا تو پھر دُنبل بن کر پکتا اور پھوٹتا تھا جب بہنے لگتا تھا تو تسکین ہو جاتی تھی اس وقت ناسور نے بڑا زور کیا جس کے سبب سے تپ محرقہ لاحق ہوئی۔ آخر کار شدتِ مرض سے تباریخ ۸ مارچ ۱۸۵۸ء وہ بھی اس دارِ ناپائدار سے رحلت کر گئے۔ اُن کی لاش لندن سے پیرس لائی گئی۔ جنازہ سلطنت فرانس کیطرف سے فوجی اعزاز کے ساتھ اُٹھایا گیا۔ اور ماں کے پہلو میں دفن کیے گئے۔

اُن کے بعد اُن کی خورد سال لڑکی رافت آرا بیگم نے بھی دائمی مفارقت اختیار کی وہ بھی فرانس میں پیوند خاک ہوئی۔

ملکہ کے انتقال پُر ملال کے بعد بہار النساء مکہ معظمہ کی زیارت سے مشرف ہونے چلی گئیں اور قافلے کے باقی ماندہ لوگ ناشاد و نامراد ہندوستان واپس چلے آئے۔

واجد علی شاہ کو ماں، بھائی، بھتیجی کا آگے پیچھے دور دراز ملک میں ہمیشہ کے لیے بچھڑنے کا جو صدمہ عظیم ہوا اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے گویا جیتے زندگی سر پر آسمان ٹوٹ پڑا گیا۔

بادشاہ بیگم صاحبہ محل خاص شاہ زمن غازی الدین حیدر نے شہزادہ منا جان کی حمایت میں شاہ نصیر الدین حیدر کے دانت کھٹے کر دیئے تھے مجادلہ اور مقابلہ تک کی نوبت آگئی تھی لیکن ہمت نہ ہاریں مگر حق یہ ہے کہ جیسا مردانہ وار مقابلہ مصیبتوں کے سیلاب کا ملکہ کشور نے کیا اور کبرسنی میں جس استقلال اور ثابت قدمی سے بادِ حوادث کے جھونکوں کو آخر وقت تک برداشت کرتی رہیں وہ انھیں کا حصہ تھا۔

ملکہ کے نام کا ایک محلہ کشتور گنج وارڈ سعادت گنج لکھنؤ میں لکڑ منڈی سے متصل آباد تھا اب وہ بھی ٹوٹے ہوئے دل کی طرح بالکل اجڑا ہوا سنسان پڑا ہے۔ مگر ایک نہایت خوب صورت مسجد کشمیری محلہ وارڈ سعادت گنج لکھنؤ میں اُن کی یاد تازہ کرنے کو اب تک موجود ہے ایک مرتبہ اس زور شور سے آندھی آئی تھی کہ اس کے دونوں مینار گر پڑے مگر گنبد اب تک قائم ہیں۔

حضرت گنج لکھنؤ کا بہت ہی مشہور و معروف محلہ اُن کے شوہر حضرت امجد علی شاہ نے آباد کیا تھا جس میں اُن کا مقبرہ سبطین آباد موجود ہے۔ حضرت گنج کے قریب ایک محلہ جناب گنج ملکہ کی یادگار میں بھی بسایا گیا تھا جو امتداد زمانہ سے اب گم نام ہو کر رہ گیا ہے۔

سلطان محل

اودھ میں اس خطاب کی تین بیگمیں گزری ہیں۔ سب سے پہلے یہ خطاب شاہ نصیر الدین حیدر نے حسینی طوائف کو دیا تھا۔ بادشاہ اُس کے حسن خداداد اور کمال فن کی وجہ سے اُس کے عاشق زار ہو گئے اور اُس کو اپنی بیگم بنا کر "سلطان محل" کا خطاب دیا۔

سلطان محل دوم

دوسری سلطان محل حضرت امجد علی شاہ کی بیوی تھیں جو ایک سبزی فروش کی لڑکی تھی۔ ماہ فروری سنہ ۱۸۴۲ء محل شاہی میں ایک روز وہ ترکاری پالک لے کر آئی

سولہ برس کا سن تھا۔ ع

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

بادشاہ سلامت اس کے گدرائے ہوئے جسم آم کی پھانکوں ایسی آنکھیں اور سیب کی رنگت کے ایسے رخساروں پر نظر پڑتے ہی لہلوٹ ہو گئے اور داخل حرم کر کے سلطان محل خطاب دیا۔

مگر مولانا نجم الغنی تاریخ اودھ کے حصہ پنجم میں تحریر کرتے ہیں کہ ۱۶ر اگست ۱۸۴۶ء کو ایک کھجڑی بادشاہ کی منظور نظر ہو کر محل سلطانی میں داخل ہوئی اور نواب امتیاز النساء بیگم کا خطاب پایا۔ راقم السطور کی رائے میں "سلطان محل" خطاب ضرور دیا ہوگا کیونکہ سلیمن صاحب ریذیڈنٹ اودھ کے روبرو کاغذات سرکاری بغرض تصفیہ مقدمہ گورنمنٹ پرامیسری نوٹ پیش ہوئے تھے۔ اُن کی تحریر میں غلطی کا امکان نہیں تھا قرینہ یہ کہتا ہے کہ امتیاز النسا بیگم نام بھی خطابی ہے۔ بادشاہ نے اُس کا خاندانی نام بھونڈا سمجھ کر اس جدید نام سے موسوم کر دیا ہوگا۔

ماہ نومبر ۱۸۴۶ء امجد علی شاہ نے مبلغ اٹھارہ لاکھ تیس ہزار روپیہ کے نوٹ اپنے محلات و دیگر زنانہ رشتہ داروں کے گزارہ کے لیے خریدے۔ یہ نوٹ حسب ہدایت بادشاہ ان محرمات کے نام جُدا جُدا خریدے گئے اور یہ بھی طے پایا کہ نوٹوں کا سود گزارہ پانے والوں اور اُن کے وارثوں کو ادا ہوتا رہے۔ رقم مذکورہ میں سے سلطان محل کو بیس بیس ہزار روپے کے پانچ قطعہ نوٹ یعنی مجموعی طور پر ایک لاکھ روپے عطا ہوئے۔ چنانچہ ۲۱ر نومبر ۱۸۴۶ء کو اُنھوں نے رقم مذکور پر ۳۰ر دسمبر ۱۸۴۶ء تک کا سود وصول بھی کر لیا۔

سلطان محل کے نام کے پانچوں قطعہ نوٹ خزانۂ ریذیڈنسی میں ۲۰ر اپریل ۱۸۴۷ء

کو آ گئے۔ ۲۰؍اگست کو موصوفہ نے اُن کی دستیابی کے لیے ریذیڈنٹ کو درخواست دی مگر بدقسمتی سے دوسرے ہی روز دفعتاً ملک الموت کے پھندے میں پھنس گئیں اور دنیا ہی سے چل بسیں۔ اُن کے شوہر امجد علی شاہ اُن سے پہلے ہی بتاریخ ۱۳؍فروری ۱۸۴۷ء سفر آخرت اختیار کر چکے تھے۔ ۲۶؍ستمبر ۱۸۴۷ء کو امجد علی شاہ کے جانشین و بیٹے واجد علی شاہ نے بھی درخواست کی کہ سلطان محل والے پانچوں نوٹ میرے ایک محل کے حق میں منتقل کر دیئے جائیں اور اس امر پر زور دیا کہ چونکہ میرے والد اور سلطان محل دونوں دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اس لیے میں تنہا متروکہ پانے کا مستحق ہوں۔ دوسری طرف سلطان محل کی ماں، اور بھائی اور بہن دعویدار تھیں۔ سلیمن صاحب کے ریذیڈنٹ مقرر ہونے پر سب سے پہلے یہی مقدمہ اُن کے روبرو پیش ہوا۔ انھوں نے سلطان محل کی ماں، بہن اور بھائی کو وارث قرار دے کر رقم مذکور تینوں کو بموجب شرع اسلام تقسیم کر دی مگر واجد علی شاہ کی سلسلہ جنبانی پر یہ مسئلہ دوبارہ گورنمنٹ کے روبرو آیا تھا مگر اب کی بھی ریذیڈنٹ ہی کا فیصلہ اس بناء پر بحال رہا کہ نوٹ سلطان محل کے نام تھے اور اُن کا سود بھی مرحومہ وصول کر چکی تھیں اور چوں کہ انھوں نے بلاوصیت کے انتقال کیا تھا اس لیے وہ اُن کے وارثوں کی ملک ہو گئے۔

بادشاہ سخن جانِ عالم واجد علی شاہ

۱۸۵۶ء ــــ ۱۸۴۷ء

یہ اودھ کے آخری تاجدار تھے جو اپنے پدرِ بزرگوار حضرت امجد علی شاہ کی رحلت پر ۱۳ر فروری ۱۸۴۷ء کو تختِ سلطنت پر جلوہ گر ہوئے۔ دہلی کے آخری سلطان حضرت بہادر شاہ ظفر کی طرح جانِ عالم واجد علی شاہ بھی بڑے ادب نواز انسان تھے اور فنونِ لطیفہ خصوصاً رقص و سرود کی بہت سرپرستی فرماتے تھے۔ شعر و سخن سے تو خاص ذوق تھا۔ ۱۱ر فروری ۱۸۵۶ء کے اعلان کے موافق اودھ کو دھینگا دھینگی سے مقبوضاتِ انگلشیہ میں شامل کر لیا گیا۔ اس وقت شہر لکھنؤ ہندوستان کا ایک نہایت بارونق اور گلزار مقام ہونے کے ساتھ ہی ساتھ تہذیب و تمدن کا بھی ایک مثالی شہر تھا۔ اہم مقامات پر بہت گھنی آبادی تھی اور سڑکوں پر بڑی چہل پہل رہتی تھی۔

مایوسی کے عالم میں بادشاہ ۱۶ر مارچ ۱۸۵۶ء کو کلکتہ روانہ ہو گئے تاکہ وہاں سے انگلستان جا کر ممبرانِ پارلیمنٹ کے روبرو اپنا مقدمہ پیش کر کے سلطنت کی کی واپسی کی کوشش آئینی طریقہ پر کریں مگر کلکتہ پہونچ کر خود تو بوجہ ناسازیٔ مزاج انگلستان نہ جا سکے۔ اپنے بجائے اپنی ضعیف العمر والدہ ملکہ کشور صاحبہ۔ اپنے چھوٹے بھائی مرزا اسکندر حشمت جواد علی عرف جرنیل صاحب اور اپنے ولی عہد پرنس مرزا حامد علی کو انگلستان روانہ کیا تاکہ وہاں جا کر واپسی سلطنت کی کوشش کریں مگر ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں جب جنگ آزادی کے شعلے بھڑک اٹھے تھے تو

ولایت کے لوگوں کو اس شاہی قافلہ سے پرخاش سی ہوگئی کہ یہ طوفان عظیم انھیں لوگوں کی ذات سے اُٹھا ہے چنانچہ مقدمہ میں کامیابی اور کامرانی کی طرف سے بالکل مایوسی ہوگئی۔ بادشاہ کی والدہ محترمہ نے فرانس میں رحلت کی اور ایک ماہ کے بعد مرزا اسکندر حشمت بھی لندن میں فرشتہ اجل سے ہم آغوش ہوگئے۔ دونوں ماں بیٹے ملک فرانس میں دایہ لحد کی آغوش میں سلادیے گئے۔ پرنس حامد علی ناشاد و نامراد واپس گئے۔ جان عالم کا سب سے بڑا تعمیری کارنامہ قیصر باغ ہے مگر اس کا بہترین اور حسین ترین حصہ جو چینا باذار گیٹ کے اندر تھا ۱۸۵۸ء میں جب انگریزوں کا دوبارہ تسلط ہوا تو فوج انگریزی کے ہاتھوں لُٹ کر کھُد گیا اور بالکل تباہ و تاراج ہوگیا۔ بادشاہ بہ نفس نفیس انھیں عمارات میں قیام فرماتے جن کے ایک نظر دیکھنے کا بڑی بڑی ہستیوں کو اشتیاق تھا۔ اب صرف وہ حصہ باقی رہ گیا ہے جس میں بادشاہ کی بیگمات رہا کرتی تھیں۔

قیصر باغ کے علاوہ موصوف نے حضرت گنج میں اپنے والد محترم حضرت امجد علی شاہ کی قبر پر ایک عالی شان مقبرہ تعمیر کرایا جس کا نام اُنھوں نے سبطین آباد رکھا تھا۔ اپنی رفیقہ حیات عالم آرا بیگم معروف بہ خاص محل صاحبہ کے لیے کانپور روڈ پر عالم باغ بنوایا اور اپنی ایک دوسری محبوب بیوی سکندر بیگم کے لیے سکندر باغ تعمیر کرایا۔ اُن کے وزیر اعظم نواب علی نقی خاں کا عالی شان مکان دباغ محلہ تحسین گنج میں تھا۔ موصوف نے چوک میں مچھلی والی بارہ دری بنوائی جس پر اب لالہ بھولاناتھ کا دھرم شالہ تعمیر ہوا ہے۔ اُس کے علاوہ اُن کی کئی عمارتیں دریا کے کنارے گئوگھاٹ پر تھیں اور ایک عظیم الشان کوٹھی حضرت گنج میں بھی تھی

واجد علی شاہ نے کلکتہ میں اکتیس ۳۱ برس قیام کرنے کے بعد ۲۱ ستمبر ۱۸۸۷ء میں انتقال فرمایا۔ ان کو ۱۲ لاکھ روپے سالانہ سرکار انگلشیہ بطور گزارہ دیتی تھی جو جلتے توے پر

بوندیں ہو جاتا تھا۔ مٹیا برج کے امام باڑہ سبطین آباد میں اُن کی دائمی آرامگاہ ہے۔ لکھنؤ میں جان عالم کی بیگموں کی تعداد تین سو سے زائد تھی جو موجودہ قیصر باغ میں مقیم تھیں۔

جانِ عالم کے محبّانہ خطوط نے جو اُنھوں نے اپنی بعض بیگمات کو لکھے تھے۔ باعتبار اپنی رنگین بیانی و معنی آفرینی دنیائے ادب میں ایک قابل قدر اضافہ کر دیا۔

کلکتہ میں بھی شاہِ معزول کے انتقال پر نکاحی بیویوں کے علاوہ متاعی بیویوں کی تعداد پورے ڈھائی سو تھی جن کو آٹھ درجوں میں تقسیم کرکے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار سے لے کر پندرہ روپے ماہوار تک گزارے دیئے گئے تھے اور بعض کو یکمشت رقم دے کر بھی رخصت کر دیا گیا تھا۔ ان متاعی بیویوں کو حسب ذیل تین قسموں میں منقسم کیا گیا تھا۔

(۱) محلات یعنی ممتوعہ ازواج جو صاحب اولاد تھیں۔ مثل فخر محل۔ نازک محل خاقان محل۔ اُلفت محل۔ ممتاز محل وغیرہ۔

(۲) بیگمیں یعنی ممتوعہ بیویاں جن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی مثل افضل بیگم چندری بیگم، مہرو بیگم، چمن آرا بیگم وغیرہ۔

(۳) خلوتیاں یعنی جن سے متعہ کر لیا گیا تھا مگر جو بعض ادنیٰ قسم کی خدمات بھی انجام دیتی تھیں مثل مصفا بیگم، آبرساں بیگم، آبدار جان بیگم، امانی جان بیگم وغیرہ

(ملاحظہ ہو رپورٹ نمبر ۲۲۰ مورخہ ۶ رجنوری ۱۸۸۸ء پیش کردہ لفٹننٹ کرنل ڈبلو ایف پریڈاکس رجنٹ گورنر جنرل برائے معاملات شاہ اودھ مرحوم بخدمت سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا محکمہ خارجہ)

نواب حضرت محل صاحبہ

شروع شروع میں یہ مکان کی چہار دیواری کے اندر اُن شریف مرد آدمیوں کی خدمت گزاری کے لیے وقف تھیں جو باوجود رنگین مزاج ہونے کے کھلم کھلا بداخلاقیوں پر آمادہ نہیں ہو جاتے بلکہ اپنی ہوسناکیوں کو بعنوانِ شائستہ اور ڈھکے پردے پورا کرنا چاہتے ہیں۔ اسی زمانہ میں امرؤ اماں جیں خواصوں نے انھیں بزمانہ ولی عہدی حضرت واجد علی شاہ اُن کی خدمت میں پیش کر دیا۔ موصوف نے پسند کر کے اُن سے متعہ کر لیا اور "مہک پری" خطاب دے کر ناچ گانے کی تعلیم میں لگا دیا۔ واجد علی شاہ اُن کے متعلق خود بھی پری خانہ میں تحریر کرتے ہیں۔

وساطت جو امن اماموں نے کی — مرے گھر میں آئی زنِ خانگی
پسلیہ تھا خوشبو میں اس کا گلاب — پری تھی مہک اس نے پایا خطاب
لگی ہونے تعلیم رقص و سرود — شب و روز تفہیم رقص و سرود

بعدہ جب مہک پری حاملہ ہوگئیں تو اُن کو پردے میں بٹھا کر "افتخار النساء خانم صاحبہ" خطاب عنایت فرمایا۔ زمانہ حمل ختم ہونے پر خدا نے اُن کو ایک چاند سا بیٹا عطا کیا۔ جس کا نام "رمضان علی" رکھا گیا۔ نومولود کے دادا حضرت امجد علی شاہ نے اس کو "مرزا برجیس قدر بہادر" خطاب مرحمت فرمایا۔ مرزا برجیس قدر کی پیدائش کے متعلق سلطان عالم خود بھی لکھتے ہیں۔

عجب نجم طالع سنے کی یہ تری — ہوئی حاملہ جو مہک تھی پری
سنا جس گھڑی مژدۂ دل پذیر — کیا سجدۂ شکر رب قدیر
بہت اس پری رو کا رتبہ بڑھا — کہ پایا خطاب افتخار النساء

ہوئی پردۂ شرم میں جاگزیں ‏ ‏ زنِ خانہ بہتر ہے پردہ نشیں
غرض مدّتِ حمل آخر ہوئی ‏ ‏ خوشی بعد نُہ ماہ ظاہر ہوئی
وہ طفلِ خوش اقبال پیدا ہوا ‏ ‏ کہ جس پر خود اقبال شیدا ہوا
ہوئے شاہ جنّت مکاں[1] شگفتہ حال ‏ ‏ خوشی سے ہوا اُن سے پرنور لال
ہوا جشنِ شاہانہ آراستہ ‏ ‏ ہوئی فکرِ دنیا کی برخاستہ
مبارک مبارک کی ہر سو صدا ‏ ‏ کوئی رقص میں کوئی صرفِ غنا
مسرت کے ساماں خدا نے دیئے ‏ ‏ پری پیکروں نے تماشے کیے
خطاب اُس کا روشن ہے مانندِ بدر ‏ ‏ یہ مرزا بہادر ہے برجیس قدر

مرزائی[2] بیگم نے بچہ کی پرورش کی جب تعلیم کے قابل ہوئے تو مولوی غلام حضرت برائے تعلیم علوم و فنون و آداب خاندانی مامور ہوئے

۱۸۴۷ء میں واجد علی شاہ نے تخت نشین ہوکر "افتخار النساء خانم" کو "نواب حضرت محل صاحبہ" خطاب عنایت فرمایا اور دو ہزار روپیہ ماہوار اُن کی تنخواہ مقرر کی۔ حضرت محل قیصر باغ کے پچھواڑے نگینے والی بارہ دری کے جانب شمال ایک مکان میں رہتی تھیں۔ ممّو خاں اس محل کے داروغہ اور ٹھاکر پرشاد دیوان تھے۔ ضبطیِ سلطنت کے بعد جب بادشاہ کلکتہ چلے گئے تو حضرت محل لکھنؤ ہی میں اپنے مکان مسکونہ میں حسب سابق مقیم رہیں۔ مصارف معینہ سرکار شاہی سے عطا ہوتے تھے۔

ایک انگریز مؤرخ مسٹر مین (MAINE) نے ان بیگم اور برجیس قدر کے متعلق لکھا ہے۔

---

[1] حضرت امجد علی شاہ پدر واجد علی شاہ [2] افضل التواریخ منشی رام سہائے تمنا

"منّو خاںؒ ان بیگم (حضرت محل) کے ملنے والوں میں تھے جن کے بیٹے برجیس قدرؒ بزمانۂ غدر تخت شاہی پر بٹھائے گئے تھے۔ واجد علی شاہ کے استحقاق سلطنت کا دعویٰ برجیس قدر کے ذریعہ سے کیا گیا تھا۔ جن کی عمر اس وقت دس یا بارہ سال کی تھی۔ یہ لڑکا گو کہ شاہ معزول کے سر منڈھا گیا تھا۔ مگر دراصل منّو خاں (ممّو خاں) سے پیدا تھا۔ ابتدا میں اس کی ماں گانے بجانے کا کام کرتی تھی جس سے منّو خاں نے جو اس وقت مطبخ شاہی میں ایک ادنیٰ جگہ پر ملازم تھا رشتہ الفت قائم کر لیا تھا۔ بادشاہ نے اس کے حسنِ جمال کا شہرہ سن کر اس کو اپنے محل میں داخل کر لیا تھا۔ سرکار شاہی سے ان کو ایک معقول رقم گزارہ کے لیے ملتی تھی اور عملہ بھی ان کا بہت بڑا تھا جس کا داروغہ یا مہتمم اس نے ممّو خاں کو مقرر کیا تھا جس کے اگلے تعلقات چوری چھپے اب بھی قائم تھے۔ جس کا نتیجہ برجیس قدر کی شکل میں نمودار ہوا۔ داروغہ میر واجد علی کا ایک دوسری بیگم سلطان محل کے ساتھ بھی بعینہ ویسا ہی تعلق تھا جو منّو خاں کا حضرت محل کے ساتھ تھا یعنی ظاہر بظاہر تو یہ لوگ داروغہ تھے۔ مگر درحقیقت ان بیگموں کی جان و مال کے مالک بنے رہتے تھے اور بادشاہ ان دونوں عورتوں کی عیاری اور فریب کاری کے شکار ہو گئے تھے۔

مگر مثنوی حزن اختر میں واجد علی شاہ نے اپنے بیٹوں کا تذکرہ کرتے ہوئے برجیس قدر کو اپنا شہزادہ تسلیم کر لیا ہے اس صورت سے یہ بحث ہمیشہ کے لیے دفن ہو جاتی ہے اور صاحب بہادر کا بیان افترا پردازی اور اتہام تراشی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا مثنوی مذکور میں بادشاہ لکھتے ہیں:۔

جو وہ چوتھا شہزادہ ہی رشک مہر	اسے لوگ کہتے ہیں برجیس قدر

وہ چودہ برس کا ہے کچھ شک نہیں ‏ ‏ کہوں کیا کہ ہے وہ کہیں کا نگیں
بلاؤں جو حضرت سے لفظ محل ‏ ‏ تو نام اس کی ماں کا کھلے بر محل
جو بیگم ہی تھی آگے سے انگریزی فوج ‏ ‏ اُسے لے گئی جیسے دریا کی موج
وہ ہے قبضۂ مفسداں میں ہے آہ ‏ ‏ بنایا ہے اپنا اُسے بادشاہ

۱۸۵۷ء میں جب انگریزوں کے خلاف غم و غصہ کی لہر پیدا ہو گئی تو فوج نے انھیں برجیس قدر کو بتاریخ ۲ ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ مطابق ۵ جولائی ۱۸۵۷ء میں اپنا بادشاہ قرار دے کر انگریزوں سے مقابلہ کیا۔ برجیس قدر اس وقت صرف گیارہ برس کے تھے اس لیے کل اُمور سلطنت حضرت محل انجام دیتی تھیں۔ اُس وقت وہ چینی کوٹھی میں رہتی تھیں اور وہیں اُن کا دربار ہوتا تھا۔ بنگال کی منی بیگم[1] کی طرح وہ بہت ہی منتظم مدبر عاقل و فرزانہ ثابت ہوئیں اور پس پردہ بیٹھ کر احکام جاری کیا کرتی تھیں مگر ضبط و نظام کی کمی تھی، جو جس کے جی میں آتا تھا وہ کرتا تھا، اپنی اپنی مرضی کے سب مالک و مختار ہو رہے تھے۔

---

[1] منی بیگم کی ماں سکندر آباد کے ایک غریب باشندے بالمکند کی بیوہ تھیں جنھوں نے افلاس اور تنگدستی سے تنگ آ کر انھیں ایک شخص بشو نامی کے حوالہ کر دیا تھا۔ بشو انھیں دہلی لے گیا اور وہاں ناچ گانے کی تعلیم دی۔ اُسی زمانہ میں نواب علی وردی خاں صوبہ دار بنگال کے نواسہ مرزا محمود مخاطب بہ سراج الدولہ کی شادی ہونے والی تھی اس میں مجرے کے لیے بی منی بھی بلائی گئیں۔ شادی کی محفلیں ختم ہونے کے بعد علی وردی خاں کے بہنوئی میر جعفر نے طائفہ کو چند دنوں کے لیے روک لیا اور روزانہ منی کے یہاں آنے جانے لگے اور اُس کے ایسے متوالے ہوئے کہ بالآخر اس سے نکاح کر لیا۔ منی بائی اب منی بیگم کہلانے لگیں اور نہایت ہوشیار اور سمجھدار ثابت ہوئیں۔ اُن کی فہم و فراست نے میر جعفر کی حرم میں انھیں سب سے ممتاز جگہ دلوادی

اودھ کے دستور کے موافق بادشاہ کی والدہ ہونے کے سبب سے وہ جناب عالیہ (دراج ماتا) کے لقب سے مشہور ہوئیں اس لیے اب ہم بھی آئندہ ان کو اسی لقب سے یاد کریں گے۔

مولانا عبدالحلیم شررؔ بھی اپنی تصنیف گزشتہ لکھنؤ میں حضرت محل کی کارگزاریوں اور خوبیٔ صفات کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"لوگ حضرت محل کی مستعدی دنیاک نفسی کی تعریف کرتے ہیں وہ سپاہیوں کی نہایت قدر کرتیں اور اُن کے کام اور حوصلہ سے زیادہ انعام دیتیں مگر اس کا کیا علاج کہ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ خود پردہ سے نکل کر فوج کی سپہ سالاری کرتیں۔ مشیر اچھے نہ تھے اور سپاہی کام کے نہ تھے ہر شخص غرض کا بندہ تھا کوئی کسی کا کہنا نہ مانتا تھا۔ انگریزی فوج کے باغی اس غدر میں

(بقیہ صفحہ ۲۰۰) منی بیگم کے بطن سے میر جعفر کے دو بیٹے نجم الدولہ اور سیف الدولہ بھی ہوئے ۱۷۶۵ء میں میر جعفر کی وفات پر منی بیگم ہی کا بیٹا نجم الدولہ مسند نشین ہوا جس نے ۱۷۶۶ء میں بخار سے رحلت کی۔ اُس کے بعد مرحوم کا دوسرا بھائی سیف الدولہ برسرِ حکومت ہوا اس کی عمر صرف بارہ سال کی تھی۔ اس کی کم عمری کی وجہ سے ملک کا کل انتظام منی بیگم کے ہاتھوں میں دے دیا گیا مگر اس نوجوان نواب نے بھی ۱۷۷۰ء میں چیچک میں مبتلا ہو کر انتقال کیا۔ اب مُنی بیگم کا سوتیلا بیٹا مبارک الدولہ نواب بنایا گیا جس کی عمر صرف بارہ سال کی تھی مگر بجائے اس کی حقیقی ماں ببّو بیگم کے مُنّی بیگم ہی اُسکی ولی بھی قرار دی گئیں جس کی وجہ کونسل نے یہ بتائی کہ موجودہ نواب کی نگرانی کے لیے ہم مُنّی بیگم سے زیادہ موزوں اور قابلِ اعتماد کسی کو نہیں پاتے، جنوری ۱۸۱۳ء میں منّی بیگم نے قضا کی۔ مرشد آباد میں چوک کی مسجد اسی بیگم کی یاد تازہ کرتی ہے (بیگمات بنگال مترجمہ مولوی سید ذی النورین صاحب وغیرہ وغیرہ)

تھے کہ یہ فقط ہمارے دم کا ظہور ہے اصل حاکم ہم ہی ہیں اور جس کے سر پر جو تاج رکھ دیں وہی بادشاہ ہو جائے۔ ۱۸۵۸ء میں جب سر کالن کیمبیل (Sir Collin Campbell) ولایت سے روانہ ہو کر مع لشکرِ جرار لکھنؤ پہنچے اور قیصر باغ میں خون ریز معرکہ شروع ہو کر مقتولوں کے خون سے زمین لالہ زار ہونے لگی تو جناب عالیہ کی ہمت بھی پست پڑ گئی اور اپنی کمزوری محسوس کر کے ۲۰ رجب مطابق ۱۶ مارچ ۱۸۵۸ء کو بروز پنجشنبہ مع دیگر محلات قیصر باغ خالی کر کے چلی گئیں۔ اگر اس روز گورہ پلٹن لوٹ کھسوٹ میں نہ پڑ جاتی تو شاید جناب عالیہ اور برجیس قدر دونوں گرفتار ہو جاتے۔

دو روز شہر میں بمقام حسین آباد وغیرہ قیام کرنے کے بعد ۲۹ رجب یعنی ۱۸ مارچ ۱۸۵۸ء کو جناب عالیہ لکھنؤ سے رخصت ہو کر قریب بہرائچ بمقام بونڈی پہنچ گئیں۔ مرزا محمد ہادی صاحب رسوا اپنی تصنیف "امراؤ جان ادا" میں جناب عالیہ کے قیام بونڈی کے متعلق لکھتے ہیں:-

"بونڈی میں چار دن کے لیے خوب چہل پہل ہو گئی تھی۔ لکھنؤ کے بھاگے ہوئے سب وہیں جمع ہو گئے تھے۔ بونڈی کا بازار بعینہ لکھنؤ کا چوک معلوم ہوتا تھا۔ بونڈی کے راستہ میں افسرانِ فوج کے نخرے اور بیگم صاحب کی خوشامد ہمیشہ یادگار رہے گی۔ ایک صاحب کہتے ہیں تو صاحب اُن کے داہنے میں ہم پیدل چلیں۔ دوسرے فرماتے ہیں بھلا کھانے کا انتظام تو درست ہوتا۔ تیسرے صاحب افیم کو پیٹ رہے ہیں۔ چوتھے اپنی جان کو رو رہے ہیں کہ حقہ وقت پر نہیں ملتا۔"

غرض کہ جب کمانڈر انچیف جنرل کلائڈ فوج تا بر جلے کر بہرائچ سے لڑتے بھڑتے

قریب بونڈی پہونچے تو دیسی فوج دو ساعت تک خوب جی کھول کر لڑی مگر جب
انگریزی فوج نے دھاوا بول دیا تو تاب مقابلہ نہ لا سکی۔ نیپال کے جنگل میں ہر طرف
منتشر ہو گئی۔ جناب عالیہ اور برجیس قدر مہاراجہ نیپال کی عملداری میں چلے گئے اور
وہیں سکونت اختیار کر لی۔ مشہور ہے کہ پانچ سو روپے ماہوار مہاراجہ کی سرکار
سے دونوں ماں بیٹوں کو گزارہ کے لیے ملتے تھے۔ جناب عالیہ نے نیپال ہی میں
اپریل سنہ ۱۸۷۹ء میں وفات پائی۔ ان کے انتقال کے بعد دولت برطانیہ نے مرزا
برجیس قدر کا قصور معاف کر کے انھیں آزاد کر دیا۔ چنانچہ وہ نیپال سے کلکتہ پہنچ
گئے۔ وہاں تخمیناً دو سال کے بعد اُن کے کسی بدخواہ نے زہر آلود کھانا کھلا کر
اُن کا چراغِ زندگی گل کر دیا۔

مخدرۂ عظمیٰ نواب عالم آرا بیگم صاحبہ

یہ سلطانِ عالم واجد علی شاہ کی بیاہتا بیوی تھیں۔ جب موصوف نے پندرھویں
سال میں قدم رکھا تو والدین کو اُن کی شادی کی فکر ہوئی۔ اولاً نواب منیر الدولہ
ابن مرزا ابو طالب خاں ساکن گڑھیا چودھری کی دختر سے شادی کی تجویز ہوئی
مگر آخر میں چند وجوہات سے انکار کر دیا گیا اور وہ لڑکی واجد علی شاہ کے چھوٹے
بھائی سکندر حشمت مرزا جواد علی کو منسوب ہو گئی۔ اس کے بعد سیف الدولہ میر بادی
چکلہ دار گونڈہ و بہرائچ فرزند سید زین العابدین کی بیٹی کے ساتھ تجویز ہوئی مگر وہ
بھی چند وجوہ سے معطل رہی۔ پھر اُن کی ایک نسبتی چچی نذیر صاحبہ بنت میر کلن
کی بیٹی سے نسبت کا پیام دیا گیا مگر اس لڑکی کے جسم پر سفید داغ تھے جن کو پوشیدہ
رکھا گیا تھا۔ یہ راز ظاہر ہونے پر یہ نسبت بھی ترک ہو گئی۔ مابعد ایک مشاطہ جانی

خانم کی معرفت نواب علی خاں کی دختر عالم آرا بیگم کے لیے پیام دیا گیا جو برائی خانم کے بطن سے تھیں، یہ سید احمد علی خاں کے بیٹے اور مدار الدولہ کرادل سید یوسف علی خاں کے پوتے تھے۔ نواب علی خاں نے یہ نسبت بخوشی منظور کر لی۔

چنانچہ ۱۵ شعبان ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۳۶ء کو بزمانہ شہریاری شاہ نصیر الدین حیدر مانجھے کی رسم ادا ہوئی مگر اُسی زمانہ میں دلہن کی چچی اور واجد علی شاہ کے چچا ناصر الدولہ اصغر علی خاں پسر نواب ممتاز الدولہ نے سفر آخرت اختیار کیا۔ اس وجہ سے شادی قریباً دو ماہ تک ملتوی رہی اور مانجھے کے کپڑے جو واجد علی شاہ پہنے تھے بہت کثیف ہو گئے۔ دو مہینے کے بعد تقریباً فروری ۱۸۳۷ء میں شادی نہایت دھوم دھام تزک و احتشام سے ہوئی، دولہن کو سسرال سے نواب اعظم بہو خطاب ملا مگر عام طور سے نواب خاص محل صاحبہ کے لقب سے مشہور ہوئیں۔ شروع میں واجد علی شاہ اُن کے اوصاف حمیدہ و اطوار جمیلہ کے بہت مداح تھے چنانچہ خود وہ لکھتے ہیں:-

مہِ روشنِ آسمانِ حشم — لب اُن کے کہ مفتاحِ بابِ کرم
کفِ فیض دریائے جود و سخا — ہنرور، خردمند، صاحب ذکا
مُرادِ دلِ آسمان و زمیں — خدا جانتا ہے کہ ثانی نہیں
درِ فیض سے ہیں تونگر گدا — رہا کون دنیا میں اب بے نوا
انہیں لب دعا دفعتاً ہو قبول — علی اُن کے یاور ہیں حامی بتول
یمِ عفت و عصمت و عز و جاہ — نگاہِ کرم سے خجل مہر و ماہ
وہ صاحب حیا سایہ دیکھیں اگر — اُڑے خوف سے رنگِ شمس و قمر
حمیت کا اُن پہ ہوا خاتمہ — لیاقت کا اُن پہ ہوا خاتمہ

صداقت ہے ادنیٰ سی اُنکی کنیز   ادب خانہ زاد شعور و تمیز
حدیقہ میں عصمت کے تازہ بہار   بدیع جہان نادرِ روزگار

مگر میاں بیوی میں جو پیار و اخلاص ہونا چاہیے وہ صرف پانچ ماہ تک قائم رہا شادی کے پانچویں مہینے نصیر الدین حیدر بادشاہ نے انتقال کیا اور محمد علی شاہ نے تخت نشین ہو کر اپنے بڑے بیٹے امجد علی شاہ پدر واجد علی شاہ کو اپنا ولی عہد مقرر کیا۔ امجد علی شاہ نے اپنی جیب خاص سے اعظم بہو کے چار سو روپیہ ماہوار مقرر کر دیئے۔

اس زمانہ میں واجد علی شاہ اکثر اوقات اعظم بہو کی خادماؤں سے پوشیدہ طور پر چھیڑ چھاڑ اور ہنسی مذاق کیا کرتے تھے۔ محل مذکور کو یہ بات از حد گراں گزرتی تھی اسی سبب سے انھوں نے چند عورتوں کو اپنی ملازمت سے برطرف کر دیا۔ اور شوہر سے لڑ کر اُن کی نگہداشت کے لیے چوکی پہرہ بٹھا دیا۔

نواب خاص محل سے کشیدگی کی وجہ واجد علی شاہ نے یہ بتائی ہے کہ چونکہ میرا عنفوان شباب تھا اس لیے جوشِ جوانی اور ولولہ طبیعت کی وجہ سے یہ خیال گزرا کہ کسی طرح شباب بھری جمال اور حور تمثال عورتوں کی صحبت میں بسر کرنا چاہیے مگر کوئی تیر تدبیر نشانہ پر نہ پڑتا تھا۔ آخر کار یہ بات ذہن میں آئی کہ قطع وار وطرحدار عورتیں بطریق خدمت گزاری نوکر رکھ کر اُن سے خفیہ طور پر رابطہ محبت پیدا کر دوں۔ اس خیال سے دلِ مضطر کو کچھ قرار آ گیا اور میں نے حکمتِ عملی سے کام لے کر ایک عورت موتی خانم نامی دُبلی پتلی گیہواں رنگ، بڑی بڑی خوشنما آنکھیں، کشادہ ابرو، چست و چالاک، تیز مزاج نوکر رکھی جس کی آنکھوں پر چیچک کے داغ بھی تھے۔

بظاہر تھی وہ صرف خدمت گزار   بہ اخفا ملا لطف بوس و کنار

اس سے قبل وہ مرزا نصیر الدین حیدر مرحوم کی سرکار میں جلسہ والیوں میں ملازمت کر چکی تھی، چونکہ اس کو میں نے اس حیلہ سے محض اپنی دلبستگی کے لیے نوکر رکھا تھا۔

اس وجہ سے اعظم بہو کو بیحد ناگوار گزرا۔ اُنھوں نے بہت کچھ شور و غل مچانا شروع کیا جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ ملازمت سے برطرف کر دی گئی اور مجھ پر والد صاحب کا عتاب نازل ہو کر نظربند کر دیا گیا اُس کے بعد میں نے مجبوراً گوشہ نشینی اختیار کر کے اپنے دل کو شعر و شاعری کی طرف رجوع کیا اور اُس عورت کے عشق میں بوجہ ولولہ طبیعت اور جوش شباب دو دیوان اور تین مثنویاں نظم کیں مگر والد کی ناراضگی کی وجہ سے زندگی تلخ ہو گئی میں نے ضد کی کہ جب تک موتی خانم مجھے نہ مل جائے گی اس وقت تک مجھ پر کھانا پینا حرام ہے۔ جب یہ حال والد ماجد پر ظاہر ہوا تو انھوں نے ارشاد فرمایا کہ وہ عورت میرے حوالے کر دی جائے مگر اس شرط سے کہ کسی دوسرے مکان میں رہے اور میں سلام و مجرے کو بھی نہ حاضر ہوا کروں۔ اس حکم کے صادر ہوتے ہی موتی خانم میری خدمت میں حاضر کر دی گئی مگر میں نے اُس سے کنارہ کشی کر کے والد ماجد کی خدمت میں عرض کی کہ غلام ہر طرح سے مطیع و فرماں بردار ہے خلاف مرضی کوئی کام نہیں کر سکتا۔ یہ پیام سن کر فرمایا کہ اس کو بخوشی خاطر اپنے پاس سے جدا کر دو۔ اس حکم کے سنتے ہی میں نے اس کو علیحدہ کر دیا۔ اس وقت میرا سن اٹھارہ برس کا تھا اسی صدمہ کی وجہ سے میں نے اپنے محل کی طرف پھر کبھی چشم لطف سے نہیں دیکھا اور اُن کی جانب سے دل میں شدید رنج آ گیا۔ اپنے انھیں خیالات کو موصوف نے اس طرح نظم کا جامہ پہنایا ہے:۔

یہ خاطر غم و رنج میں گھر گئی　　محل سے طبیعت مری پھر گئی
ہوا رنگ کچھ اور ہی جلوہ گر　　نہ مائل طبیعت نہ سیدھی نظر
رکاوٹ کے ساماں نمودار تھے　　غبار و کدورت کے آثار تھے

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"چوں کہ وہ زیور عشق و شعور سے آراستہ تھیں فوراً تاڑ گئیں کہ اس برہمی کا

سبب کل میرا ہی کیا دھرا ہے ۔ بغیر شوہر کو خوش رکھے آرام سے زندگی بسر کرنا مشکل ہے چنانچہ بمصداق ۔ ؎

لگی آگ گھر میں خبر چاہیے
مداوائے سوز جگر چاہیے

بڑی دل جوئی اور تشفی سے ظاہر کیا کہ اگر تمہارا مزاج میری جانب سے کچھ مکدر ہے تو میں تمہارا ہر امر پوشیدہ کرنے کو تیار ہوں جس سے تمہارا جی چاہے محبت کی پینگ بڑھاؤ ۔ چوں کہ اس وقت میرا دلی منشا پورا ہوتا تھا اس لیے میں نے کہا خیر اگر تم خود ایسا کہتی ہو تو بہتر ہے "

سنہ ۱۸۴۲ء میں جب بعد انتقال حضرت محمد علی شاہ حضرت ثریا جاہ امجد علی شاہ تخت نشین ہوئے تو اُسی زمانہ میں صاحب خانم اور مجھ سے رابطہ اتحاد و ملاقات بڑھا ہوا تھا ۔ یہ ایک گانے والی شوہر دار عورت تھی جو حضرت ثریا جاہ کی ملازم تھی ، رنگ سرخ و سفید ، پستہ قد ، کسی قدر کشادہ دہن ، چشم و ابرو بے مثال ، سر کے بال ہر وقت کھلے ہوئے دونوں کندھوں پر پڑے رہتے تھے ۔ مگر اس بیباختگی پہ بھی ہزار دل بنادِ قربان تھے ۔ گاتی ناچتی اور گنجیفہ خوب کھیلتی تھی ۔ اس کا سن تیئیس برس یا اس سے کچھ زیادہ تھا ۔ دو یا تین لڑکیاں بھی تھیں اس عورت سے مجھے محبت پیدا ہوئی اور اُسے بھی میرے ساتھ اتنی اُلفت تھی کہ بغیر میری صورت دیکھے ہوئے رات کو سوتی نہ تھی اور میرے واسطے اپنے ہاتھ سے گلوریاں بناتی تھی ؎

لگا کر کبھی پان لاتی تھی وہ
محبت کا بیڑا اٹھاتی تھی وہ

میں اُسے دو ایک روپے روز دیا کرتا ۔ اعظم بہو اس معاملہ سے پورے طور سے واقف تھیں مگر اُن کے تیور میلے نہ ہوئے بلکہ ایک روز مجھ سے دریافت کیا کہ تمہاری

یہ تعلق تو تمہاری مرضی کے موافق ہوا۔ میں نے جواب دیا کہ تمھیں دوسروں کے ملازموں سے کیا مطلب، یہ میرے مقدر کی یاوری ہے اگر تم کوئی عورت میری ملاقات کے لیے تجویز کرتیں تو البتہ تمہارا شکر گزار ہوتا۔

چوں کہ وہ عاقلہ اور فرزانہ تھیں اس لیے بخوبی سمجھ گئیں کہ بغیر میری اطاعت و فرماں برداری کیے ہوئے اُن کا کوئی مطلب نکلنا دشوار ہے اس لیے میری دل جوئی کرنے کو پری خانہ کے لیے قطع دار وضع دار عورتیں فراہم کرنا شروع کر دیں اور وہی پری خانہ کی مہتمم مقرر ہوئیں، جو عورتیں اُن کی معرفت پری خانہ میں داخل ہوئیں اُن میں عجائب خانم طوائف المخاطب بہ عجائب پری (۲) سکھ بدن والی المخاطب بہ وزیر پری۔ (۳) شاہ بخش خواص (۴) الطاف بخش خواص (۵) نور افشاں پری و بلقیس پری وغیرہ تھیں۔

چونکہ پری خانہ کا ذکر آگیا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ حالات اس کے بھی مختصر طور پر بیان کر دیئے جائیں۔

موتی بیگم بے کنارہ کشی کرنے پر واجد علی شاہ نے اٹھارہ کمسن و طرحدار جنبوریردار عورتیں دارو غہ نجم النساء کی معرفت ملازم رکھیں جن میں سب کی سب دولت حسن سے مالا مال تھیں، اُن کو "حضور والیوں" کا خطاب عنایت کیا۔ دو برس تک ان سبھوں سے سلسلۂ اُلفت قائم رہا مگر یہ لوگ مکر و فریب کی پتلیاں تھیں، اپنے دوسرے چاہنے والوں سے بھی پوشیدہ طور پر ملتی رہتی تھیں۔ ایک ہفتہ ولی عہد کے یہاں رہ کر جو انعام و اکرام پاتی تھیں وہ دوسرے ہفتے اپنے مکان پر رہ کر غیروں کو کھلا دیتی تھیں اس پر طرہ یہ کہ ولی عہد کی ہمدم و غم گسار بنتی تھیں۔ جب یہ رازِ سربستہ آشکارا ہوگیا تو کل یک دم برطرف کر دی گئیں۔

اس کے بعد ایک پری خانہ قائم کرنے کی دُھن دل میں سمائی جس کے لیے

نہایت شوخ و شنگ نازک ادا قمر طلعت عورتیں فراہم کی گئیں اُن کے قیام کے لیے در دولت کے قریب ایک پُر تکلف مکان منتخب کیا گیا۔ یہ عمارت اس مقام پر بیان کی جاتی ہے جہاں پر ۱۸۶۴ء میں کیننگ کالج قائم ہوا تھا۔ جس کے سامنے ہی قیصر باغ میں سنگ مرمر کی نہر اور پل ہے۔ اتفاقات زمانہ سے اب پھر اسی مقام پر کیننگ کالج کی عمارت میں ہندوستانی موسیقی کا میرس کالج قائم ہوا تھا۔

پری خانہ کے لیے یہ عمارت بہت مختصر تھی مگر صفائی اور آراستگی کی وجہ سے رشک فردوس بن گئی تھی۔ صحن میں سنگ مرمر کا فرش تھا جس پر چینی کے نفیس نفیس گُلدستے قرینہ سے جا بجا رکھے تھے۔ جگہ بجگہ تختوں کے چوکے بچھے تھے۔ جب مکان جھاڑ فانوس پردوں اور دیگر آرائشی سامان سے سج سجا کر دُلہن کی طرح آراستہ ہو گیا تو اُس کو پری خانہ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ پریوں اور سازندوں کا قیام اسی میں تھا۔ ڈیوڑھی پر ترکنیں پہرہ دینے کو متعینات کی گئیں۔ تاکہ سوائے مخصوص آدمیوں کے وہاں پرندہ تک پر نہ مار سکے۔ پریوں کے لیے زرق برق اور رنگ برنگ پوشاکیں بھی تیار ہوتی تھیں۔ ان مشاغل میں کئی لاکھ روپیہ سالانہ صرف ہوتے تھے اور روزمرہ دو دو تین تین پہر ولی عہد کی غلام رضا۔ کھمّن۔ چھجو خاں ثابت علی وغیرہ سفردائیوں سے صحبت عیش و نشاط گرم رہتی اور پریوں کی تعلیم ہوا کرتی۔ ولی عہد خود بھی علم موسیقی کے قواعد حاصل کرنے میں بدل مشغول و مصروف رہتے۔ چنانچہ انھوں نے ستار بازی اور طبلہ نوازی میں اتنی مشق بہم پہونچائی تھی کہ سُننے والے غرق حیرت ہو جاتے تھے۔

پری خانہ آراستہ ہونے کے بعد ولی عہد نے ارادہ کیا کہ فن موسیقی کے

Marris Collage of Hindustani music

قواعد بھی مرتب کیے جائیں جس پر رفقا و مصاحبین نے عرض کیا کہ اس کام کے لیے بھی پری رو اور خوش گلو طوائفیں تلاش کی جائیں جن کو موسیقی میں کافی ملکہ حاصل ہو اور تان لگانے میں تان سین کو مات کرتی ہوں چنانچہ اس کے لیے ایک نئی اصطلاح اختراع کی گئی یعنی جب کوئی طرح دار البیلا معشوق کسی رفیق کے ہاتھ لگے تو وہ اس کو بطور معروضہ پیش کرے جس سے یہ مراد لی جاتی تھی کہ فلاں نا چنے یا گانے والی عورت حضور کے گھر پڑنے کو رضامند ہے غرض کیا تھا مصاحبین اور متوسلین ولی عہد کے مزاج میں رسوخ پیدا کرنے اور سرخ روئی جتانے کو منتخب روزگار دلربائی زمانہ معشوق جستجو اور تلاش کر کر کے لاتے اور "معروضہ" کے نام سے اُن کی خدمت میں پیش کرتے۔ ولی عہد سب شرطیں طے کر کے ان کے قیام کے لیے مکان تجویز کرتے اور تنخواہ مقرر کر دیتے۔ اس طور پر شب و روز جلسہ ارباب نشاط رہتا غم والم پاس نہ پھٹکتا۔ جس وقت سب گل اندام اور خوش گلو پریاں حلقہ باندھ کر بیٹھتی تھیں اور اُن کے بیچ میں ولی عہد رونق افزا ہو کر ستار بجاتے تھے اور وہ سب آواز ملا کر کوئی چیز گاتی تھیں تو راجہ اندر کے اکھاڑے کا لطف آ جاتا تھا۔

ان پریوں میں اکثر حاملہ ہو کر محل کے رتبہ پر فائز ہوئیں بہت سی نازو انداز میں گوئے سبقت لے گئیں۔ اس رابطہ محبت کو دیکھ کر نواب خاص محل نے اپنے کشت دل میں خار الم بونا شروع کیا اور در پردہ آتش رشک شعلہ پذیر ہوئی اس لیے ہر ایک سے طعنہ زنی اپنا شعار کر لیا چنانچہ کبھی اُن کی پوشاک میں تصرف کرتیں کبھی آراستگی زیور میں فتور کرتیں، کبھی کسی سے لڑائی کا ارادہ کرتیں۔ کبھی کسی کو تنگ و عاجز کرتیں۔ اس وجہ سے اُن کی آراستگی و اہتمام میں فرق آنے لگا آخر کار واجد علی شاہ نے ان کی آراستگی و پیراستگی کی خدمت محمد حسین علی خاں خواجہ سرا کو سپرد کر کے اُسے معتمد علی خاں کا خطاب عطا فرمایا پھر بعد تخت نشینی

نے دیانت الدولہ کے خطاب سے ممتاز فرمایا۔

۱۳ فروری ۱۸۴۷ء کو حضرت امجد علی شاہ کے انتقال پر واجد علی شاہ مالک تاج و تخت ہوئے۔ صاحب اقتدار ہونے پر انھوں نے خاص محل کو ملکہ مخدرۂ عظمیٰ نواب بادشاہ محل صاحبہ خطاب دے کر مبلغ پانچ ہزار روپیہ درماہہ مقرر کر دیا مگر کسی دوسرے محل کی تنخواہ تین ہزار روپیہ سے زیادہ نہ مقرر کی۔

یوم عاشور کو تعزیوں کی زیارت موصوفہ "خورشید باغ" سے کرتی تھیں جو کربلائے تالکٹورہ کے باہر متصل سڑک واقع تھا۔

بعد زوال سلطنت جب بتاریخ ۵ رجب ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۶ء واجد علی شاہ کلکتہ کو سدھارے تو خاص محل بھی اُن کے ہمراہ کلکتہ چلی گئیں پھر جب بزمانۂ غدر بادشاہ فورٹ ولیم میں زیر حراست کر دیے گئے تو بحالت اسیری بھی برائے مصارف خاص محل کو مبلغ پینتالیس ہزار چار سو روپے دیئے مگر اُن سے نشانی کی کوئی چیز طلب نہ کی۔ حالانکہ دوسری بیگمات سے اُنھوں نے غم غلط کرنے کو کوئی نہ کوئی چیز ضرور طلب کی تھی بلکہ برخلاف اس کے ملکہ کشور اچھی جان بیگم مقیم لکھنؤ کو اُنھوں نے ایک خط میں کلکتہ سے شکایتاً تحریر کیا کہ خاص محل کا حال لکھو! پچاس ہزار نقد مار لیے اور سانس بھی نہیں لی۔ اُن کو سونا بھیجنے کو دیا تو اُلٹے ہم سے گلہ کرنے لگیں کہ خریدار دام نہیں دیتا۔ آپ الگ ہو رہیں اور ہم کو بھر دادیا۔ مگر باوجود ان باتوں کے خاص محل کے یہاں سے روزمرہ ایک خوان کھانے کا اور پانچ گلوریاں بادشاہ کے لیے فورٹ ولیم جایا کرتی تھیں۔

اسٹیشن چارباغ کے قریب عالم باغ انھیں بیگم صاحبہ کے نام سے واجد علی شاہ نے تعمیر کرایا تھا جو بطور یادگار جو ابتک قائم ہے اجڑی ہوئی صورت میں

---

۵۷ اسی دیانت الدولہ نے محلہ منصور نگر لکھنؤ میں ایک کربلا تعمیر کرائی تھی۔

موجود ہے۔ باغ کے چاروں طرف چہار دیواری تھی اور اُس کے اندر ایک دو منزلی عمارت بطور رہائشی قیام گاہ کے تعمیر کرائی تھی بعد انتزاع سلطنت یہ باغ بھی ضبطی میں آگیا۔ نواب خاص محل نے اس کی واگزاری کے لیے عذرداری بھی کی مگر آخر میں ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔

موصوفہ کو شعر و سخن سے بھی ذوق تھا، عالم تخلص کرتی تھیں۔ ایک دیوان موسومہ "ریاض عشاق" اور ایک مثنوی بنام "مثنوی عالم" یادگار ہے۔

نمونۂ کلام حسب ذیل ہے

نہیں ایک وضع پر یہاں کا رنگ
عارضی ہے فقط یہاں کا رنگ

خود غرض ہوتے ہیں جہاں کے دوست
جب غرض نکلی پھر کہاں کے دوست

ہے شب وصل مگر دل میں ہے دھڑکا عالم
بول اُٹھے نہ کہیں مرغ سحر آج کی رات

تیرے تیور غضب کی چتون ہے
افاہ اللہ آج جوبن ہے!

غیر دل سے ربط تم نے کیا ہے اگر شروع
انصاف سے کہو یہ کیا کس نے شر شروع

سب کو رکھا ہمیشہ یوں ہی غم میں مبتلا
کس کا ہوا جہاں میں بھلا دوستدار عشق

اے دل تو آئیو نہ کبھی اُن کے پیچ میں
ہو جائے اب نہ تیرے گلے کا یہ ہار عشق

کیا تماشا ڈر آتا ہے مرنے سے تو مجھے
عاشق وہی ہے جان کا جس کو خطر نہیں

ہم مثل سرو باغ جہاں میں ہیں ناامید
سرسبز دیکھنے میں ہیں لیکن ثمر نہیں

خود ہوئے رسوا مجھے رسوا کیا
جس جگہ بیٹھے مرا چرچا کیا

گر یہی قسمت میں صدمے تھے لکھے
مجھ کو کیوں اللہ نے پیدا کیا

الٰہی دنیا سے اُٹھی رسم وفا
نام سے الفت کے شرماتے ہیں ہم

جو کرے وہ ظلم زیبا ہے تمہیں
دل لگانے کی سزا پاتے ہیں ہم

یہ غزل اُن کی بہت ہی مشہور ہے۔

کب تک تری جدائی کے صدمے اٹھائے دل
ہر روز کے ستم کی کہاں تاب لائے دل

در در پھرا رہا ہے یہ آغازِ عشق میں — آخر کو دیکھیے مجھے کیا کیا دکھائے دل
ہنستے ہو میرے حال پہ کیا جائے رحم ہے — اللہ اس طرح نہ کسی کا پھنسائے دل
دیوانہ کوئی کہتا ہے، وحشی کوئی ہمیں — سب کچھ سنیں گے شکر ہے جو کچھ سنائے دل
لائی ہے پیچ میں یہ ہزاروں کو بے گناہ — پھندے سے زُلفِ یار کے خالق بچائے دل
تا چند تنگ دل یہ دل آزاریاں تری — رنجیدہ اس قدر نہیں کرتے پرائے دل
جو کچھ کرو ستم وہ سزاوار ہے تمھیں — قابل اسی کے ہم ہیں یہی ہیں بنائے دل
آجائے گر وہ غیرتِ گُل سیرِ باغ کو — سینہ میں اس خوشی سے نہ پھولا سمائے دل
بے وجہ آنکھ آپ نے عالم سے پھیر لی — خونِ جگر نہ آنکھوں سے کیونکر بہائے دل

واجد علی شاہ کے نواب خاص محل سے ایک بیٹی اور چار بیٹے حسب ذیل ہوئے

(۱) خسرو مرتبت دارا شوکت نوشیرواں قدر مرزا حیدر علی پسر اکبر۔ یہ گونگے بہرے مجنون و مصروع تھے جس کی وجہ سے عموماً زیر حراست رکھے جاتے تھے۔ اُن کی اسی معذوری کے سبب سے باوجود اولاد اکبر ہونے کے واجد علی شاہ نے اپنے پسر دوم مرزا محمد جاوید علی کو ولی عہد قرار دیا تھا۔ نوشیرواں قدر کی شادی بتاریخ ۲۰ فروری ۱۸۴۸ء بہ فہمائش حضور عالم نواب علی نقی خاں وزیر اعظم محض خوشنودی والدین کے لیے نواب خاص محل کے سگے چچا نواب اکرم الدولہ محکم الملک حسین مرزا خاں کرامت جنگ کی دختر سے بڑی دھوم دھام اور تکلفاتِ شاہانہ سے ہوئی تھی دُلہن بہت شرمیلی اور قبول صورت تھی۔ سسرال سے اُسے ملکہ معظم، تاج عالم، بلقیس جہاں، مریم دوراں، مباہات النساء دولت آرا، نواب شہر یار بہو صاحبہ خطاب ملا تھا۔ مگر جب آرسی مصحف کے لیے نوشاہ اور دُلہن کے اوپر زرد وزی ڈوپٹہ ڈال دیا گیا تو دُلہن نے چیخ چلاہٹ سے

۱؎ حزن اختر واجد علی شاہ۔

آسمان سر پر اُٹھا لیا جس سے سب مہمان ہکا بکا ہو کے رہ گئے اور دلہن درد خوف سے بیہوش ہو گئی، وجہ یہ ہوئی کہ جب وہ توں وہ پٹہ کے اندر نظروں سے اُدجھل تھے۔ تو فاترالعقل نوشاہ نے دُلہن کی نتھ بیدردی سے نوچ کر اس کو سخت مجروح کر دیا اور مار پیٹ بھی کی۔ اس واقعہ کے بعد نہ دُلہن رُخصت کی گئی اور نہ شوہر کے ساتھ رہنے پر مجبور کی گئی۔ نوشیرواں قدر بعمر تخمیناً بیس سال ۱۸۵۷ء کے غدر میں بمقام قیصر باغ بندوق کی گولی کا نشانہ ہو گئے۔ اُن کی رحلت کے بعد بادشاہ نے شہریار بہو کا عقد ثانی اپنے تیسرے بیٹے کیوان قدر مرزا حامد علی سے کر دیا۔

(۲) ابوالحرب فغفور جاہ خاقان حشم صاحب عالم مرزا محمد جاوید علی بہادر یہ واجد علی شاہ کے دوسرے شاہزادے تھے۔ بوجہ معذوری پسر اکبر بادشاہ نے انھیں اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا۔ موصوف کئی مہینے تپ دق میں مبتلا رہے آخر میں مستقی بھی ہو گئے۔ طبیبوں نے بخیال بدنامی خوب صورتی کے ساتھ علاج سے دست کشی اختیار کی چنانچہ ڈاکٹری علاج کی تجویز ہوئی۔ ایک روز ڈاکٹر اسپر بجر (Dr. Sprenger) مع ڈاکٹران چھاؤنی شہزادے کو دیکھنے آئے مریض نے کل حالت شیریں کلامی سے بیان کی، ڈاکٹر صاحب خود ناامید تھے بیماری طول پکڑ چکی تھی نسخہ لکھ کر چلے آئے مگر کوئی فائدہ نہ ہوا، اس کے بعد چیچک بھی نمودار ہوئی۔ اسی کی شدت موت کا حیلہ بن گئی۔ ۲۶ مئی ۱۸۴۹ء کو قریب شام شاہ منزل میں نقل مکان کیا تھا اس کے نویں دن یعنی چوتھی جون کو انتقال کیا۔ چار بجے صبح کو امجد علی شاہ اپنے دادا کے پہلو میں امام باڑہ سبطین آباد واقع حضرت گنج میں دفن ہوئے۔ اس خبر کو واجد علی شاہ کی ناسازی طبیعت کی وجہ سے اُن سے پوشیدہ رکھا مگر اس روز بادشاہ

بمقابلہ اور دنوں کے بہت افسردہ خاطر اور مضطرب الحال رہے۔ خاصہ نوش کرتے وقت فرمایا آج میرے حلق سے نوالہ نہیں اترتا اور دل خود بخود اترا آتا ہے اس کا کیا باعث ہے مگر خادموں نے باتوں میں لگا لیا آخر سوم کی شب کو بادشاہ کی والدہ نے اس راز کو ظاہر کر دیا اور کلمات صبر و شکیبائی بھی فرمائے۔ بادشاہ یہ سن کر بہت بیتاب ہوئے، مرزا جاوید علی کا سن بوقت انتقال دس برس پانچ مہینے کا تھا منشی احمد حسن نے تاریخ وفات کہی جو درج ذیل ہے۔

رفت از دنیا ولی عہد شہنشاہ جہاں	جوہر تیغ خلافت تہ نشیں شد ہائے ہائے
شد بزیر خاک پنہاں وارث تاج و نگیں	خاتم دست سلیماں بے نگیں شد ہائے ہائے
زیب دامان جناب حضرت خاقان ہند	زینت آغوش پاک حمد حسیں شد ہائے ہائے
گفت ہاتف مصرعہ سال وفاتش اے حسیں	ماہ اوج سلطنت زیر زمیں شد ہائے ہائے

(۳) ابوالنصر کیواں قدر ہمایوں جاہ حشمت صاحب عالم محمد حامد علی بہادر، یہ نہایت ذہین اور خوش رو آدمی تھے۔ ۱۲۹۵ھ میں ولی عہد مقرر کیے گئے۔ اُن کی شادی اُن کے پھوپھا نواب سرفراز الدولہ کی بیٹی سے ماہ اکتوبر ۱۸۸۰ء میں ہوئی ۱۸ اکتوبر کو بارات گئی اور ۱۹ اکتوبر کو دلہن رخصت ہو کر آئی۔ دلہن کا لقب بادشاہ بہو قرار پایا، بادشاہ اُس روز حسب دستور رنگین جامہ پہنے اور تاج شاہی زیب فرق کیے تھے۔ سب اقربا اور ارکین دولت بھی نہایت بیش قیمت سرخ لباس میں ملبوس تھے۔ جلوس سواری نہایت پر تکلف اور شاندار تھا، ہجوم اہل شہر سے کوچہ و بام بھرے ہوئے تھے۔

مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف فسانۂ عجائب شاہ اودھ واجد علی شاہ کے ہمعصر تھے۔ انھوں نے اس شادی کا جلوس بچشم خود دیکھا تھا چنانچہ وہ اپنی دوسری تصنیف فسانۂ عبرت میں اس کا تذکرہ اپنے طرز خاص میں اس طرح کرتے ہیں۔

۱۹؍ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ یکشنبہ کو ولی عہد بہادر کی شادی ہوئی، خانہ آبادی ہوئی مانجھے کے دن وہ روشنی کا سامان ہوا کہ آسمان جس کو دیکھ کر حیران ہوا۔ دردولت سے تا حسن باغ[1] دو رویہ نور کے ٹھاٹھر گڑے تھے۔ جابجا ترپولیے بنے۔ شامیانے زرق برق تنے۔ اُن میں ناچ ہوتا تھا۔ مزدور روشنی کو کھڑے تھے ٹھاٹھروں کے تلے دو طرفہ تیل کی نہریں جاری۔ اشرفی بیاری جن کے گھر میں پرسوں چراغ نہیں جلا وہ گھڑوں تیل لے گئے، بے پوچھے کپتوں سے اُنڈیل لے گئے۔ تیل کی وہ ریل پیل تھی کہ شام کو تیلیوں نے کوڑیوں کے مول لیا صبح کو پھر سرکار میں روپے سے کر تول دیا۔

ساچق کے دن اتنے مزدور نزدیک و دور سے بلائے گئے کہ شہر کی گرد و نواح کی بستیاں ویران ہو گئیں، پھر دن رہے سے تا صبح چھ گھڑے چاندی سونے کے گنگا جمنی اور تخت آرائش کے اُٹھے اس پر بہت نہ جا سکے۔ مہندی کا بھی یہی رنگ ہوا۔ کشتیاں خوان مزدور اُٹھا نہ سکے وہ کشمکش وہ بھیڑ تھی کہ لوگوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، سرِ شام گھر کا رستہ بھول گئے۔ اربابِ نشاط کی ایسی کثرت تھی کہ فقط سلام کی بار میں رات تمام ہوئی۔ مجرا کرنے کی سب کو حسرت تھی۔ ۱۹؍ ذی الحجہ چہارشنبہ کا دن گزرا تو برات کی باری آئی آتشبازی چھوڑنے کا حکم پہونچا گو سرِ شام سے دولہا کے چلنے کا اہتمام ہوا پر باتوں باتوں دس رات کا بکھیڑا اتمام ہوا، پہروں چڑھے تک چراغوں کا جلوہ بدستور رہا، دفعتاً فوج شاہی سجی سجائی نمودار ہوئی، غل ہوا کہ وہ برات آئی خلقت دیکھنے کو تیار ہوئی، فوج تھی یا بحرِ حشمت کی موج تھی، بہ پیادہ دس ہزار سوار دس ہزار نقیب چوبدار و بانے بائیں قطار در قطار، نوبت نشان، ماہی مراتب اور جلوس کا سامان جب گزرا تو ایک ابر سیاہ

---

[1] حسن باغ گومتی کے اُس پار تھا جہاں پر اب میڈیکل کالج کا بورڈنگ ہاؤس (دارالاقامہ) تعمیر ہوا

اُس کے پردہ میں کچھ مہرو ماہ دور سے نظر آتے۔ بچشم زدن وہ طلسم تازہ نزدیک آ پہونچا غور کر کے جو دیکھا تو ایک بگھی تھی بشکل جہاز مگر سر تا پا، نیا انداز، اُس پر پریوں کا غول، لباس مفرق نہایت ٹھٹھول، پر پرواز بصد انداز لگائے۔ دفعتہ بجلی سی چمک گئی، سبحان اللہ کا شور بلند ہوا بگھی آنکھوں سے نہاں ہوئی۔ پھر ہاتھیوں کے ڈل، ہودج، عماریاں، مکلّل، ہر شخص بالباس، گلنار سب کے سب طرحدار، سُرخ سُرخ جامے، زربفت کے پاجامے جیغہ کلغی سرپیچ گوشوارے دریائے جواہر میں غرق ماہ پارے سب اسباب عنایت سرکار، پہنے آگے پیچھے بائیں دہنے بیچ میں نیں فلک رفعت اُس پہ حضرت قدر قدرت نوشاہ کو گود میں بٹھلائے۔ دست گوہر بار اُٹھائے۔ اشرفیاں لٹاتے روپے کا مینھ برساتے اس شان سے تشریف لائے

ان بیوی کے سے ولی عہد کے تین بیٹے ہوئے۔ آغا مرزا احمد نوح بہادر اور دو بعد ولادت بچپن ہی میں راہی ملک بقا ہوئے۔

دوسری بیوی نواب بیگم مخاطب بہ کوکب محل تھیں، یہ اُن کے مصاحب مرزا جلال الدین حیدر خاں عرف آغا حجو شرف کی نواسی تھیں۔ ان بیوی سے دو بیٹے شہنشاہ مرزا اور مرزا قرۃ العین ہوئے اور دو لڑکیاں۔ بڑی لڑکی جو بڑی بیگم کے نام سے موسوم تھی صغر سنی میں مر گئی۔ دوسری بیٹی دل بند بیگم تھیں۔

ان کی تیسری بیوی مرزا نوشیرواں قدر کی بیوہ شہریار بہو تھیں ان سے صرف ایک لڑکی ہوئی جو چند روز کے بعد جاتی رہی۔ ان تین منکوحہ بیویوں کے علاوہ اُن کی تین ممتوعہ بیگمیں بھی تھیں۔ ایک سے قرا احمد مرزا عرف بڑے مرزا تھے دوسری سے قرا شیر مرزا عرف چھوٹے مرزا اور تیسری حیدری بیگم بے اولاد تھیں۔

شہزادہ موصوف کو شعر گوئی کا بھی شوق تھا۔ کوکب تخلص کرتے تھے۔ دیوان ۱۲۸۱ھ میں چھپ کر شائع ہوا۔ ۱۸ر جون ۱۸۵۶ء کو اپنی دادی ملکہ کشور صاحبہ

(۳) مرزا اسکندر حشمت کے ہمراہ سلطنت کی واپسی کی کوشش کرنے لندن گئے مگر وہاں کا ذبیحہ کبھی استعمال نہ کیا۔ اگر کہیں دعوت میں بلائے گئے تو صرف میوہ جات نوش کیے گوشت کو کبھی ہاتھ نہ لگایا۔ ولایت میں رہ کر انگریزی بولنے کی خوب مہارت ہو گئی تھی۔ لب و لہجہ بھی انگریزوں جیسا ہو گیا تھا۔ ۲۹ ستمبر ۱۸۵۹ء کو لندن سے ناکام واپس آئے۔ وہاں سے آنے پر پندرہ سال تک کلکتہ میں زندہ رہے بعمر تخمیناً ۳۲ سال ہیضہ سے دہیں انتقال کیا۔ امام باڑہ سبطین آباد میں دفن ہوئے۔ اُن کی ایک تصویر لکھنؤ کے عجائب خانہ میں موجود ہے۔ رنگت گوری چہرہ خوب صورت بھرا ہوا۔ ہاتھ پیر گول، قد موزوں، سر پر تاج زریں، گلے میں عبا اس کے نیچے اچکن اور پیروں میں مرزائی پائجامہ اور پھندنے دار زردوزی کام کی پاپوشیں ہیں

(۴) مرتضیٰ بیگم دختر جو صرف چالیس دن زندہ رہ کر فوت ہو گئی اور (۵) مرزا بیدار بخت جو صغر سنی ہی میں چل بسے ۲۰ جون ۱۸۹۲ء کو خاص محل نے اپنی جائداد کے متعلق ایک وصیت نامہ تحریر کیا اور اُسی سال ۲۰ نومبر کو یہ وقف نامہ بھی مذہبی و خیراتی اُمور کے لیے لکھ کر ۳۱ مارچ ۱۸۹۴ء کو مٹیا برج میں بعمر ۷۰ سال انتقال کیا اور وہیں کے امام باڑہ سبطین آباد میں دفن ہوئیں، اُن کی رحلت کے بعد اُن کے پوتوں قرۃ العین وغیرہ نے بعدالت سب جج ۲۴ پرگنہ ایک دعوے خلاف نزہت الدولہ عباس حسین خاں عرف پیارے صاحب اس بیان کے ساتھ دائر کیا کہ مدعا علیہ پیارے صاحب خاص محل کے قرابت داروں میں تھے۔ تخمیناً سترہ برس قبل وہ پریشانی کے عالم میں آکر خاص محل سے طالب امداد ہوئے چنانچہ موصوفہ نے اُن کی دستگیری کی اس وقت سے وہ انھیں کے یہاں رہے بعدہ اُنھوں نے ان کے مزاج میں دخیل ہو کر اتنا اثر بڑھا لیا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اُن کے معتمد

مختار ہوگئے، بروقت انتقال شاہ اودھ جو سنہ ۱۸۸۷ء میں واقع ہوا۔ خاص محل کا دل دماغ کمزور ہوچکا تھا اور اُن میں اپنے معاملات کو سمجھنے اور اُن کا انتظام کرنے کی صلاحیت باقی نہ رہی تھی اس لیے مجبوراً اُن کو پیارے صاحب پر بھروسہ کرنا پڑا مگر اُنھوں نے اُن کا زرِ کثیر اور جواہرات وغیرہ اپنے قبضہ میں کرکے کھسکا دیئے اس طور پر مرحومہ کو اُن کی جائداد کے جزوِ عظیم سے محروم کردیا۔ عدالتِ ماتحت نے ۲۸ مارچ سنہ ۱۹۰۱ء کو پیارے صاحب کے خلاف ۸ لاکھ روپے کی ڈگری دیدی اس فیصلہ سے اُنھوں نے اپیل کیا۔ چونکہ بتاریخ ۱۲ نومبر سنہ ۱۸۹۱ء مرحومہ ایک صافی نامہ بھی بحق پیارے صاحب تحریر کرچکی تھیں جس کا حوالہ وصیت نامہ میں موجود تھا اس لیے ہائی کورٹ کلکتہ نے فارغ خطی نامہ کی بنا پر سنہ ۱۹۰۴ء میں دعوے مدعیان خارج کردیا۔

ملکہ اودھ نواب اختر محل صاحبہ

سلطانِ عالم واجد علی شاہ کی پہلی شادی بزمانۂ ولی عہدی نواب علی نقی خاں وزیر اعظم کی سگی بھتیجی نواب عالم آرا بیگم کے ساتھ ہوئی تھی مگر تخت نشینی کے چوتھے سال بتاریخ ۴ شعبان بروز پنجشنبہ سنہ ۱۲۶۶ھ مطابق جون سنہ ۱۸۵۰ء اکتوبر لما نے اپنی مرضی اور خود پسندی سے حضورِ عالم نواب علی نقی خاں کی تیسری بیٹی رونق آرا بیگم سے بھی شادی رچائی جو نواب کی بیاہتا بیوی گوہر آرا بیگم سے تھیں۔

بادشاہ برات لے کر شاہانہ جلوس کے ساتھ وزیر اعظم کے دولت کدہ پر پہنچ گئے۔ اثنائے عروس کو سہرے جلوے سے بیاہ لائے۔ چوتھی کا کنگنا چھٹ کر وزیر نواب ندیم الدولہ ہوتا۔

پایا۔ کپتان مہدی علی خاں مقبول الدولہ قبول نے جشن شادی کی تاریخ لکھی جو درج ذیل ہے۔

جو دُرِ نو جو یہ پہلو میں ہیں شاہا | ضیاء و نور کا تا چرخ شہرہ ہے
قبول اس کی یہی تاریخ لکھا ہے | مبارک یہ قرآن شمس و زہرہ ہے

اس شادی خانہ آبادی کے بارے میں سید کمال الدین حیدر مصنف قیصر التواریخ تحریر کرتے ہیں۔

"ہر چند حضور عالم (نواب علی نقی خاں) کو پاس خاطر نواب مخدرہ عظمیٰ (خاص آرا بیگم) اور بظاہر از راہ حسد شان زنانی بھی یہ کثرت ازواج مطہرات بہت ناگوار تھی مگر اطاعت و فرماں برداری بادشاہ و قیام عہدۂ وزارت مقدم تھا، خلاصہ سوائے مخدرہ عظمیٰ، سب محلات معلٰی اور جناب عالیہ (ملکہ کشور صاحبہ والدہ بادشاہ) شریک عروسی تھیں، صاحبات محل برائے خوشنودی بادشاہ عمل خواص کام کرتی تھیں۔ بعد چند روز کے نواب مخدرہ عظمیٰ کا ملال بھی حضور عالم سے رفع ہو گیا۔"

اس وقت تک برائیں عام طور سے قبل دو پہر واپس آتی تھیں مگر اختر محل کی رخصتی میں دیر ہو گئی تھی۔ برات سہ پہر کو قریب پانچ بجے واپس آئی اس روز سے یہی دستور ہو گیا کہ براتیں علی العموم سہ پہر کو رخصت ہونے لگیں۔ جب رونق آرا بیگم رخصت ہو کر دولت سرائے سلطانی میں آئیں تو بادشاہ نے اُن کو اپنے تخلص "اختر" کی رعایت سے "ملکہ اودھ نواب اختر محل صاحبہ" خطاب عنایت فرمایا، بروقت شادی سلطان عالم کی عمر ۲۹ سال کی اور دلہن کی صرف گیارہ برس کی تھی۔

مشہور ہے کہ نواب علی نقی خاں کا خاندان خوش گلوئی اور خوب صورتی کے لیے شہرۂ آفاق تھا۔ خود موصوف کو موسیقی میں بہت دخل تھا اسی ہم مذاقی کی وجہ

سے واجد علی شاہ کو اُن سے بہت موافقت اور موانست ہو گئی تھی جنرمحل کے حسن و جمال کے بادشاہ خود معترف تھے۔ چنانچہ ۱۸۵۰ء میں بحالتِ نظر بندی وہ "حزن اختر" میں لکھتے ہیں :-

اودھ کی وہ ہے ملکہ نیک نام — وہ گل قبل بلاؤس ہے خوش خرام
غضب کی ہے جوبن غضب کی ہے چال — کہ ٹھوکر سے ہو کبک تک پائمال
گل گوش خوشبو ہیں مثل چمن — نزاکت کا پتلا ہے گل پیرہن
چمن عارضِ سُرخ سے شرمسار — وہ جوبن ہے گلشن کی جیسے بہار
فدا لالۂ سُرخ اس لال پر — نضارت تصدق ہر اک گال پر
سمنبر فدا عشوۂ ناز پر — پری کو ہے رشک اس کے انداز پر
سر زلف چہرے پہ کالے کا پھن — غضب گات ہے اور غضب ہے بدن
دُرِ لعل گوہر ہیں دنداں نہیں — عجب تر یہی ہے زنخداں نہیں
جو شانے کہوں تختے نور کے — تو الماس سے ہاتھ ہیں حور کے
کمر ہے سراب وہ کا ثبات — ہر اک بات ہو جس طرح مو بنات
ہر مو نہیں فرق اس بات میں — کہ پاؤں سے دھو کا عبارات میں
چمن نسترن کا ہے روے و دہان — دہن کب ہے شاعر کو ہے کچھ گماں
سراسر کمر پیچ در پیچ ہے — ٹٹولا بہت جب تو وہ ہیچ ہے
کشادہ جبیں اختر صبح ہے — وہ ابرو وہ ہر اک خنجر تیغ ہے
چمن روئے گل رنگ سے شرمسار — فدا خالِ عارض پہ مشک تتار
سمنبر، سمن رو ہے گلفام ہے — مہ و خورشید پری، حور، یہ نام ہے
کرن مہر تاباں کی ہر گال ہے — ہر اک جھوٹ نہیں وہ سم زوال ہے
بتغا جو نہیں تمنہ خود وہ نہیں — دہن اس طرح جس طرح انگیں

سر افراز ہے سروِ قد سے نہال — وہ اُلھڑ پنے کی غضب بول چال
وہ مہ پارہ ہے سترہ سال کی — نرالی پھبن بانی ہے چال کی

ضبطیِ سلطنت کے بعد بتاریخ ۱۶ مارچ ۱۸۵۶ء واجد علی شاہ استردادِ سلطنت کی کوشش کرنے کلکتہ تشریف لے گئے۔ نواب خاص محل و چند دیگر محلات اُن کے ہمراہ گئے۔ اختر محل اپنے باپ کے ہمراہ لکھنؤ میں دولت سرائے سلطانی میں مقیم رہیں مگر ریذیڈنٹ نے نہایت معمولی وجوہات کی بنا پر حضورِ عالم سے اس امر کی ضمانت لے لی کہ موصوف لکھنؤ کے باہر قدم نہ رکھیں گے بالفاظ دیگر اُن کو لکھنؤ میں زیر حراست کر دیا گیا۔

ایک روز منجھلی بیگم صاحبہ ہمشیرہ حضورِ عالم قیام گاہ نواب اختر محل سے تحسین گنج اپنے مکان کو جانے لگیں، ڈیوڑھی کے دربان تلاشی لینے لگے اس پر سواری کے پیادوں سے جھگڑا ہو گیا۔ حضورِ عالم نے خشمناک ہو کر فرمایا۔ میں انگریزی پہرے بلوا سکتا ہوں یہ سُن کر حسام الدولہ مہتمم محلات متردد ہو کر بادشاہ کی خدمت میں کانپور گئے اور کل حال عرض کیا کہ مبادا کوئی ناگوار امر ظہور پذیر ہو اور اسی بہانہ سے چیف کمشنر کے پہرے ہو جائیں، سلطانِ عالم نے ایک ہدایت نامہ وزیر اعظم کو تحریر کر کے حسام الدولہ کے حوالہ کر دیا۔ جس پر موصوف واپس چلے آئے، مابعد چیف کمشنر نے حضورِ عالم کو لکھ بھیجا کہ دولت سرائے سلطانی سے اپنے مکان چلے جائیے۔ انھوں نے عرض کیا بادشاہ نے دستورِ قدیم جاری رہنے کا حکم دیا ہے۔ صاحب نے سند طلب کی تو جو حکم نامہ معرفت حسام الدولہ آیا تھا اُسے پیش کر دیا، اس میں تحریر تھا کہ جس قدر راحت و آرام انسان کو اپنے گھر میں ملتا ہے اور دوسری جگہ نہیں ملتا مناسب وقت یہ ہے کہ حسب الحکم اپنے گھر چلے جائیے۔

---

[1] قیصر التواریخ

تین چار دن کے بعد ایک اشتہار شہر میں لگایا گیا کہ فلاں تاریخ ۹ بجے دن کو تماشائے عجیب و غریب رعایا کو دکھایا جائے گا جو کبھی کسی نے آنکھ سے نہ دیکھا ہوگا۔ اس بار ہر شخص کو توحش ہوا۔ آخر بروز سہ شنبہ ۸ اپریل ۱۸۵۹ء کو پہلے مہر محل صاحبہ کی سواری محل خانہ شاہی سے مٹیا برج میں نکلی اس کے بعد حضور عالم نواب ممتاز الدولہ کی دو اسپہ گاڑی میں برآمد ہوئے۔ تبدیلی وزارت کے سبب سے اس گاڑی کی جھلملیاں ہر طرف سے بند تھیں۔ چیف کمشنر کا چپڑاسی کوچ بکس پر بیٹھا تھا۔ کچھ سوار بھی بحالت کذائی سواری کے پیچھے تھے۔ کچھ خاص بردار بے اسلحہ لباس تعیت پہنے ہمراہ تھے۔ در دولت سے تحسین گنج دولت خانہ نواب تک مٹیا کان شہر ہر طرف سے طعن و تشنیع کی بوچھار کر رہے تھے۔ اگر کمشنر صاحب کا چپڑاسی نہ ہوتا تو شاید ڈھیلے بھی برستے۔

بوقت روانگی کلکتہ بادشاہ نواب منور الدولہ احمد علی خاں کو بطور مدار المہام اپنے ہمراہ لے گئے تھے اور نواب علی نقی خاں اپنے خسر و وزیر اعظم کو انتظاماً لکھنؤ میں چھوڑ گئے تھے چنانچہ جب بتاریخ ۱۰ جون ۱۸۵۶ء شاہ معزول کی والدہ ملکہ کشور صاحبہ اور بھائی سکندر حشمت مرزا جواد علی اور بیٹا مرزا کیواں جاہ حامد علی مع خدم و حشم بغرض استرداد سلطنت لندن کو روانہ ہو گئے تو بوجوہات چند در چند نواب منور الدولہ کی بھی وہ اگلی سی بات نہ رہی ادھر حضور عالم کے بدخواہوں نے عریضے پہ عریضے بھیج کر ان کو کلکتہ آنے کی ترغیب دی۔ یہ رنگ دیکھ کر حضور عالم نے امام خاں خدمت گار کو مع عرضداشت بادشاہ کی خدمت میں روانہ کیا جس میں بادشاہ کے قدموں سے جدائی پر اضطراب و بے چینی کا اظہار تھا۔ پہلے تو صرف عرضداشت نظر شاہ سے گزری اس پر بقول سید کمال الدین حیدر رشک رحمت دیدہ حق بیں

لہ رعایائے شہر کو گمان تھا کہ نواب صاحب نے انگریزوں کی سازش کر کے سلطنت ضائع کر دی مگر یہ خیال

سے ٹپک پڑے اس کے بعد ایک روز امام خاں کا بھی سامنا ہو گیا جس پر حضور عالم
کی طلبی کا حکم نامہ صادر ہوا۔ شقۂ شاہی سے سرفراز ہو کر حضور عالم نے چیف کمشنر
سے کئی مرتبہ سفر کی اجازت مانگی مگر نہ ملی آخر کار انھوں نے گورنر جنرل کو عرضی بھیجی اور
بادشاہ نے بھی اس بارہ میں کوشش کی تو وہاں سے اجازت ملی اس پر بموجب
ستحارہ بروز منگل بتاریخ ۱۵ر جولائی ۱۸۵۹ء انیس ڈاک گاڑیوں پر مع نواب
اختر محل وغیرہ و دو آتھین و رفقائے خاص بعد نصف شب روانہ ہوئے۔ ڈاک
گاڑیوں کے علاوہ بیس بیل گاڑیوں پر غلہ و دیگر سامان ضروری از قسم ظروف و
پشمینہ و نقد و جنس بار کیا گیا۔

بوقت روانگی یہ صورت ہوئی کہ رفقاء و ملازمین شام ہی سے در دولت پر حاضر
ہو گئے۔ زنانی سواریاں حضور عالم نے خود سوار کرائیں۔ جب ایک گاڑی میں چار
سواریاں ہو چکتی تھیں تو ایک رفیق گاڑی کی چھت پر مسلح ہو کر بیٹھ جاتا تھا اس کے
بعد خود بدولت چار گھوڑوں کی گاڑی پر سوار ہوئے، شہر کے شہدوں نے شام
ہی سے دروازہ پر ہجوم کیا تھا اُن کو پچاس روپیہ مرحمت کیے کہ آپس میں تقسیم کر لو
مگر بر وقت سواری نہ شور و غل مچانا بیہودہ کلمات بکنا لیکن یہ لالچ خورے کب
ماننے والے تھے۔ بازاروں میں شہر کے ملکے ٹاٹ دیک کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔
اور شہر کے بیکرے تماشائی سر راہ کوٹھوں پر سواری کے منتظر تھے۔ جب سواری
نکلی تو شہدوں کے منہ کون بند کر سکتا تھا جو خدا نے سُنوایا وہ سُنا اور لہو کے سے
گھونٹ پی کر خاموش ہو رہے۔ یہ قافلہ شام سے قبل کانپور کے گھاٹ پر پہونچا مگر
وہاں پانی طغیانی پر تھا اس لیے بوقت تمام شام تک اس پار پہونچا۔ یہاں نواب
نظام الدولہ پسر نواب معتمد الدولہ آغا میر کے مہمان ہوئے۔ دو تین دن میں برسات کا

سامان درست کر کے الہ آباد کو روانہ ہو گئے۔ فتح پور میں لکھنؤ کے ایک صاحب
ڈپٹی تھے انھوں نے ضیافت کی، زبانِ عوام درازی کبھی بند نہ ہوئی۔ راستے کے
درختوں پر بیٹھ کر جو جی میں آیا وہ کہا۔ وہاں سے روانہ ہوئے تو چوک الہ آباد میں
فروکش ہوئے۔ راستہ کی تکان سے بیگم صاحبہ کی طبیعت ناساز ہو گئی تھی اس لیے
دوسرے مکان میں منتقل ہو گئے۔ ایک ہفتہ کے بعد دُخانی جہاز کا کرایہ پانچ ہزار
پانچ سو روپیہ ادا کر کے کلکتہ روانہ ہوئے جب بنارس پہنچے تو جہاز نے لنگر کیا۔
یہاں آغا علی خاں ناظم کے گھاٹ پر مہاجن منتظم تشریف آوری تھے۔ انھوں نے
کئی تھان مشروع و گلبدن کے حضور نواب پیش کش کیے۔ پھر بنارس سے دریائے
ہگلی تک بہ سبب برسات، طغیانی اور تلاطم جہاز میں صاحبات محل کو بڑی اذیت
ہوئی بلکہ خواہش مند ہوئیں کہ کسی طرح خشکی کی راہ سے جائیں مگر یہ کسی طرح ممکن
نہ ہوا جب ہگلی پہنچے تو کپتان جہاز کو خلعت و انعام دیا۔ غرض بتاریخ ۱۳ جولائی ۱۸۵۶ء
بوقت صبح کلکتہ سے گزر کر زیر کوٹھی سلطانی لنگر کیا۔ حضور عالم بادشاہ کی خدمت میں
حاضر ہو گئے۔ لکھنؤ کے بچھڑے ہوئے عالم غربت میں پھر ملے۔ نواب اختر محل داخل
سرائے سلطانی ہوئیں۔ بلبل وصل گل سے دوبارہ شاد کام ہوا، گلشن ہستی میں تازہ
بہار آگئی۔ تخمیناً ایک سال اطمینان و فارغ البالی سے گزرنے کے بعد مقدر پھر رنگ
لایا اور جو طوفان بغاوت تیزی و تندی سے بڑھ رہا تھا، اُٹھا تھا اس کے جھونکے زور
و شور کے ساتھ ماہ جون ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ تک آپہنچے جس پر گورنمنٹ نے محض شبہ
کی بنا پر ناکردہ گناہ شاہ معزول اور نواب علی نقی خاں کو مٹیا برج سے لے جا کر
فورٹ ولیم میں زیر حراست کر دیا۔ اس واقعہ جانکاہ سے اودھ کے کنھیا حضرت
واجد علی شاہ اپنی گوپیوں یا بیگموں کے جھرمٹ سے زندگی میں پہلے پہل جدا ہوئے
بالتشبیہ گویا شکر خورے کو شکر سے محروم کر دیا گیا، جس پر اُن کا شیشۂ دل فرط الم

سے جکناچور ہو گیا۔ اس بیکسی اور تنہائی سے گھبرا کر فرقت نصیب شاہ معزول اپنی محبوب بیگموں سے اُن کی نشانیاں طلب فرماتے جن سے اپنے زخمِ دل کی تسکین کا پھاہا رکھتے۔ جو بیگمیں اُن کی فرمائشیں پوری کر دیتیں اُن سے بہت خوش ہو جاتے اور جو شوخ مزاجی یا ناز آفرینی سے ٹال جاتیں اُن سے گلوں شکووں کے دفتر کھلتے۔ چنانچہ انھوں نے دلدار محل سے مسی، صغریٰ بیگم سے دو لائی در بند وغیرہ قیصر بیگم سے پاؤں کا چھلا، معشوق محل سے کٹے ہوئے ناخن اور اختر محل سے زلفوں کے بال منگوائے۔ دلدار محل نے مسی بھیجدی، اختر محل نے بھی اپنے بال بھیجدیے جن کو وہ ہمیشہ نظروں کے سامنے رکھتے اور بار بار سونگھتے مگر دوسری بیگموں نے اغماض برتا اور کوئی چیز بھی کسی نے نہیں بھیجی۔ اختر محل کے یہاں سے روزمرہ ایک خوان اور پانچ گگوریاں بھی فورٹ ولیم جایا کرتی تھیں۔ بادشاہ نے بھی اُن کو بحالت مقیدی تیس ہزار روپیہ نقد عطا کیے۔ اس بارے میں خود کہتے ہیں ۱؎۔

نہ بھیجی کسی نے مجھے کوئی چیز — کسی نے نہ کی دوستی کی تمیز
مگر ہاں اک اختر محل ہے لئیق — وہ زنداں میں میری ہوئی ہے رفیق
وہاں موئے سر مجھ کو بھجوا دیئے — بنا جس طرح مجھ کو پہنچا دیئے
رکھے موئے سر اپنے دل کے قریں — یہ سمجھا کہ دل میں ہے وہ مہ جبیں
وہ پہنچاتی ہے تجھ کو خوانِ طعام — تو آتا ہے ہر روز اے نیک نام
عجب اس میں کیا کس کی دختر ہے وہ — وہ اختر ہے مہر منور ہے وہ
اسی دن کو ہیں ذی حسب کام کے — اسی دن کو ہیں خوش نسب کام کے

الغرض ایامِ نازِ حجام میں اختر محل کے ہاں صاحبزادہ کی ولادت بھی ہوئی

۱؎ حزن اختر

مگر اُفتادِ زمانہ سے باپ بیٹے کی صورت دیکھنے کو ترس گیا۔ اس مایوسی و بےچینی کا مرقع وہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:-

ہوئے بارہ سو پہ چوہتر جو سن | اسی سن میں پہونچے یہ رنج و محن
مرے سن کے گزرے ہیں تینتیس سال | ابھی قید میں سہ رہا ہوں ملال
پھر اس قید خانہ میں پہونچی خبر | کہ اختر محل سے ہوا ہے پسر
نہیں حال معلوم کیا رنگ ہے | وہ ہیرے کا ٹکڑا ہے یا سنگ ہے
اسی مہ سے طالع ہوا یہ قمر | نہیں ہم کو صورت سے اس کی خبر
کہ گورا ہے یا سانولا رنگ ہے | وہ ماں پر ہے یا باپ کا ڈھنگ ہے

بعد میں ان صاحبزادہ کا نام صاحب عالم مرزا قمر اعلی[1] رکھا گیا اور نظربندی سے نجات پاکر بادشاہ نے ان کو مرزا خوش بخت بہادر خطاب دیا۔ ولی عہد مرزا حامد علی کی رحلت کے بعد مرزا خوش بخت کی شادی اُن کی بیوہ بادشاہ بیگم صاحبہ دختر نواب سرفراز الدولہ یعنی واجد علی شاہ کی بھانجی سے ہوئی۔ مرزا خوش بخت کے ہاں ایک بیٹا اور ایک بیٹی بھی ہوئی مگر دونوں خردسالی میں طعمۂ نہنگ اجل ہو گئے۔

اودھ کا دستور تھا کہ بادشاہ کا سب سے بڑا بیٹا ولی عہدی کے منصب پہ فائز ہوتا اور دوسرا بیٹا فوج کا افسر اعلیٰ ہوتا اس حیثیت سے وہ جرنیل صاحب کہلاتا تھا۔ بحالت قیام کلکتہ بھی حالانکہ گوہر سلطنت ہاتھ سے جا چکا تھا مگر شاہ معزول پرانے دستور کی پابندی کر کے اپنا ولی عہد اور جرنیل فوج مقرر کیے جاتے تھے۔ چنانچہ جب اُن کے ولی عہد کیوان قدر مرزا حامد علی سفر ولایت سے واپس آکر عین زمانہ شباب میں بعمر تخمیناً تینتیس ۳۳ سال دنیا سے منہ موڑ گئے تو بلحاظ سن و سال فریدوں قدر مرزا محمد ہزبر علی بادشاہ کے تیسرے بیٹے کو ولی عہد ہونا

[1] بموجب قیصر التواریخ کہ کتاب نوشتہ واجد علی شاہ میں یہ نام اسی طرح درج ہے " قمر اعلی مرزا خوش بخت بہادر"

چاہیے تھا جو معشوق محل سے تھے مگر موصوف اختر محل کی چاہ میں ڈوبے ہوئے تھے لہٰذا انھیں کے نورِ عین مرزا خوش بخت بہادر کو ولی عہد مقرر کر دیا۔ مگر شومیٔ بخت سے یہ بھی بعمر ۱۲ سال گزارہ یعنی ([illegible]) کے جانِ لیوا مرض میں مبتلا ہو کر والدین کو داغِ مفارقت دے گئے۔ جب تیسرے ولی عہد کی جان پر بھی آبن گئی تو بادشاہ نے اس عہدہ کو نامبارک تصور کر کے ختم ہی کر دیا۔ مابعد بادشاہ کے یہ گوش گزار ہوا کہ چوں کہ مرزا فریدوں قدر کی حق تلفی ہوئی تھی اس لیے انھوں نے رشک و حسد سے ایک بنگالی ساحر کو ایک ہزار روپیہ دے کر مرزا خوش بخت کی شمعِ حیات کو گل کرا دیا۔ اس پر نیز بوجوہات دیگر بادشاہ نے ناخوش ہو کر اُن کو عاق کر دیا۔ جب مصیبتیں آتی ہیں تو نرغہ کر کے آتی ہیں۔ ۱۲۸۸ھ میں اختر محل کے والد حضورِ عالم کلکتہ سے پہلے پہل لکھنؤ آئے اور ۲۱ رمضان کو ہیضہ میں مبتلا ہو کر اپنے سمدھی نواب محسن الدولہ کے مکان پر انتقال کیا۔ لاش کربلائے معلّیٰ بھیجی گئی پھر پورے سال بھر کے بعد یاد رمضان ۱۲۸۹ھ اختر محل کی والدہ گوہر آرا بیگم نے بھی انتقال کیا۔ اُن کی لاش بھی کربلائے معلّیٰ بھیجی گئی۔ ۲۱ ستمبر ۱۸۸۷ء کو بوقتِ عصر واجد علی شاہ بھی دنیا سے رخصت ہو کر اُن کا ساتھ چھوڑ گئے۔ چنانچہ ۱۸۸۸ء میں اختر محل لکھنؤ چلی آئیں اور تخمیناً ۱۸۹۰ء میں بعمر تخمیناً ۵۹ سال دردِ سینہ سے اُن کا بھی نقشِ ہستی صفحۂ دنیا سے مٹ گیا۔ تحسین گنج میں دائمی آرام گاہ بنی۔ اُنھوں نے اپنی زندگی خاموشی اور نیک نامی سے بسر کی۔ لالہ کالی چرن کھتری جن کی وصیت کے بموجب اُن کے نام پر سرائے معالی خاں میں کالی چرن ہائی اسکول[1] قائم کیا گیا ہے انھیں بیگم صاحبہ کے یہاں ملازم تھے آخر میں اُن کے مختار ہو گئے تھے اور کئی لاکھ روپیہ کی حیثیت اسی سرکار سے پیدا کی تھی۔

---

[1] اب انٹر کالج ہو گیا ہے

نواب اشتیاق محل

نوابانِ اودھ کے زمانۂ فرماں روائی میں علمائے کرام اور صوفیائے عظام کے متعدد خاندان لکھنؤ میں آ کر آباد ہوئے۔ انھیں خانوادوں میں حضرت شاہ خواجہ حسن مودودی کا گھرانا بھی تھا جو اپنی وسیع الاخلاقی، تبحر علمی اور کمالاتِ ظاہری و باطنی کے لیے بہت معروف تھا۔ اُن کی ریاضت اور عبادات پر نظر کر کے اکثر اہالیانِ لکھنؤ نے اُن کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ اودھ کے نوابوں، وزراء اور رؤسا کی بھی اُن بزرگوں سے کافی راہ و رسم تھی۔ جو برابر اُن کے شریعت کدہ پر حاضری دیا کرتے اور ضرورت پر اُن کے فیوضِ باطنی سے بھی معقول فوائد حاصل کرتے تھے۔ اُس زمانہ میں شیعہ سنیوں میں ازدواجی رشتے بھی برابر قائم ہوتے تھے۔ جن کی وجہ سے تعصبات دبے رہتے تھے جو آپس میں رواداری برت کر ایک دوسرے کے جذبات کا پورا احترام کرتے تھے

شاہ خواجہ حسن و شاہ خواجہ حسین دو حقیقی بھائی حضرت خواجہ محمد ابراہیم شاہ کے نورِ نظر اور قوم کے سید تھے۔ دونوں حضرات بزمانہ حکومت نواب آصف الدولہ فیض آباد یا بروایتے دیگر دہلی سے لکھنؤ آ کر محلہ رستم نگر میں اپنے پیر بھائی نواب محبت خاں ابن حافظ رحمت خاں والی روہیل کھنڈ کے دولت کدہ پر فروکش ہوئے اور پھر یہیں رہ پڑے خواجہ حسن شاہ کی صرف دو اولادیں سید قطب اعظم اور لاڈو بیگم تھیں سید قطب اعظم نے تین شادیاں کیں۔ بزمانہ فرماں روائی نواب سعادت علی خاں موصوف نے ۱۲۲۳ھ میں اپنا دوسرا عقد ایک ذی مرتبہ شخص احمد علی خاں نامی ساکن مفتی گنج کی ہمشیرہ سے کیا یہ خاندان امامیہ مذہب کا پیرو تھا۔

ان بیوی سے تین صاحبزادے مودود و حسن معروف بہ شاہ قطب اعظم و خطاب حسین

اور قطب حسن اور تین صاحبزادیاں سکینہ بیگم، قطبی بیگم اور کلثوم بیگم پیدا ہوئیں۔ پورا شجرۂ خاندان درج ذیل ہے۔

خواجہ محمد ابراہیم شاہ

حضرت خواجہ حسن — حضرت خواجہ حسین

سید قطب اعظم — لاڈو بیگم

مودود حسن — انطاب حسن — قطب حسن — سکینہ بیگم — قطبی بیگم — کلثوم بیگم
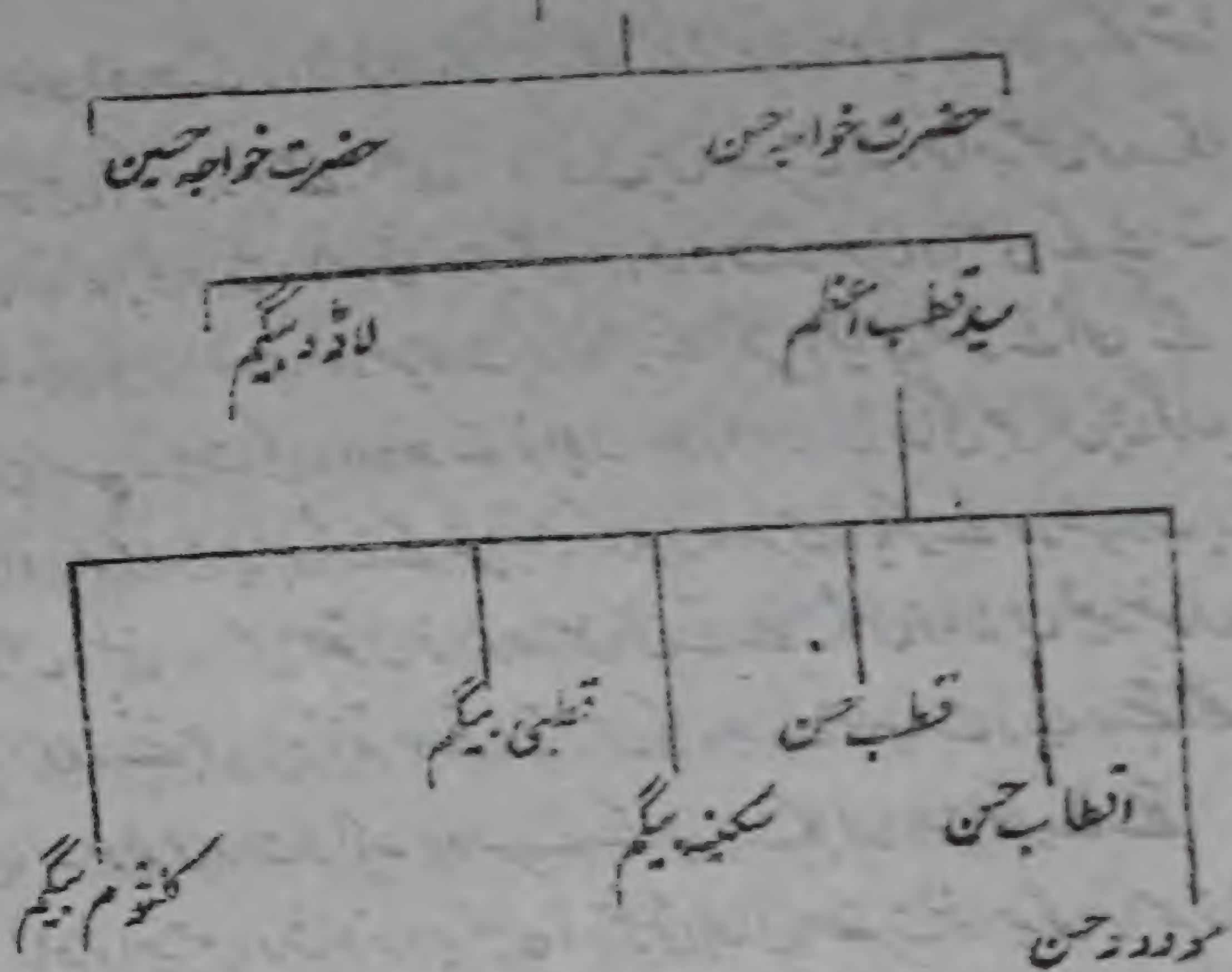
سید قطب اعظم کے وصال کے بعد کلثوم بیگم تاجدار اودھ جان عالم واجد علی شاہ کو بعمر سولہ سال منسوب ہوئیں۔ موصوف نے انھیں اختیاق محل کا خطاب دیا جان عالم اُن کا بوجہ عالی خاندانی بہت خیال کرتے تھے اور سات سو روپے ماہوار میوہ خوری کے لیے بھی مقرر فرمائے تھے چنانچہ جان عالم اُن کے متعلق پری خانہ میں خود بھی لکھتے ہیں:۔

یہ ساقی نہیں قطب اقطاب ہے
دلِ روشن اس کا جہاں تاب ہے
زمانہ پہ ظاہر ہے اس کا کمال

ارادت ہے جس کو وہ بے قیل و قال
ہوا دل سے میں تو اُسی کا مرید
کہ آنکھیں تھیں مشتاق جام نبید
بیوں مے تو ہو تیز میری زباں
کروں حال کلثوم بیگم بیاں
کہ ہے قطب اعظم کی دختر وہ ماہ
زن سیزدہ سالہ گیسو سیاہ
مرے پاس آئی وہ شیریں دہن
ذریعہ سے اُن کے جو ہیں مہر شن
مشرف بخدمت رہی مدتوں
معزز بہ خلوت رہی مدتوں
ہوا اُس کو حاصل دُرِ مدعا
کہ درماہہ بھی سات سو کا ہوا
مجھے اس محل پر بہت ہے نظر
سرافراز ہوتی ہے وہ بیشتر

شاہ قطب اعظم[1] اپنے والد حضرت شاہ خواجہ حسن قدس سرہ کا عرس بڑے اہتمام اور اعلیٰ پیمانہ پر کرتے تھے۔ واجد علی شاہ بھی ہر سال عرس کے لیے پانچ سو روپے دیتے تھے۔ شاہ قطب اعظم کے وصال پر اُن کے صاحبزادے شاہ قطب حسن برادر کلثوم بیگم صاحبہ سجادہ طریقت پر متمکن ہوئے۔ آپ کی شادی بھی ایک شیعہ خاندان میں ہوئی۔ ان بیوی سے صرف ایک بیٹے محمد شریف نامی پیدا ہوئے۔

جب صاحبزادے کی عمر تین چار سال کی ہوئی تو اُن کی والدہ مکر بعد گئیں

[1] گذشتہ مدودی

انتقال کیا۔ کلثوم بیگم اُس وقت بادشاہ کے ہمراہ تھیں۔ جب اُن کو اپنے بھاوج کے انتقال کی خبر ملی تو اپنے بھتیجے محمد شریف کی کمسنی کا خیال کر کے کلکتہ بلا لیا۔ تب سے کبھی کبھی شاہ قطب حسن بھی کلکتہ تشریف لے جاتے تھے۔

بادشاہ آپ کا بہت اعزاز و احترام کرتے تھے۔ موصوف جان عالم کے اصرار سے متیا برج ہی میں قیام فرماتے تھے۔ آپ کے والد شاہ قطب اعظم کے عرس کے لیے بھی بادشاہ پانچ سو روپے سال عنایت کرتے تھے۔ آپ دونوں بزرگوں کا عرس بڑی دھوم دھام سے کرتے تھے۔ آپ کی ہمشیرہ نواب اشتیاق محل نے سلطان عالم سے مکہ معظمہ، مدینہ طیبہ، کربلائے معلّٰی اور دیگر مقامات مقدسہ کی زیارت کی آرزو ظاہر کی انھوں نے زادِ راہ دے کر بیگم صاحبہ کو روانہ کر دیا وہ اپنے ہمراہ اپنے بھتیجے محمد شریف کو بھی لے گئیں۔ کعبہ شریف میں موصوفہ خدا کے گھر سدھاریں۔ بادشاہ کو اُن کا ساتھ چھوٹنے پر بہت قلق ہوا۔ شاہ قطب حسن کو کلکتہ بلا بھیجا آپ حسب الطلب تشریف لے گئے اور اپنے بھتیجے حاجی محمد شریف کو لکھنؤ لے آئے۔ آپ کو کبوتروں کا بڑا شوق تھا۔ واجد علی شاہ نے کئی نایاب زمانہ کبوتروں کے جوڑے بھی آپ کو دیے اس کے بعد دوبارہ کلکتہ بلا بھیجا وہاں کے قیام ہی کے دوران میں آپ درد شکم میں مبتلا ہوئے۔ بادشاہ نے طبیب شاہی کو معالجہ کی غرض سے آپ کی خدمت میں بھیجا اور خود بھی عیادت کے لیے تشریف لے گئے مگر وقت آگیا تھا کوئی دوا کارگر نہ ہوئی اور آپ ۱۷ اگست ۱۸۶۳ء کو بعمر چالیس سال واصل بحق ہو گئے۔ جسدِ میت صندل کی لکڑی کے تابوت میں لکھنؤ آئی اور اپنے والد ماجد کے مقبرہ واقع رستم نگر میں اُن کی پائنتی جانب سپرد خاک کیے گئے۔

نواب سلیماں محل صاحبہ

یہ جانِ عالم واجد علی شاہ کی زوجۂ ممتوعہ تھیں۔ اُن کو شاہ موصوف کی خاص محل نواب عالم آرا بیگم المخاطب بہ اعظم بہو نے اپنے شوہر کی خدمت میں پری خانہ کے لیے پیش کیا تھا جنھوں نے اُن کو گھر بٹھا کر اُن کا نام سلیمان پری رکھا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:۔ ؎

کسی کو جو اُس سے نہ تھی ہمسری — خطاب اُس کو بخشا سلیماں پری
ہوا گھر جو اُس سے ریاضِ جناں — وساطت تھی اعظم بہو کی یہاں

تھوڑا عرصہ گزرنے کے بعد معلوم ہوا کہ سلیماں پری حاملہ ہو گئی ہیں اِس پر جانِ عالم نے اسی وقت اُن کو محل میں داخل کر کے سلیماں محل صاحبہ خطاب عطا فرمایا اور عمدہ عمدہ تحفے، نفیس نفیس لباس۔ جواہرات کی کشتیاں مع دیگر ساز و سامان کے مرحمت کیں اور اسی دن سے اُن کو پردہ میں بٹھا دیا چنانچہ جانِ عالم خود لکھتے ہیں:۔

خبر آئی ہیں حاملہ وہ محل — لگے نخل اُمید میں تازہ پھل
ادھر حاملہ ہیں سلیماں پری — اُدھر ہے حمل تھی بیگم کو بھی
سلیماں محل کا بڑھا مرتبا — جواہر ملے اُن کو بے انتہا
بہت رخت بخشی گئی زر نفیس — مرصّع گراں مایہ زیور نفیس
ہوئیں فضل رب سے وہ صاحب دول — سلیماں پری سے سلیماں محل
پری صورت اور ملا خطاب — ہوئیں نفظ نواب سے کامیاب
ہوا اُن کا رتبہ کہیں سے کہیں — ہوئیں میرے گھر میں وہ پردہ نشیں

ایامِ حمل پورے ہونے کے بعد سلیماں محل کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کو اُس کے

والد امجد علی شاہ بادشاہ نے سپہر آرا اکبری بیگم صاحبہ کے خطاب سے ممتاز فرمایا، مابعد واجد علیشاہ کی ہمشیرہ نواب اشرف النسا بیگم المعروف بہ چھوٹی شہزادی صاحبہ (زوجہ نواب سرفراز الدولہ ابن نواب منیر الدولہ ساکن گرما ھیا چودھری) کا کوئی بچہ زندہ نہ رہتا تھا۔ آخر کار واجد علی شاہ کی والدہ ملکہ کشور صاحبہ کے صلاح و مشورہ سے امجد علی شاہ نے سپہر آرا اکبری بیگم صاحبہ کو چھوٹی شہزادی کی گود میں ڈال دیا اور بہ طریقہ کفالت دپرورش انھیں کو دے دیا۔ کبھی کبھی کبری بیگم اپنے باپ واجد علی شاہ کو دیکھنے کے لیے آجاتی تھیں اور ایک رات رہ کر چلی جاتی تھیں۔ یہ امر واجد علی شاہ کو بہت شاق گزرتا تھا مگر بسبب اطاعت والدین زبان نہ ہلاتے تھے۔

تخت نشین سلطنت ہو کر واجد علی شاہ نے سلیمان محل کو ملکہ پریوش سلیمان محل صاحبہ خطاب عنایت کر کے دس ہزار روپیہ ماہوار اُن کی تنخواہ مقرر کردی اور پانچ مواضعات گھرچن، گورامئو، سلیم پور تیجہ ردا، اینٹ گاڈں، شیر کچھ مئو بطور جاگیر بھی اُن کو مرحمت کیے۔

۱۷ مئی ۱۸۵۰ء کو سپہر آرا اکبری بیگم کی شادی عظمت الدولہ نواب محمد رضا خاں پسر اصغر مرزا ابو القاسم ابن مرزا ابو طالب سے ہوئی مگر تو شاہ کے والد اس تقریب میں شریک نہیں ہوئے۔ واجد علی شاہ نے تو اُن کے عدم شرکت کی بابت صرف اسی قدر لکھا ہے :۔

مگر ان دنوں وہ نہیں ہیں یہاں زیارت کے خاطر ہوئے ہیں رواں

لیکن کمال الدین حیدر نے قیصر التواریخ میں اس واقعہ کو بہت واضح طور پر لکھا ہے کہ مرزا ابو القاسم بہت رنجیدہ ہو کر عتبات عالیات کو روانہ ہو گئے۔ بمبئی تک ڈاک میں گئے۔ وہ اس نسبت کو بہت ناپسند کرتے تھے اور اپنے بیٹے کی شادی اپنے اعزا میں کرنا چاہتے تھے۔ مگر اُن کی بیوی نے اُن کا کہنا نہ مانا اسی وجہ سے ہجرت کر گئے اور رکھی

برس تک مجاور رہے۔ زیارت مشہد مقدس سے بھی شرف یاب ہوئے۔ کمی خرچ کی وجہ سے تکلیف بھی بہت اُٹھائی۔ آخر کار پنشن سرکاری جانے لگی اسی میں بسر اوقات بہت سادگی کرتے تھے۔ پس انداز کیا ہوا روپیہ مجاوروں، احتاجوں اور مسافروں کی نذر کر دیتے تھے۔ وہاں کئی مکان بھی خریدے تھے۔ جن میں زائرین ٹھہرا کرتے تھے۔ جب تک حیات مستعار نے وفا کی اسی طرح زہد و تقویٰ کی زندگی بسر کرتے رہے۔ زائرین بالاتفاق ان کے شکر گزار واپس آتے تھے۔ آخر کار انھوں نے اسی ارض پاک میں اپنا نقد حیات بھی ملک الموت کے نذر کر دیا۔

سلیماں محل کی رحلت کے بعد مواضعات کا داخل خارج نواب عظمت الدولہ کے نام ہوا موصوف نے اپنے بیٹے نواب افتخار الدولہ فخر الدین علی خاں عرف نواب منے صاحب کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی۔ ہاتھی پر سے بکثرت روپیہ لٹایا۔ نواب منے صاحب کی اکلوتی بیٹی نواب سکندر آرا بیگم مرزا جمشید قدر عرف نواب بنے صاحب کو منسوب تھیں۔ موصوفہ نے ۲۰ مئی ۱۹۳۹ء کو انتقال کیا اور کربلائے عظمت الدولہ میں سپرد خاک کی گئیں۔ ان کا مکان متصل چوکی پولیس فرنگی محل واقع ہے۔

نواب امیر محل صاحبہ

جان عالم واجد علی شاہ کی ولی عہدی کا زمانہ ہے۔ جوانی کے ساتھ ان کا شوق موسیقی بھی شباب پر ہے۔ پری خانہ میں گانے بجانے والی خوش گلو اور ماہر عورتیں دھڑا دھڑ داخل ہو رہی ہیں اُسی زمانہ میں ایک طوائف جس کا سن تقریباً اٹھارہ برس یا کچھ زیادہ ہوگا۔ نخی بیگم المخاطب بہ نواب نشاط محل صاحبہ زوجہ واجد علی شاہ کی معرفت اُن کے گھر میں داخل ہوتی ہے۔ یہ کرم بخش والی کے نام سے مشہور ہے۔ اور

امیر پری خطاب پاکر حسب دستور پریوں میں شامل کر دی جاتی ہے اور موسیقی کی تعلیم شروع ہوتی ہے لیکن وہ قبل ہی سے اس فن کو حاصل کر چکی ہے سکھانے کی ضرورت نہیں ہے مگر اس خیال سے کہ بے پرواہ رہنے میں گانا بجانا فراموش نہ ہو جائے سلسلۂ تعلیم جاری رہتا ہے

اس واقعہ کو جانِ عالم پری خانہ منظوم میں بھی اس طرح نظم کا جامہ پہناتے ہیں ؎

کروں قصۂ شاد ثانی بیاں ۔۔۔ کہ محبوبہ ایک اور آئی یہاں
مگر اس کا آنا نہ تھا بے جہت ۔۔۔ فقط تھی بیگم کی تھی معرفت
پری چہرہ تھی غیرتِ حور تھی ۔۔۔ کرم بخش والی وہ مشہور تھی
سن اس کا تھا کل ہیژدہ سال کا ۔۔۔ رسا بخت لیکن تھا اقبال تھا
بڑھی قدر معشوقۂ دل پذیر ۔۔۔ پری تھی خطاب اس نے پایا امیر
یہ مشاق گانے بجانے میں تھی ۔۔۔ کہ بے مثل سارے زمانے میں تھی
نہ تھی اس کو تعلیم کی احتیاج ۔۔۔ کہ خود نغمہ پیرا تھی وہ خوش مزاج
پری خانہ میں اس نے پائی جو راہ ۔۔۔ فقط مصلحت تھی یہ پیشِ نگاہ
کرے مشق اس علم کی روز و شب ۔۔۔ رہیں قاعدے مشق سے یاد سب

انہی زمانہ میں ایک روز بزم طرب آراستہ ہوئی اور بشمول امیر پری پانچ پریوں کو بیگموں کا مرتبہ عطا کیا گیا چنانچہ بادشاہ خود زبانِ قلم سے یوں ارشاد کرتے ہیں :۔ ؎

پری وہ کہ تھا نام جس کا امیر ۔۔۔ حسینانِ آفاق میں بے نظیر
اُسے میں نے اپنی زباں سے کہا ۔۔۔ کہ ہے مثلِ خورشید اس کی لقا
عنایت کیے میں نے اُن کو مکاں ۔۔۔ ہوئیں پرورش سے بہت شادماں
خواص اُن کو میں نے دیئے چار چار ۔۔۔ رہیں تا شب و روز خدمت گزار

جب واجد علی شاہ مالک تاج و تخت ہوئے تو سب پریوں کو روپیہ کی طمع دے کر پردہ

میں بٹھا دیا اور محلات کا درجہ عطا کر کے دو ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کر دی۔

۱۸۵۶ء میں جب سلطان عالم حکومت و سلطنت سے محروم ہو کر کلکتہ جانے لگے تو انھوں نے بخوشی خاطر حکم دے دیا کہ جو میرے ہمراہ کلکتہ جانا پسند نہ کرے وہ طلاق لے لے چنانچہ چھ اللہ کی بندیاں ایسی بھی تھیں جو اس آڑے وقت میں منھ موڑ گئیں۔ انھیں بے وفاؤں میں امیر محل بھی تھیں۔ مرزا رجب علی بیگ سرور ان بیگموں کا تذکرہ کرتے ہوئے فسانۂ عبرت میں لکھتے ہیں:-

"۱۶ محرم ۱۲۷۳ھ کو جان عالم نے اپنی چھ بیویوں (۱) امیر محل (۲) سلطنت محل (۳) گلزار محل (۴) گل عالم وغیرہ کو طلاق دی نذر مہر دے کر آزاد کر دیا۔ سبھوں نے جملہ مال و اسباب اور زر و زیور لے لیا اور علیحدہ کھانے کا سامان کر لیا۔"

جان عالم کے کلکتہ تشریف لے جانے کے بعد امیر محل نے بارہ نکی کے قاضی اصغر علی سے نکاح کر لیا جن سے تین لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ نواب گنج بارہ بنکی میں امیر محل کی وافر جائداد ہے۔ لکھ پیڑا، سرائے یادگار، بات موسومہ امیر گنج (جس کا دوسرا نام بیگم گنج بھی ہے) امام باڑہ و مسجد وغیرہ اور لکھنؤ میں قریب مولوی گنج رنگی بٹوں میں سکونتی مکان و امام باڑہ ہے۔ یہ کل املاک واجد علی شاہ کے روپیہ سے خریدی گئی اس جائداد کے علاوہ دو گاؤں اور کچھ پٹیاں بھی تھیں جن کی آمدنی ہزار روپیہ ماہوار سے کچھ زائد تھی۔

بارہ بنکی کی مسجد نہایت عالی شان اور خوشنما ہے اس کے زیریں حصے میں دوکانیں ہیں اور بالائی حصہ میں خانۂ خدا ہے جو ۱۲۸۵ھ میں تعمیر ہوا۔ اس میں نواب ناظر حسین علی خاں کی مسجد واقع چوک لکھنؤ کی طرح دل کش نبت کاری ہے۔ مسجد میں سنہ تعمیر حسب ذیل لگا ہوا ہے۔

۱۲۸۵ھ	
گفت اختر سال تعمیرش نہاں	ذکر ایں مسجد بہ بام آسماں
۱۸۶۶ء	

مگر نواب گنج والا امام باڑہ جو مسجد کے سامنے ہی واقع ہے بالکل مختصر اور حقیر سا ہے۔ نواب گنج کی کچھ جائداد فروخت بھی ہو چکی ہے۔ لکھنؤ کا امام باڑہ رستی ٹولہ میں قائم ہے جو سال بھر کے بعد صرف محرم میں کھلتا ہے اس کے لیے کچھ جائداد بھی وقف ہے۔ مشہور ہے کہ امیر محل اپنی حیات میں مجالس کے حصے بہت اولوالعزمی سے تقسیم کرتی تھیں کھیر کی بڑی بڑی قلفیاں اور پلاؤ کے بڑے بڑے طباق مومنین کے گھروں پر جس سے بھجوا دیتی تھیں۔ ان کی قبر کربلائے میر خدا بخش میں ہے۔

پری محل

پری جان عالم واجد علی شاہ کی متاعی بیوی تھیں۔ بادشاہ کے کلکتہ تشریف لے جانے کے بعد ۱۸۵۷ء میں اُن کو غدر کی بلائے ناگہانی کا سامنا ہوا۔ گھر لوٹا گیا۔ مال و اسباب تباہ و تاراج ہو کر۔ جب جنگ کے شعلے فرد ہو کر لکھنؤ پر انگریزوں کا تسلط دوبارہ ہو گیا تو مفتی گنج کے قریب دریا والی گلی میں ایک دو منزلہ مکان بنوا کر سکونت پذیر ہوئیں۔ بادشاہ کو اپنے دکھ اور مصیبت کی داستان لکھی اور تباہی و بربادی کا نقشہ کھینچا۔ بادشاہ نے جواب میں سفر کلکتہ قلعہ فورٹ ولیم ([illegible]) میں اسیر ہونے کی کیفیت جو بود لکھی اور پانچ سو روپیہ بھی روانہ کیا۔ اس کے بعد موصوفہ کلکتہ گئیں۔ بادشاہ سے اُن کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ دفعتاً بادشاہ اُن سے کسی بات پر ناراض ہو گئے۔ یہ بھی کلکتہ سے لکھنؤ چلی آئیں۔ یہاں آکر ان کے یہاں قریباً ایک لاکھ روپیہ کی چوری ہو گئی۔ جب یہ خبر واجد علی شاہ کے کانوں تک پہونچی تو بہت افسوس کا اظہار کیا۔ بعد ہنگامۂ غدر بادشاہ نے ایک سرفراز نامہ بھی پری محل کے نام بھیجا جس کا مضمون درج ذیل ہے۔ عقل مسعود، روح مجسم، روح رواں نواب پری محل صاحبہ

سلامت رہو! ایک قطعہ مُدّ نامہ رنج نشانہ مشتمل بر تباہی و بربادی ہم کو پہونچا۔ اس سے پہلے ہم ایک قطعہ محبت نامہ تمھارے دو قطعہ نامے کے جواب میں مع مبلغ پانچ سو روپیہ کے روانہ کر چکے ہیں۔ ابھی تک اس کی رسید نہیں آئی تھی۔ چاہیے کہ جس وقت مبالغ مرقومہ الصدر پاؤ فوراً ہم کو رسید بھجواؤ اور لفافہ پر یہ عبارت تحریر کرے۔ سکریٹری نور الدین اود (؟) ڈپی پارٹ منٹ معرفت دفتر خارجہ میر منشی کونسل ہاؤس اسٹریٹ۔ اس پتہ پر خط جلد پہونچ جایا کرے گا اور بیشتر تم میں میرا دھیان لگا رہتا ہے خط میں ساری اپنی مفیدی کی کیفیت لکھ چکا ہوں۔ حق سبحانہ تعالیٰ ہمیں تمھیں باہم دگر ملائے پھر وصل کے مزے چکھائے۔ ورنہ یا والا یہ غزل نید خانہ میں موزوں کر کے تمھیں بھیجی ہے۔ خدا سے امید ہے کہ پسند طبع نازنین ہو۔ بہر حال تمھارے دل بہلنے کے لیے یہ سبیل کی ہے کہ ایک غزل نئی موزوں کر کے ترسیل کی ہے ہمیں اپنا دوست غم خوار سمجھنا اور بادشاہ باغ میں جھولے پر ایک پیڑے پر بیٹھنا یاد کرنا بقلم جان عالم پری محل پری زاد اور پری پیکر بھی تھیں۔ رنگت گوری، جسم چھریرہ، نکھ سکھ سے درست، قد میانہ لیے ہوا سا تھا مبلغ پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ پاتی تھیں اُن کے علاوہ شاہ معزول کی اور کئی بیگمات چندری بیگم، حاجی بیگم، پری خصال بیگم، شمس افروز بیگم وغیرہ بھی لکھنؤ میں مقیم تھیں اُن میں سے بھی ہر ایک کو پچاس روپیہ ماہوار ملتے تھے۔ بعد انتقال واجد علی شاہ بادشاہ پسند نے پری محل سے الفت محبت کی پینگ بڑھائی اور بعد میں نکاح یا متعہ بھی ہو گیا۔ بادشاہ پسند سے پری محل کے ایک لڑکا بھی ہوا جس کا نام تفضل حسین تھا۔ آخر الذکر نے دو لڑکے اپنی یادگار چھوڑ کر تخمیناً بیس سال گذرے کہ انتقال کیا۔ اُن کا بھی جسم اکہرا، قد میانہ، رنگت گوری اور چہرہ کتابی تھا جس پر فرانسیسی وضع کی ڈاڑھی تھی یعنی ٹھوڑی کی طرف بتدریج بڑھتی چلی گئی تھی، سیاہ ایرانی ٹوپی، شیروانی اور پتلون نما پائجامہ پہنتے تھے۔ لکھے پڑھے بہت معمولی تھے مگر ستار خوب بجاتے تھے

محرم کے زمانے میں پری محل کے یہاں اربعین تک روزانہ زنانی مجلسیں ہوتی تھیں اور ہفتہ میں دو بار مردانی مجلسیں بھی بڑے اہتمام سے ہوتی تھیں جن میں کھٹیاں یا کھیر کی ہانڈیاں بطور تبرک تقسیم ہوتی ۔ موصوفہ کے انتقال کو تخمیناً پچاس برس کا عرصہ گزرا اُن کی قبر مفتی گنج سے متصل کمیدان کی بغیہ میں پڑاؤ کے قریب ہے مکان مسکونہ بک چکا ہے تفضل حسین کے دونوں بیٹے مفتی گنج میں موجود ہیں ۔

عاشق محل نواب انجم النسا بیگم صاحبہ عرف انجو بیگم

یہ دولت حسن و جمال سے بہت مالا مال تھیں لیکن قسمت کی ہیٹی تھیں ۔ سلطان عالم واجد علی شاہ کی بیاہتا بیوی نواب خاص محل صاحبہ کے یہاں کسی خدمت پر مامور تھیں مگر بڑی سوگھڑ انھیں ہر کام میں سلیقہ تھا ۔ پانچوں انگلیاں ، پانچوں چراغ ۔ واجد علی شاہ انھیں محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے ، خاص محل کا ماتھا ٹھنکا ۔ انھوں نے پردہ کا حکم دیدیا اُس کے بعد جب موصوف محل میں تشریف لے گئے تو "رُخ یار" سے محروم پھرے ۔ ایک روز خاص محل نے گڑیوں کی شادی کا رقعہ بھیجا " روئے نگار " دیکھتے ہی بادشاہ کے بھرے زخم نئے سرے سے ہرے ہو گئے اور مونس سلطان کو درمیان میں ڈال کر اُن کے حُسن کی چاشنی کا بھی ذائقہ چکھنے کے لیے شادی کا پیام دیدیا مگر معلوم ہوا کہ حال ہی میں اُن کا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں دیدیا گیا ہے چنانچہ بہت کوشش کر کے انھیں طلاق دلوائی گئی ۔ نواب علی نقی خاں وزیر اعظم نے اس معاملہ میں بہت کوشش کی جس کا ذکر سلطان عالم واجد علی شاہ نے ان الفاظ میں کیا ہے ۔

درستی میں کدھر مصاحبنے کی ٹری جد نوابصاحب نے کی

مگر انجمن بیگم نکاح کرنا چاہتی تھیں اور بادشاہ متعہ۔ اُس پر بادشاہ نے فرمایا کہ متعہ کی صورت میں ہر ہفتہ تمہارے یہاں آیا کروں گا۔ مگر بحالتِ نکاح صرف سال بھر کے بعد یہ سُن کر وہ متعہ پر رضامند ہو گئیں اس کے بعد خود سلطان عالم کی زبانِ قلم سے سُنیے ا۔

خطاب اس کو کیا خوب صورت ملا — کہ عاشق محل شہریار النسا
نسا ہے اگر لفظ انجم سے ضم — تو بیگم سے ہے صاحبہ بھی بہم
کیا اس کو اللہ نے کامیاب — کہ نواب بھی ہے شریکِ خطاب
سرافراز وہ ماہ پیکر ہوئی — کہ تنخواہ اس کی مقرر ہوئی
معین مبالغ ہوئے سہ ہزار — ملے ظرف سیم و طلا بیشمار
مرصع دیا اس کو زیور بہت — عنایت کیا زیور و زر بہت
وہ شیدا تھی ایسی کروں کیا بیاں — محبت کے اکثر کیے امتحاں
میں اُس روز بیٹھا تھا مانند شمع — یہ سب بیگمیں مثل پروانہ جمع
ہر اک کھینچتی تھی مجھے اپنے پاس — کہا میں نے جس کو کہ میرا ہو پاس
بدل کر وہ پوشاک ساقی بنے — پلائے جو ٹھرہ تو گاڑھی چھنے
دھرے گرد قلیاں کہے دُور شرم — اسی سے ہو خلوت کا ہنگامہ گرم
سُنے جب یہ عاشق محل نے سخن — اوٹھیں اور بنیں ساقی سیم تن
مرا دوزر جس راہ سے تھا مرور — وہیں جا کے بیٹھیں وہ مانند حور
دھرے گرد قلیاں جمائے دوکاں — وہ چنبر وہ نیچے مہ و کہکشاں
انگیٹھی جو لبریز آتش ہوئی — پری جل گئی بھن گئی غش ہوئی
دکاں میں مری منتظر چار روز — رہیں وہ اسی طرح رونق فروز
ولیکن ہوئی اُن کی محنت تلف — کہ میرا نہ جانا ہوا اس طرف

گوہر مراد حاصل ہونے کے بعد بادشاہ کا دل ان کی طرف سے ہٹ گیا اور اُن کی

مطلق پرواہ نہ رہی اس بے رخی و بے اعتنائی پر وہ مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپنے لگیں رنج و غم سہتے سہتے سوکھ کر کانٹا ہو گئیں اور دق بھی ہو گئی۔ بادشاہ نے ہر چند علاج معالجہ کرایا مگر رتی برابر فائدہ نہ ہوا۔ بالآخر اس پیکر مہر و وفا نے اپنا نقد حیات بھی اپنے محبوب شوہر پر نثار کر دیا۔ جنھوں نے اُن کی دائمی آرام گاہ کے لیے محلہ حضرت گنج میں حضرت امجد علی شاہ جنت مکاں کا مقبرہ سبطین آباد تجویز کیا چنانچہ خود لکھتے ہیں:۔

نہیں تنگ زوج خدا داد میں　　کہ مدفن ہے سبطین آباد میں
ملا مر کے بھی ظلِ جنت مکاں　　قریب ضریح شہ تشنہ کاں

نواب معشوق محل صاحبہ

معشوق محل سلطانِ عالم واجد علی شاہ کی متاعی بیوی تھیں۔ نام پیارے صاحب اور جہانی ڈومنی کی بیٹی تھیں۔ واجد علی شاہ تک اُن کی رسائی اس طور پر ہوئی کہ محمد حسین علی خاں خواجہ سرا نے جو بعد کو معتمد علی خاں دیانت الدولہ کے خطاب سے سرفراز ہوئے تھے اُن کو سلطانِ عالم کے ملاحظہ میں بزمانہ ولی عہدی گزرانا۔ معشوقہ کی دلکش صورت اور موہنی مورت ولی عہد کی آنکھوں میں کھپ گئی جس پر اُن کو گھر بٹھا کر زنانہ میں داخل کر دیا اور معشوق پری کا خطاب دے کر گانے بجانے کی تعلیم شروع کرا دی۔ واجد علی شاہ اُن کے ابتدائی حالات کے متعلق خود پری خانہ میں لکھتے ہیں:۔

تھی ایک زن پیارے صاحب تھا نام　　خجل جس کی صورت سے ماہِ تمام
جہانی جو تھی ڈومنی مشتہر　　اسی کی تھیں دختر یہ رشکِ قمر
محمد حسین درمیاں میں پڑے　　وہ آئیں ہوئے دیکھتے ہی بڑے
ہوئیں مجھ کو ایسی وہ خاطر پسند　　کیا میں نے اُن کو بہت سربلند

بڑھا مرتبہ اور ہوئیں کامیاب	پری تھیں وہ معشوق پایا خطاب
بدستور تعلیم پانے لگیں	خوش آواز تھیں خوب گانے لگیں

ابھی اُن کی تعلیم کو صرف تین مہینے گزرے تھے کہ اُن کے حاملہ ہونے کی خبر مشہور ہوئی اس پر ولی عہد نے اُن کو پردہ بٹھا کر محل کے رُتبہ پر فائز کر دیا اور نفیس نفیس زیورات اور عمدہ عمدہ کپڑے اور عالی شان محل سرا رہنے کو دی۔ زمانہ حمل ختم ہونے پر اُن کے یہاں ایک صاحبزادہ کی ولادت ہوئی جن کا نام ہزبر علی رکھا گیا اور حضرت امجد علی شاہ نو مولود کے دادا تھے اُن کو فریدون قدر بہادر خطاب عطا کیا اور اُن کی ماں کو بھی نواب معشوق محل صاحبہ خطاب عنایت فرمایا جب واجد علی شاہ نے تخت سلطنت پر جلوس کیا تو معشوق محل کو ملکۂ آفاق تاج النساء نواب معشوق محل کے خطاب سے ممتاز کیا اور مبلغ دو ہزار روپیہ ماہوار اُن کی تنخواہ مقرر کر کے عمارت قیصر باغ یعنی روشن الدولہ کی کوٹھی جو بے مرمت پڑی تھی اس کی درستی کرا کے موصوفہ کو سکونت کے لیے دے دی۔

مرزا فریدون قدر کی شادی واجد علی شاہ کے وزیر اعظم نواب علی نقی خاں کی بیٹی نواب عصمت آرا بیگم سے ۱۲ اکتوبر[1] ۱۸۵۱ء کو ہوئی۔ برات شاہانہ کروفر کے ساتھ گئی۔ جملہ اراکین سلطنت و اقربائی شاہی سُرخ لباس پہن کر ہمراہ برات گئے۔ جب برات گولہ گھاٹ نواب علی نقی خاں کے باغ کے دروازہ پر پہنچ گئی تو سب براتی وہاں سے رُخصت ہو گئے۔ صرف مرزا ولی عہد مع نوشاہ داخل باغ ہوئے اسی روز سہ پہر کو رخصت ہو کر چھتر منزل میں داخل ہوئے۔ تین دن تک روشنی وغیرہ

۱؎ قیصر التواریخ جلد دوم ۲؎ قیصر التواریخ۔

کا اہتمام شرف الدولہ غلام رضا خاں (نو مسلم سابق جگن ناتھ بقال) کی معرفت رہا۔ ۲۲؍
اکتوبر کو ریذیڈنٹ مع دیگر صاحبان والا شان بارہ دری فرح بخش میں تشریف لاکر
شریک دعوت ہوئے۔ واجد علی شاہ کے دو شہزادوں کی شادیاں بڑے تجمل و اہتمام
سے آگے پیچھے ہوئیں۔ پہلی شادی مرزا کیواں قدر کی ۱۹؍ ذی الحجہ ۱۲۷۰ھ کو ہوئی جو
نواب خاص محل سے تھے۔ موصوفہ نے اپنے حوصلے نکالنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی
روپیہ بے جگری سے پانی کی طرح بہایا۔ اس کے بعد ۲۹؍ ذی الحجہ سنہ مذکور کو جنرل
فریدوں قدر کی ہوئی۔ اُن کی والدہ معشوق محل کو خاص محل سے چشمک تھی چنانچہ انھوں
نے اپنے بیٹے کی شادی میں ہر بات پہلی شادی سے بڑھ چڑھ کر کی۔ کسی امر میں ہیٹی نہ ہونے
دی۔ جب دُلہن بیاہ کر آئی تو اُن کو سسرال سے فغفور بہو خطاب ملا۔ اُن سے فریدوں
قدر کے دو بیٹے منے حضور اور ننھے حضور ہوئے۔

مارچ ۱۸۵۶ء میں جب واجد علی شاہ سلطنت سے معزول ہو کر کلکتہ روانہ ہوئے
تو معشوق محل بھی اُن کے ہمراہ گئیں پھر ۱۸۵۷ء میں جب سپاہ باغی نے لکھنؤ میں شورش
برپا کی تو واجد علی شاہ فورٹ ولیم (Fort William) میں نظر بند کر دیے گئے
اور صرف چند مخصوص مصاحبوں اور خدمت گاروں کو اُن کے ہمراہ رہنے کی اجازت
ملی بادشاہ کو اپنے محلات سے جدا ہو کر رہنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا اس لیے تنہائی
میں اُن کا دم بہت اُلجھتا تھا۔ زندگی وبال ہو رہی تھی چنانچہ مولانا شرر مرحوم مثنوی
حزن اختر کے دیباچہ میں تحریر کرتے ہیں:-

"بادشاہ عورتوں کے عشق میں دیوانہ ہو رہے تھے اور بعض
حسینوں سے اس درجہ محبت تھی کہ قید میں جب اُن کے وصل سے
محروم تھے تو ہر وقت انھیں یاد کیا کرتے اور بار بار اُن سے یادگار
محبت کے طور پر اُن کی خاص خاص چیزیں مانگ بھیجتے بعض فرمائشیں

پوری کردیتیں تو خوش ہوجاتے اور بعض نازآفرینی اور خوش ادائی کے انداز سے نہ بھیجتیں تو شکایت کرتے چنانچہ معشوق محل سے اُنھوں نے ہاتھ کے کٹے ہوئے ناخن طلب کیے۔"

حزنِ اختر میں واجد علی شاہ خود لکھتے ہیں :۔

جو بن ہیر ملکۂ ملک اے خوش خصال — ہوئے اُنکی اُلفت کو اٹھارہ سال
طبیعت بہت میری گھبرائی جب — کیا پائے قیصر کا چھلاّ طلب
کٹے ناخن دستِ معشوق سے — طلب یہ کیا دل کے صندوق سے

جو جواب معشوق محل نے شوخ مزاجی سے معشوقانہ انداز میں دیا اس کو بھی بادشاہ نے نظم کے سانچے میں ڈھال دیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں :۔

دیا ملکۂ ملک نے یہ پیام — کہ میرا ہے دنیا میں معشوق نام
منگاتے کے ناخن جو کرتی ہوں پیار — وہ بھیجیں جو ہوں آپ کی رازدار
جو مانگے ہیں ناخن نہیں ہیں وہ اب — یہ حجّام کا کام سیکھا ہے کب

مگر بادشاہ کے لیے ایک خوان کھانوں کا اور پانچ گوریاں روزمرّہ قید خانہ میں بھیجا کرتی تھیں۔ بادشاہ نے بھی ان کو زمانہ اسیری یعنی تخمیناً دو سال کی مدت میں تیس ہزار روپے عطا کیے چنانچہ وہ لکھتے ہیں :۔

دیے ملکۂ ملک کو تیس ہزار
کہ آئے نہ سینے پہ اُسکے غبار

اودھ میں دستور یہ تھا کہ بادشاہ کا بڑا بیٹا ولی عہد ہوتا اور دوسرا افسر فوج اس لحاظ سے وہ عموماً جرنیل صاحب کہلاتا تھا۔ واجد علی شاہ کے سب سے بڑے بیٹے مرزا نوشیرواں قدر حیدر علی مصروع و معذور تھے اس لیے انھوں نے بر سرِ حکومت ہو کر اپنے دوسرے بیٹے مرزا افلاک قدر جاوید علی کو ولی عہد قرار دیا جو نواب عالم آرا بیگم خاص محل

سے تھے اور اُن کے چھوٹے حقیقی بھائی کو جرنیل فوج کا درجہ عطا کیا۔ جب ولی عہد مذکور نے بتاریخ ۲۶ مئی ۱۸۵۸ء[۱] تپ دق و چیچک وغیرہ سے بعمر دس سال پانچ ماہ انتقال کیا تو اپنے تیسرے بیٹے کیوان قدر مرزا حامد علی کو ولی عہد اور اُن کے مختلف البطن بھائی مرزا فریدون قدر ہزبر علی کو جنرل فوج بنایا۔ جب پرنس حامد علی نے بھی عین جوانی میں بعمر ۲۳ سال انتقال کیا تو اس وقت واجد علی شاہ معزول ہو کر کلکتہ میں مقیم تھے مگر زمانۂ بادشاہت کے کل طریقے بدستور جاری تھے۔ اب قاعدہ سے مرزا فریدون قدر کو ولی عہد ہونا چاہیے تھا مگر بادشاہ نے اُن کو نظر انداز کر کے مرزا اعلیٰ مرزا خوش بخت بہادر کو جو فریدون قدر سے چھوٹے اور اُن کی محبوب بیوی نواب اختر محل دختر نواب علی نقی خاں سے پیدا تھے ولی عہد مقرر کر دیا۔ یہ امر مرزا فریدون قدر کو بہت ناگوار ہوا۔ بعد میں مرزا خوش بخت بہادر نے بھی تخمیناً بیس برس کی عمر میں انتقال کیا جب مسلسل تین ولی عہدوں کی جان پر بن گئی تو شاہ معزول نے اس عہدہ کو نامسعود تصور کر کے ختم ہی کر دیا۔ مگر بعد میں بادشاہ کو یہ اطلاع ملی کہ جرنیل صاحب نے رشک وحسد سے ایک بنگالی ساحر کو ایک ہزار روپیہ دے کر جادو کے ذریعے ولیعہد کو ہلاک کرا دیا۔ اس پر انھوں نے برہم ہو کر اُن کی تنخواہ موقوف کر دی چنانچہ یکم جنوری ۱۸۷۸ء کو دہلی میں دربار شاہی ہوا تو جرنیل صاحب نے وہاں جا کر انگریزوں سے بادشاہ کی شکایت کی اُنھوں نے چار ہزار روپیہ ماہوار جرنیل صاحب کے اور ایک ہزار روپیہ اُن کی ماں کے مقرر کر دیئے۔ یہ کل رقم بادشاہ کے زر گزارہ سے وضع ہو کر دونوں کو علیحدہ سے ملنے لگی اس پر بادشاہ نے دونوں سے سخت ناراض ہو کر معشوق محل کی باقی مدت متعہ معاف کر کے آزاد کر دیا اور جرنیل صاحب کو بھی عاق کر دیا۔ چنانچہ دونوں ماں بیٹے دوسرے مکان میں منتقل ہو گئے اور واجد علی شاہ نے اس

---

[۱] تاریخ غضنفری۔

مکان کو کھدوا کر اسی زمین پر دوسرا مکان تعمیر کرایا جس کا نام فتح منزل رکھا۔
اس زمانہ میں دستور تھا کہ جو رئیس وامیر نئی عمارت تعمیر کراتا وہ حسب حیثیت کوئی شے اس کی بنیاد میں ضرور رکھ دیتا۔ چونکہ معشوق محل قوم کی ڈومنی تھیں اس لیے واجد علی شاہ نے اپنے دل کی بھڑاس اس طرح نکالی کہ اُن کی توہین و تذلیل کے لیے نیو میں طبلہ سارنگی رکھ کر نیا مکان بنوایا۔
۱۸۵۷ء میں جب لکھنؤ میں غدر کا طوفان اُٹھا تو معشوق محل کلکتہ میں تھیں لکھنؤ میں اُن کے کارپرداز آغا نجف کشمیری تھے۔ فوج اور اہل کاروں نے مل کر معشوق محل کا سامان خوب لوٹا اور پانچ لاکھ روپے نقد بھی وصول کیے۔ معشوق محل کا امام باڑہ شیش محل کے قریب مومنی کے پورے میں واقع تھا مگر اب وہ منہدم ہو کر بے نشان ہو گیا ہے لیکن ایک شاندار مسجد بطور اُن کی یادگار کے مقام مذکور پر خستہ حالت میں اب تک موجود ہے۔

سکندر محل

یہ جانِ عالم واجد علی شاہ کی بیوی تھیں۔ ابتدا میں اُن کی رسائی بادشاہ تک اس طور پر ہوئی کہ پندرھویں شعبان روز ولادت امام ہمام موصوف نے ایک محفل جشن و نشاط باہتمام محمد حسین خاں (دیانت الدولہ) منعقد کی۔ اس جلسہ میں یہ پری پیکر بھی مجرے کے لیے بلائی گئی۔ اس وقت اس کا نام اُمراؤ تھا اور عمدہ خانم والی مشہور تھی۔ سن پندرہ سال سے زیادہ نہ تھا۔ صورت ایسی دل فریب کہ پیر صد سالہ بھی دیکھتا تو غش آجاتا۔ واجد علی شاہ نے خود اس کے حسن و جمال کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے

۱؎ قیصر التواریخ۔

"اس کی مژگاں نشتر کا کام کرتی تھیں۔ آنکھیں زہر ہلاہل پلانے کو تیار تھیں۔ ابرو زد بان جاہ وتجمل اور کان حسن کے گوشوارے تھے۔ اس کا کتابی چہرہ مضمون عشق یاد دلاتا تھا۔ بینی شاہد انگشت شہادت تھی اس کے عارض ورق گلستاں اور جبین ہمخیال بوستاں تھی۔ اس کی آنکھوں کی سیاہی رشک وہ مشک تاتار اور دونوں رخسار آئینہ بینی گیسوئے دراز رستم کے گلے کے کمند تھے۔ اس کی جعد مشکیں پر سنبل منہ کی کھاتے تھے۔ اس کے خوش رنگ لب جنت کے خرمے دانت بہشت کی شیرینی تھے۔ اس کی زبان خانۂ حسن۔ مسی مالیدہ، لب ابر سیاہ، اس کے ہاتھ مثل برق بجلی کے تھے۔ ساعد سیمیں اپنی خوش اسلوبی میں رشک شمع طور اور صفائی میں قوت بازوئے حسن وجمال حور تھی۔

مختصر یہ کہ اس کا فراد اپر واجد علی شاہ کی طبیعت آگئی۔ اور اُدھر وہ گلبدن غنچہ دہن بھی اُن پر فریفتہ ہوگئی مگر واجد علی شاہ اس وقت خود مختار نہ تھے۔ ولی عہدی کے منصب پر فائز تھے۔ باپ کا خوف غالب تھا اس وجہ سے اس کو گھر میں نہیں بٹھال سکتے تھے چنانچہ اُن کے داروغہ میر مہدی نے یہ تدبیر کی کہ سید ابراہیم نامی ایک شخص نے اس سے متعہ کر لیا اس کے بعد دونوں مجتہد کے پاس گئے اور ایک عرض داشت حرام کاری ترک کر کے نکاح کرنے کے لیے محکمہ شرعیہ میں مجتہدین کی خدمت میں بھجوادی۔ میر مہدی نے اس بارے میں بہت کوشش کی جس سے مطلب برآری ہوگئی۔ اس کے بعد سید ابراہیم نے محکمہ شرعیہ سے واپسی کے وقت اثنائے راہ میں اس کو طلاق دیدی اور وہ نازنیں ولی عہد کو مل گئی۔ انھوں نے اسے جیبۃ السلطان مکرمۃ الزمانی نکہندر بیگم خطاب دے کر ممتاز فرمایا۔ یہ خبر سُن کر ان کی نائکہ عمدہ خانم نے حضرت امجد علی شاہ کے حضور میں فریاد کی کہ ولی عہد بہادر نے میری لڑکی کو جبر و ظلم سے اپنے گھر بٹھالیا ہے

انصاف کی طالب ہوں۔ امجد علی شاہ نے حالاتِ نالش سے مطلع ہو کر سکندر بیگم کو بغرض دریافت حال طلب کیا چوں کر ان کو حرام سے انکار تھا اس لیے استغاثہ خارج ہو گیا اور سکندر بیگم واجد علی شاہ کے پاس چلی گئیں۔

تختِ سلطنت پر جلوس کرنے کے بعد واجد علی شاہ نے سکندر بیگم کا رتبہ بڑھا کر اُن کو حبیبۃ السلطان، مکرمۃ الزمانی جناب سکندر محل صاحبہ کا خطاب عنایت کر کے تین ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کر دی اور خاصہ کھلانے کی خدمت بھی اُن کو عنایت کی۔ جب گیروے میلہ میں واجد علی شاہ جوگی بنتے تھے تو جوگن بننے کا اعزاز نواب سکندر محل کو حاصل ہوتا تھا۔ واجد علی شاہ نے سکندر محل کے لیے پانچ لاکھ روپیہ کی لاگت سے شاہ غازی الدین حیدر کی نجف اشرف کے قریب ہی ایک باغ موسومہ سکندر باغ تعمیر کرایا اس کی تیاری کا خلعت غلام رضا خاں زنجیر، معتمد علی خاں دیانت الدولہ ثابت علی خاں اور کاشی رام مصور کو دیا۔ باغ کا ایک ایک پہلو ہر شخص نے اپنے اپنے اہتمام سے تیار کرایا اس لیے ایک سال کی مدت میں تیار ہو گیا۔ اس میں ایک مسجد بھی تعمیر کی گئی جو مکان کے وسط میں واقع تھی۔ مسجد اور باغ کا عالی شان پھاٹک اب تک موجود ہے جس میں نہایت خوبصورت مینا کاری ہوتی ہے۔ باغ سے دریا تک ایک نئی سڑک بھی بنوائی گئی تھی جس کے دونوں جانب پھل دار درخت نصب کیے گئے تھے۔ یہ سڑک اتنی چوڑی تھی کہ تین بگھیاں برابر بلا تکلف گزر سکتی تھیں اور پھر بھی سڑک کے دونوں پہلوؤں میں ایک ایک گز جگہ خالی رہتی تھی۔

ایک روز سکندر محل نے بڑے ناز و انداز سے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا جانِ عالم میری سب دینی و دنیوی کی آرزوئیں پوری ہو گئیں، صرف تم سے نکاح کرنے کی حسرت باقی ہے، بادشاہ نے شرمندہ ہو کر فرمایا بھلا اب میرا ان دسال نکاح کرنے کے لائق ہے سب صاحبات محل اور بازاری لوگ ہنسیں گے کہ یہ بھی نصیر الدین حیدر

بادشاہ کی طرح دیوانہ ہو گیا ہے مگر سکندر محل نے ایک نہ مانی اپنی ہٹ پر جمی رہیں۔ بادشاہ نے مجبور ہو کر اپنی والدہ ملکہ کشور صاحب کا عندیہ لیا۔ انھوں نے اجازت دیدی۔ آخر انھیں ایک حجرے میں بٹھا کر نکاح پڑھوا دیا گیا۔ سکندر محل نے محفل کی تیاری اور آراستگی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ راگ رنگ کا جلسہ بھی ہوا۔ اور چوتھی وغیرہ کا بھی سب سامان اپنی مرضی کے موافق تیار کیا۔

نکاح کو ابھی تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ سکندر محل نے مدقوق ہو کر انتقال کیا۔ بادشاہ سے اُن کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ واجد علی شاہ کو ان کی وفات کا بہت قلق ہوا۔ چنانچہ لکھتے ہیں ؎

جگہ عیش کی بزم ہستی نہیں ۔۔۔ بجز خونِ دل مے پرستی نہیں
لہو بادہ ہے کیسی نکہت فراغ ۔۔۔ سبو آبلہ ہے یہاں جام داغ
نیت [illegible] سارے تو جانے کے ہیں ۔۔۔ یہ اسباب سب چھوڑ جانے کے ہیں
اجل نے کسے منہ دکھایا نہیں ۔۔۔ یہاں کوئی رہنے کو آیا نہیں
زمانہ کی ہر چیز ہے بے ثبات ۔۔۔ فنا ایک دن ہے جو زندہ حیات
سب [illegible] ہے ۔۔۔ کہ ہے داغ بھی اس میں آئینہ ہے
یہ ترک فلک تیغ بدکحت بکف ۔۔۔ بچھاتا ہے ہر طرف [illegible]
کبھوں کیا کہ کیسا ستایا مجھے ۔۔۔ عجب داغ تازہ دکھایا مجھے
کہ مدقوق ہو کر سکندر محل ۔۔۔ ہوئیں تو گرفتار دامِ اجل
اجل نے چھپایا جو فتراک میں ۔۔۔ نہاں ہو گئیں پردۂ خاک میں
خبر مجھ کو پہنچی تو ماتم کیا ۔۔۔ بہیں ندیاں اشک کی غم کیا
وفادار تھیں وہ جو صاحب وفا ۔۔۔ نہایت مجھے اُن کا صدمہ ہوا
وفادار کا چھوٹنا جبر ہے ۔۔۔ مگر مرہم اس داغ کا صبر ہے

سکندر محل کی حیات تک تو سکندر باغ اُن کے قبضہ و تصرف میں رہا۔ چونکہ اُن کا
کوئی وارث نہ تھا اس لیے اُن کے انتقال پر باغ پھر ملک سرکار ہو گیا اور ضبطی سلطنت
کے ساتھ یہ باغ بھی ضبطی میں آ گیا۔ اب اس میں (Hart. Cul Gural Gardens)
ہے۔ سرکاری درختوں کا ذخیرہ ہے اور پودے اور گملے فروخت بھی ہوتے ہیں۔ پُرانی
عمارت میں صرف مسجد دیکھا تک رہ گیا ہے۔

سرفراز محل

سرفراز محل جان عالم واجد علی شاہ کی متاعی بیوی تھیں۔ اُن کے ابتدائی حالات
کی بابت موصوف پری خانہ میں خود تحریر کرتے ہیں کہ ایک روز ایک کسبی جس کا نام
گنا تھا اور جس نے اب پیشہ سے توبہ کر کے اپنی ماں بیبا جان کے رشتہ داروں میں
سے ایک کے ساتھ عقد کر لیا تھا۔ مجھے خواب میں دیکھ کر دیوانوں کی طرح خواب سے
بیدار ہوئی۔ اُسی وقت سے میری محبت کا تیر اُس کے جگر میں پیوست ہو گیا۔ اُس کی
عُمر ستائیس برس کی تھی۔ چہرہ پر چیچک کے داغ تھے۔ مگر چشم و ابرو غضب کے بائے
تھے، قد خوش نما تھا۔ آخر الامر اُس نے شیخ غلام علی کمیدان کے ذریعہ سے فروز خواجہ سرا
کی معرفت پریوں میں شامل ہونے کا پیغام میرے پاس بھیجا۔ میں نے قبول تو کر لیا مگر
وہ شوہر دار تھی اس سبب سے انکار کر دیا۔ اس نے اسی وقت شوہر سے طلاق لے لی
اس کے بعد میں نے اس کو گھر بٹھا لیا اور سرفراز پری خطاب دے کر معزز و ممتاز کر دیا
اسی کی محبت نے سب سے زیادہ میرے دل میں جگہ کی۔ یہ عورت خوش پوشاک و
طرحدار تھی جب میرے گھر پری تھی تو میں روز اس کی تیغ ابرو کا کشتہ ہوتا تھا اور ہر
لحظہ ناوک مژہ میرے جگر کے پار ہوتا تھا اس کی ایک ادا پہ ہزار ہزار عاشق رنج و غم

اپنے سینہ پر رکھتا تھا۔ اُس کے ایک ناز سے ہزار طرح کا رنج والم میرے دل کو پہونچتا تھا اُس کے ناچنے پر میں رونے لگتا تھا اُس کے گانے پر سر در گریباں ہو جاتا تھا۔ جس وقت اس کی تعلیم ہوتی تھی میں بے اختیار اس کی دلربائیوں کا نظارہ کرتا تھا جب وہ سوتی تھی تو میں تمام رات جاگتا تھا اور جب جاگتی تھی تو میرے عشق کا حوالہ دوسروں پر کرتی تھی۔ میں تمام رات اس کے پاؤں دبایا کرتا تھا۔ تمام دن اس کے حسن جہاں تاب سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ اگر وہ اپنے کھانے میں سے مجھے کچھ دے دیتی تھی تو میں کھا لیتا تھا اگر نہیں دیتی تھی تو میں نہیں کھاتا تھا۔ جس جگہ وہ جاتی تھی میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے رہتا تھا۔ جس مقام پر وہ بیٹھ جاتی تھی میں کھڑا ہو کر روتے لگتا تھا۔ الغرض اُس نے ہزار دل یکحرہ فریب سے مجھے اپنا عاشق بنا لیا تھا وہ دن بھر میں کئی لباس رنگ برنگی بدلتی تھی ہر وقت حنا کا عطر لگائے رہتی تھی۔ ہونٹوں پر ہر وقت پان کی سُرخی لگی رہتی اکثر اس کے ماتھے پر افشاں بھی چنی ہوتی۔ ہر وقت اپنے بالوں کو خوب صورتی کے ساتھ بنائے رہتی۔ کبھی ہاتھوں میں مہندی لگائے ہوئے اور انگلیوں کے پوروں پر چھوٹی چھوٹی انگوٹھیاں پہنے رہتی تھی۔ غرض ہزاروں اداؤں سے میرا دل لبھاتی تھی اور میں بے تکلف اس کی بادہ اُلفت سے سرشار تھا۔ جب وہ مجھ کو اشارے سے بلاتی تھی میری جان میں جان آجاتی تھی۔ اکثر علالت میں دوار بحال اس کو رات رات بھر اپنے سینے پر رکھتا تھا۔ اس کی محبت میں تمام دنیا فراموش کردی تھی۔

ایک روز داروغہ نجم النساء، خورد محل اور افشاں محل نے متفقہ طور پر حاضر ہو کر عرض کیا کہ تمام عورتوں کی جنس میں بدی ہوتی ہے بے مُروّتی اُن کے آب و گل میں ہے۔ گو سرفراز پری بھی بظاہر آپ سے تپاک رکھتی ہے مگر باطن میں آپ کا ذرا خیال نہیں کرتی میں یہ سُن کر بہت پریشان ہوا اور اس کی وجہ دریافت کی تو ان لوگوں نے کہا کہ چند سے تامل فرمائیے۔ آگے چل کر ہم اس کی بیوفائیاں حضور کو دکھا دینگے

ایک روز دلدار پری نے بھی سرفراز پری کی بیجا نازبیوں اور ادائیوں کا ذکر
چھیڑ کر کہا اے جان عالم آپ کس قدر نادان ہیں کہ عورتیں آپ کو چھل دیتی ہیں اور آپ
اُن کی اطاعت میں غافل بیٹھے ہیں۔ برائے خدا اس غفلت سے باز آئیے۔ آپ کو اپنے
گھر کا مطلق خیال نہیں ہے۔ آخر ہم نے ایک روز بہزار شکوہ و شکایت سرفراز پری کا
ہاتھ پکڑ کر کہا اے یار جانی۔ اے معشوق لاثانی تو عبث مجھ کو ستاتی ہے الزام کرتی ہے۔
تیری ان باتوں سے مجھے سخت صدمہ ہے۔ اُس نے پھر قسمیں کھا کھا کر اپنی استواریٔ الفت و
محبت کا یقین دلایا۔ یہ باتیں کرنے میں بھی۔ وہ رنگتی تھی کبھی ہنسنے لگتی تھی۔ کبھی
کستی تھی خوب ہوا تمہاری یہی سزا ہے چنانچہ ایک روز اس کے ہاتھ کی انگوٹھی لے کر
میں اپنے تن زار پر گل کھانے کو تیار ہو گیا۔ جب صبح کو چوکی پر بیت الخلا کے لیے تخت بانچ
میں لے کر گیا تو چاہا اس انگوٹھی کو آگ میں گرم کر کے اپنے جسم پر رکھ لوں مگر چونکہ وہ
انگوٹھی اس بیوفا کے ہاتھ کی تھی۔ یہ میرے دل نے قبول نہ کیا کہ اسے آگ میں ڈالوں بقول
شاعر۔ ؎ اے گل بدن اسواسطے گل کھا نہیں سکتا

چھلے کو ترے آگ میں جلوا نہیں سکتا

آخرکار پیتل کی ہنسیاں خوب گرم کر کے بائیں ران میں آٹھ جگہ گل دیئے جب بھی
اس کی محبت کی آگ میرے دل سے کم نہ ہوئی ایک دن میں نے اُس سے کہا کہ اے جفا کار
ستم شعار دیکھ میں نے خود کو تیری محبت میں جلا لیا ہے یہ سن کر وہ بہت کھل کھلا کر ہنسی
اور ان گلوں کو خوب چوما چاٹا۔ لیکن اس کی لاپروائی پہلے سے چند در چند زیادہ ہو گئی
اور کسی طرح میرے حال زار پر رحم نہ آیا۔ جب اُس نے میرا خیال نواب معشوقہ خاص
کی طرف زیادہ مائل دیکھا اور میں بھی خود اُس کے جلانے کو اُس کے روبرو معشوقہ خاص شہ

شہ اچھے صاحب طوائف جس کو واجد علی شاہ نے اولاً رشک پری خطاب دیا پھر
محل خسین ہو کر ملکہ عالم معشوقہ خاص نواب سلطنت محل صاحبہ خطاب عنایت کیا۔

سے زیادہ ارتباط و پیار و اخلاص کرتا تھا۔ آخر اُس نے معشوقہ خاص سے لڑنا شروع کیا ایک روز ہُشت مُشت کی نوبت آگئی اُس کے جھونٹے اس کے ہاتھ میں، دو پہر تک لڑائی برقرار رہی۔

جب میں نے دیکھا کہ اُس کی لاتوں سے معشوقہ خاص زیر ہو گئی ہے تو بے تابانہ دوڑ کر معشوقہ خاص کا سینہ سپر ہو گیا اور سمجھا بجھا کر لڑائی موقوف کرائی۔ لیکن معشوقہ خاص نے اسی وقت میرے دست بگریباں ہو کر کہا کہ تم اپنے معشوقوں سے میری بے عزتی کراتے ہو۔ میں ہرگز ہرگز تمھارے گھر میں نہ رہوں گی اور سوار ہو کر چلی گئیں مگر پھر کچھ سوچ سمجھ کر مُرغ خانہ تک جا کر واپس چلی آئیں۔ اُن کی واپسی پر سرفراز پری نے اسی وقت سوار ہونے کا قصد کیا اور بڑے کنوئیں تک بیتابانہ بُرے ارادے سے چلی گئی تاکہ خود کو اُس میں گرا دے مگر اور لوگوں نے دوڑ کر ہاتھ پکڑ لیے میں نے بہت سمجھایا مگر اُس پر مطلق اثر نہیں ہوا اور اپنے گھر جانے پر تیار ہو گئی۔ میں نے بھی دل مضبوط کر کے کہا ذرا تیکیوں ہو چلی جاؤ۔ یہ سُن کر وہ جفا کار سوار ہو کر چلی گئی ادھر میں اُس کی تصویر گلے میں ڈال کر ایک مکان میں بند ہو کر بیٹھ رہا مگر چار گھنٹہ کے بعد وہ ستم شعار بھی واپس آ گئی۔ اس واقعہ کے بعد واجد علی شاہ نے ایک روز حضور باغ میں جلسہ کیا اس میں سرفراز پری کو محل کا درجہ عطا کر کے اس کو عاشقہ اخاص انجمن افروز سرفراز بیگم صاحبہ کا خطاب عطا فرمایا اور پردہ میں بٹھا دیا چنانچہ خود لکھتے ہیں:۔

سرافراز و ممتاز و سوم ہوئیں	پری سے سرافراز بیگم ہوئیں
بڑھی قدر گل سے چمن ہو گئیں	فروزندۂ انجمن ہو گئیں
زیادہ ہوا اس قدر اختصاص	ہوئیں عاشقہ ایک بالفظِ خاص

جب سرفراز پری کو محل کیے ہوئے چند روز گزر گئے اور اُس کو باہر بے پردہ آنے کی ممانعت ہو گئی تو سُنا گیا کہ اُس کو پردہ کا مطلق خیال نہیں ہے اور چھتر منزل سے

دریائے گومتی کا نظارہ کیا کرتی ہو۔ اکثر دوسری بیگمات نے بھی بیان کیا کہ وہ پردہ میں بٹھائے جانے سے بیحد روتی ہیں مگر جب واجد علی شاہ کا سامنا ہوتا تھا تو کہتی تھیں میں تمھارے فراق میں روتی ہوں اور یا تو تم ہمارے پاس رہو یا مجھے بھی باہر لے چلو ہرچند واجد علی شاہ نے سمجھایا کہ پردہ میں بیٹھنے کے بعد باہر جانا بڑی قباحت کی بات ہے۔ مگر وہ بجز رونے دھونے کے سمجھانے کا کچھ خیال نہ کرتی تھیں۔ زار و قطار روتی بیٹھتی تھیں۔ کبھی کبھی کئی دن تک کھانا نہیں کھاتی تھیں۔ کبھی واجد علی شاہ کو بھی محل کے باہر نہیں جانے دیتی تھیں۔ اور کہتی تھیں تمھاری جدائی میں میرا یہ حال ہو گیا ہے اگر تم مجھے باہر نہ لے چلو گے تو میں اپنے تئیں ہلاک کر ڈالوں گی۔

ایک روز جبکہ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی واجد علی شاہ اپنے تمام محلات کو ساتھ لے کر بغرض سیر و تفریح بادشاہ باغ تشریف لے گئے۔ مگر سرفراز محل کو چھوڑ گئے اس پر اس نے بگڑ کر اسی رات میں بادشاہ کے فراق میں ہیرے کا نگ انگوٹھی سے نکال کر کھا لیا۔ آخر کار اس کا علاج ہوا اور شفایاب ہوئی۔ اس کے بعد اس نے پھر محل سے باہر آنے پر اصرار کیا واجد علی شاہ نے بہت سمجھایا کہ اب تم محل کے رتبہ پر پہونچ گئی ہو باہر جانے میں بڑی آبروریزی ہو گی مگر اس پر مطلق اثر نہ ہوا۔ آخر کار واجد علی شاہ مجبور ہو کر اس کو پھر باہر لے آئے اور وہ دوبارہ بازار والیوں میں شامل ہو گئی لیکن اس کی بڑھی ہوئی ہیو فائیاں دیکھ کر بادشاہ نے اسے اس کی ماں کے یہاں بھیجا۔ مگر دو چار دن کے بعد طبیعت پھر پلٹا کھا گئی۔ اور قطب الدولہ کے ذریعہ ہزاروں حیلوں حوالوں سے اس کو واپس بلا لیا مابعد یہ خبر گرم ہوئی کہ وہ غلام رضا خاں ڈھاری سے پھنسی ہوئی ہے جس کو واجد علی شاہ نے تخت نشین ہو کر رضی الدولہ مرضی الملک غلام رضا خاں بہادر ہزبر جنگ مصاحب خاص حضرت سلطان عالم خلد اللہ ملکہ و سلطانہ، کا خطاب دے کر عرش کا تارا بنا دیا تھا۔

سرفراز محل تو برسوں سے بادشاہ کے یہاں تھیں۔ یہ واقعات سُن کر بادشاہ کو بےحد قلق ہوا بعد کے واقعات اُنھوں نے خود اس طرح بیان کیے ہیں:-

محرم کی تھی ساتویں آشکار
سنِ شصت و شش دو صد و یک ہزار

عیاں رازِ دل بے تامل کیا
نیا عارفانہ تجاہل کیا

سرافراز پر کی یہ حجت تمام
کہ خانہ نشینی کا بھیجا پیام

مجھے علم ہر چند تھا یہ حصول
کہ ہرگز یہ اُس کو نہ ہوگا قبول

مگر بہرِ عشق امتحاں ہے محک
کھرے کھوٹے کا دو دو ہوتا ہے تک

جو تھا زعم میرا ہوا آشکار
نہ اقبال اُس نے کیا زینہار

رہا میں بھی در پئے اسی امر کا
پیاما مگر یہ اُسی سے کہا

کریا گھر کا دروازہ مسدود کر
دیا ہو روانہ کہ خالی ہو گھر

عزادار تھی گو کہ وہ بدخصال
عزا کا بھی اس کو نہ آیا خیال

کیا اُس نے بابِ عزاخانہ بند
کہ تھی خاطرِ دوست خاطر پسند

اسے دوست کیا اُن کا جانی کہوں
فقط دشمنِ ناگہانی کہوں

ارادہ کیا ترک کا ایک شب
رکھا ادھر اُن گھر کے باہر قدم

کہاں گھر سے جاتی وہ طاقت بھی تھی کیا
مگر مرضیٔ مالکِ دولت بھی تھی

ملاقات ہوتی تھی جو دیر دیر
مری سمت سے ہو چکی تھی وہ سیر

یہ سمجھی تھی ہے صاف وجہ ملال
وصالِ غلامِ رضا کا خیال

اُسے گو میں سمجھا تا تھا بیشتر
نہ ہوتا تھا کچھ اُسکے دل پر اثر

اثر کیا ہو ناداں کو کوئی کہے
غرض ایک دن آکے کچھ دن رہے

کیا زیبِ بازو بہ لطفِ تمام
زرِ نذرِ ثامن علیہ السلام

زیارت کا مجھ سے بہانہ کیا
جو اسباب تھا سب روانہ کیا

ہوئی چھوڑ کر گھر کو المختصر | وہ باکی طرح شہر سے بدر
یہی ہر طرف شور برپا ہوا | کہ خس کم جہاں پاک اچھا ہوا
پہنچتی ہے پرچوں سے مجھ کو خبر | نصاریٰ کے کشور میں ہے دربدر
پریشاں حیا ہر طرف شرم دور | کبھی گھر بے باندہ کبھی کان پور
غلام رضا سے ہے جاری مدام | طریق تحائف سلام و پیام

سلیمن صاحب ریذیڈنٹ اودھ اپنے سفرنامہ اودھ میں بیان کرتے ہیں کہ بادشاہ نے نومبر ۱۸۴۹ء کے آخر میں سرفراز محل کو طلاق دیدی اور اس کو برائے زیارت مقامات مقدسہ جانے کے لیے گنگا کے اس پار اُتار دیا۔ وہ عرصہ سے غلام رضا سے اٹکی ہوئی تھی اور بہت آوارہ مزاج عورت مشہور تھی اُس نے بادشاہ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر مجھ کو میرے ملنے والوں سے ملاقات کی مخالفت کی جائے گی تو میں کسی طرح محل کے اندر قیام نہیں کر سکتی بادشاہ نے اولاً غلام رضا اور اُس کے ساتھیوں (قطب الدولہ و سراج الدولہ وہاج الدولہ ثابت الدولہ وغیرہ) کو گرفتار کر کے سنجہ والے اصطبل میں مقید کر دیا اور جو کچھ مال دنیا اُن کے پاس تھا وہ سب ضبط کر لیا مگر وہ لوگ کئی لاکھ روپیہ کی جائداد پہلے ہی سے اپنے دوستوں اور عزیزوں کو اودھ کے باہر بھیج چکے تھے لیکن واجد علی شاہ نے بری خانہ منظوم میں ضبطی مال و اسباب کے واقعہ سے انکار کیا ہے اور تحریر کیا ہے کہ ہیں نے صرف اس خیال سے اُن کی جائداد ضبط نہیں کی کہ لوگ اپنے دل میں کہیں گے کہ بادشاہ نے صرف ضبطی مال کے لیے یہ حیلہ تراشا ہے واجد علی شاہ کے مصاحب شیخ غلام حیدر صنبر بھی آئینِ اختر میں اسی خیال کی تائید ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

خطا ایک سے کچھ ہوئی ناگہاں | کیا کوئی کار فرد رائیگاں
ہوئے واقفِ جرم ہرچند شاہ | نہ پھیری مگر عاطفت کی نگاہ

مگر بسکہ وہ جو فرد مایہ تھا
نہ چھوڑی کسی طرح راہِ خطا

نہ لایا جو وہ دھیان میں حکم شاہ
دکھانے لگا رنگ بختِ سیاہ

متغض ہوئے سب شاہِ زمن
ہوا بحرِ قہر و غضب موجزن

اُسی کے جو تھے واسطہ دار سب
ہوئے ساتھ اُس کے گرفتار سب

مخالف جو چرخِ کہن ہو گیا
تو نشہ وہ سارا ہرن ہو گیا

ہوئے قہرِ سلطاں سے جب وہ اسیر
ملا اُن کو زنداں میں فرشِ حصیر

پس ہفتہ پھر رحمِ سلطاں ہوا
یہ ارشاد بہرِ اسیراں ہوا

کہ اب بھی کریں تو یہ اہلِ خطا
نہ مانیں تو محبس سے کر دو رہا

چلے جائیں وہ سب سرے شہر سے
بچا جائیں جان آفت و قہر سے

گلابی جو ہیرے دیئے ہیں انھیں
جو خلعت عنایت کیے ہیں انھیں

زمرد گہر لعل و یاقوت و زر
نہ ہوں ضبط لے جائیں سب لاد کر

نہ لے نام ہرگز کوئی ضبط کا
کہ جو جس کو ہم نے دیا وہ دیا

غرض شہر سے وہ نکالے گئے
مع سیم و زر جانے والے گئے

واجد علی شاہ نے مساۃ گنا المخاطب بہ سرفراز محل کے واقعات کی ایک نہایت دل چسپ مثنوی بھی لکھی ہے جس میں کل حالات صاف بیان کر کے اپنے دل کا بخار نکالا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:۔

میں دلی عہد جن دنوں میں تھا
اس زمانے کا ہے یہ سب قصّا

اک زنِ فاحشہ تھی گنا نام
راحتِ جاں بھی تھی وہ خوش انجام

نائکہ اس کی تھی جو جانِ جہاں
لوگ کہتے تھے اس کو بیا جان

شادی کر دی تھی اس نے گنا کی
اس کے چیلے کے ساتھ چمپی تھی

گنا کی بابت کہتے ہیں:۔

میں نے دیکھا تو خوب صورت ہو کچی مٹی کی پختہ مورت ہے
لاکھ تدبیر ہم نے ٹھیرائی پر نہ باز آئی وہ نہ باز آئی
ایک الّو کے جال میں وہ پھنسی ایسی روئی کہ پھر کبھی نہ ہنسی

آگے چل کر اس کے عاشق زار غلام رضا کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :۔

چند بھی تھا وہ ڈھاری کا پیشاب گہ کے گھڈی پہ لیتا تھا جو نہ آب
ہو گیا تھا حضور میں ممتاز کر لیا تھا کچھ اور ہی انداز
نو برس کا تھا مجھ سے اُس سے ربط سب وہ بھولا ہوا کچھ ایسا خبط
میں نے اس کو کیا تھا ایسا نہال کہ وہ کوّے سے ہو گیا تھا لال
رات دن میرے ساتھ رہتا تھا جو نہ کہنا تھا مجھ سے کہتا تھا
مجھے ایک مرد سادہ دل پایا کام اس قلتبان کا بن آیا
نام ایسا جگر کا ایسا سخت تھا غلام رضا وہ کب کم بخت

اور مجکو لٹائے رکھتا تھا اپنی گوٹی بچائے رکھتا تھا
اور گنا سے مجھ سے تھی الفت نو برس دس برس کی تھی صحبت
سنا اک روز میں نے یہ قصہ وہ غلام رضا کا ہے حصہ
غصہ بھی آیا پیچ و تاب کیا رخ کو رشک گل گلاب کیا
محلوں میں ہو چکی تھی وہ ممتاز پر نہ سمجھی ہزار راز و نیاز
چھوڑ کر سلطنت وہ اندر کی ٹھوکریں کھاتی ہے وہ بندر کی
مرد کم فہم نے بھی عاشق ہو تج دیا اپنے مال و دولت کو
چھوڑ کر حکم سارا اور شاہی دونوں کے دونوں ہو گئے راہی

مرد تھا چند دن یہاں پر قید
باز آئے وہ تا کہ جانے دے کید

پر نہ باز آیا سخت جاں تھا وہ
نہیں معلوم دل کہاں تھا وہ

اور زیارت کا ذن نے کر کے کید
اُڑ گئی صیاد بن کے لے کر صید

دونوں کپو کو ہو گئے راہی

ہمیں چھوڑا نہ سلطنت چاہی

نواب سلطان جہاں محل

لکھنؤ کی مشہور مہندی کی بانیہ

یہ سلطان عالم واجد علی شاہ کی زوجہ ممتوعہ تھیں۔ داروغہ میر واجد علی ان کی ڈیوڑھی کے داروغہ تھے۔ لکھنؤ میں دلبر و حیدری دو بہنیں بیگم سگی بہنیں طوائف کا پیشہ کرتی تھیں۔ دلبر کا ناچ گانے میں مثل و نظیر نہ تھا۔ وہ واجد علی شاہ کی خدمت سے بھی سرفراز ہو چکی تھی۔ اُس نے اپنی چھوٹی بہن حیدری کو جو اس وقت صرف گیارہ برس کی منھ بند کلی تھی اور تھوڑا بہت ناچ گانے سے بھی واقف تھی واجد علی شاہ کے حضور میں بزمانۂ ولی عہدی لطور نذر پیش کیا۔

انھوں نے اُس کی پیش کش قبول کر لی اور "سلطان پری" خطاب دے کر پریوں کے سلسلہ میں اُس کی تعلیم موسیقی شروع کر دی۔ واجد علی شاہ خود بھی سلطان محل کے ابتدائی حالات یوں تحریر کرتے ہیں:-[1]

جو کہ بیٹی ہیں دلبر و حیدری — بہت گرم مشّاق رامشگری
بہت نام آور جو پایا انھیں — ہوئی دل کی خواہش بلایا انھیں
کچھوں کیا جو آنے کا باعث ہوا — بشیر[2] اُن کے لانے کا باعث ہوا
فقط تھیں نہ گانے میں وہ بے نظیر — حسینہ بھی مانند بدر منیر
غنا پیشہ اور نامور چار سو — نگینہ بنا نام سے لکھنؤ
مگر دونوں بہنیں تھیں رشک پری — جو دلبر کلاں خرد ہے حیدری
ہوئی تھی جو دلبر بناز و نیاز — کبھی میری خدمت سے بھی سرفراز
تو گردن پہ تھا اُس کے بار گراں — نہ لائی تھی تو نظر بے گماں
حقیقی بہن اس کی تھی خرد تر — مہ نو ہوا تھا نہ پورا قمر
ہوئے نہ تھے کامل جوانی کے دن — کہ کل اُس کا گیارہ برس کا تھا سن
اُسے ساتھ لا کر کیا پیش کش — میں راضی ہوا اور لیا پیش کش
معزز اُس فن میں تھی مطلقاً — اُسے کچھ کچھ آتا تھا رقص و غنا
جو صورت میں تھی ماہ تاباں پری — مخاطب ہوئی وہ بہ سلطاں پری

آگے چل کر ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:-

چوں کہ غیروں نے بہ سبب رشک سلطان پری کی طرف بیوفائی و کج ادائی کا الزام لگایا تھا لیکن درحقیقت وہ میری شیفتہ و فریفتہ تھی جب یہ خبر اس کے کانوں تک پہونچی تو اس قدر روئی کہ تین روز میں از حد دُبلی ہو گئی اور غم و غصّہ کی وجہ سے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ آخر ضبط نہ کر سکی اور میری لاعلمی میں میری ولی عہدی کی مہر کا نگینہ

---

[1] پری خانہ منظوم واجد علیشاہ
[2] بشیر الدولہ خواجہ سرا سے مراد ہے

گرم کر کے اپنی ران پر تین جگہ جما لیا۔ جس سے مہر کے تمام حروف اس کی کھال میں پیوست ہو گئے اور لنگڑاتی ہوئی میرے پاس آئی جب میں نے دریافت کیا تو رو کر میری مہر میرے ہاتھ میں دے کر کہا اے جان عالم قربان ہو جاؤں تم نے مجھے بیوفاؤں کے زمرہ میں شمار کیا تھا۔ اب دیکھو میرے پاؤں کا کیا حال ہے جب میں نے دیکھا تو واقعی مہر اس کی رانوں میں تین جگہ اتر گئی تھی اور میرے نام کے تمام حروف مثل آفتاب درخشاں و تاباں تھے میں شرمندہ ہو کر عذر کرنے لگا۔ وہ میرے گلے سے چمٹ گئی اور اس کی طرف سے میرا دل صاف ہو گیا۔

ایک اور مقام پر تحریر کرتے ہیں

"ایک روز چودھویں تاریخ کو جب چاند درجہ کمال پر تھا میں نے پری خانہ کے کاملین فن کے حاضر ہونے کا حکم دیا چنانچہ شام کو سب طلبیدہ لوگ درِ دولت پر حاضر ہوئے جب محفل جمع ہو چکی تو ان سیم تنوں میں سے ہر ایک نے ناچ گا کر مولی فلک کو سرشار کر دیا۔ کسی کی مجال نہ تھی جو ان مہوشوں کی حرکت پر نکتہ چینی کر کے کوئی سقم ظاہر کرے۔ ان سب میں سلطان پری نے خصوصاً اپنے کمال کا ایسا اظہار کیا کہ غش کی نوبت پہونچی سب باکمالوں نے متفق ہو کر کہا کہ یہ موسیقی علم کی تعلیم نہیں سحر سامری ہے "

تخت نشین سلطنت ہو کر واجد علی شاہ نے سلطان پری کو نواب سلطان جہاں محل صاحبہ خطاب دے کر دو ہزار روپے ماہوار کی تنخواہ مقرر کر دی مگر عوام میں وہ صرف سلطان محل کے نام سے مشہور ہوئیں۔ یہ بادشاہ کے ساتھ کلکتہ نہیں گئیں۔ قیصر باغ میں مقیم رہیں ۵۷ء میں جب شورش و بغاوت کی گھنگھور گھٹائیں لکھنؤ پر چھا گئیں تو موصوفہ بھی گوناگوں مصائب کا شکار ہوئیں مگر دارغہ واجد علی کے ساتھ اتحاد عمل کر کے

انھوں نے دو انگریز خواتین کی جانیں بچائیں۔ اس کارگزاری کے صلے میں جاں بخشی کے علاوہ کمپنی میں اُن کی سُرخروئی بھی ہوئی۔ ذٹ برقرار رہے، جاگیر بحال رہی اس کے علاوہ گزارہ بھی مقرر ہوا اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جب شورش وبغاوت کی گھنگھور گھٹائیں لکھنؤ میں چھاگئیں تو ایک اور خبر آئی کہ بندہ حسن ساکن موضع عبور ریاست ڈھوریہ کے چکلے چار انگریز اور چار انگریزنیں بطور تحفہ پکڑ لائے ہیں جن کے نام یہ ہیں:—

(۲) سر ماؤنٹ اسٹوآرٹ جیکسن Sir Maunt stuart Jackson

(۳) لفٹننٹ بارنس Lieut Barnes

(۴) سارجنٹ نارٹن Sergeant Narton

(۵) اہلیہ کپتان آر Mrs arr

(۶) دختر کپتان آر Miss arr

(۷) مس میری جیکسن Miss Mary Jackson

(۸) مس صوفیہ دختر مسٹر کرسچین کمشنر خیرآباد عمری ۸ سال Miss safia christiana

محرم ۱۲۷۴ھ میں جب مندرجہ بالا انگریزنیں و انگریز گئی میانوں، ڈولیوں اور بیل گاڑیوں میں درِ دولت پر پہونچے تو تلنگوں نے چاروں طرف سے زغہ کیا کوئی کہتا تھا ان کا قصہ ابھی پاک کر دو۔ کوئی کہتا تھا یہاں لے کیوں آئے وہیں ختم کر دیا ہوتا۔ قصہ کوتاہ یہ کہ ان سبھوں کو دارو غہ واجد علی نے ایک مکان میں اُتار کر فوجی پہرہ مقرر کر دیا پھر اُن کا معاملہ جنگی عدالت کے روبرو پیش ہوا۔ میر امداد حسین برادر کپتان میر فدا حسین، رگھوناتھ سنگھ، اُمراؤ سنگھ، کپتان بارلو (Barlow) ملازم سرکار اودھ نواب ممو خاں اور دارو غہ میر واجد علی ایک طرف نواب شہنشاہ محل و نواب خورد محل عمدہ بیگم نے از راہ مآل اندیشی فرمایا کہ یہ عجیب ماجرا ہے کہ واجد علی شاہ کلکتہ

میں نظر بند ہیں تو انگریز انھیں اعزاز و احترام سے رکھتے ہیں لیکن تم لوگوں کا ارادہ ہو کہ اُن اسیروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیں پس تم لوگ خود چاہتے ہو کہ واجد علی شاہ تہ تیغ کر دیے جائیں۔ یہ سُن کر ممو خاں نے کہا بہتر ہے بالفعل قتل نہ کرو بلکہ عزت اور آرام سے رکھو۔ اس امر کو سب افسروں نے بھی منظور کر لیا اور حکم دے دیا کسی عمدہ مکان میں لے جاؤ اور پاؤں کی بیڑیاں کٹوا دو۔ داروغہ واجد علی نے نگینے والی کوٹھی تجویز کی اور مرزا حسین علی داروغہ چار خانہ کو بلوا کر سامان چاء پانی وغیرہ منگوا دیا اور سب ضروری سامان آسائش بھی رکھوا دیا مگر تلنگوں نے اپنا پہرہ نہ اٹھایا۔ ہر چند داروغہ صاحب اس فکر میں رہے کہ اُن کا پہرہ اُٹھ جائے اور اگر قائم رہے تو بدلی نہ ہو تا کہ اُن کو کچھ منھ بھرائی دے کر ہموار کر لیں مگر یہ تدبیر بن نہ پڑی اس پر تلنگے کسی طرح رضامند نہ ہوئے۔ کمانڈر انچیف کے داخلہ لکھنؤ سے قبل دیوان امرت رام وکیل راجہ مان سنگھ اور داروغہ واجد علی میں مشورہ ہوا کہ جب تلنگے راہِ فرار اختیار کریں گے تو غصے میں آ کر کپتان آر وغیرہ کو ضرور ختم کر دیں گے اس لیے انھیں کسی صورت سے قیصر باغ کے باہر لے جانا چاہیے۔ وجہ یہ تھی کہ جب آر صاحب کی پلٹن راجہ مان سنگھ کے علاقہ میں متعین تھی تو دیوان جی اور کپتان آر میں بہت مراسم ہو گئے تھے اسی سبب سے وہ اُن کی رہائی کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ غرض دونوں نے ممو خاں کے پاس جا کر دریافت کیا کہ تم کو آر صاحب کی جان لینا منظور ہے یا اُن کو بچانا جواب دیا اپنے امکان بھر بچانا میر واجد علی نے کہا کہ اس جائے رہائش میں تلنگوں نے انھیں دیکھ لیا ہے ایسا نہ ہو کہ زبردستی چھین کر لے جائیں اور سر قلم کر دیں اس لیے دوسری جگہ رکھنا چاہیے۔ ممو خاں نے کہا پھر تم جو مناسب خیال کرو وہ راہ اختیار کرو اس پر داروغہ صاحب نے پہرہ کے نجیبوں سے کہا کہ ہم تم کو سو روپے دیں گے صاحب کو دوسرے مکان میں پہنچا دو

وہ راضی ہو گئے اور دیوان انت رام سے طے ہوا کہ جب وہ قیصر باغ کے باہر
آجائیں تو تم پہلے گڑھی شاہ گنج پھر وہاں سے الہ آباد بھجوا دینا چنانچہ دارو غہ
واجد علی نے انجام پر نظر ڈال کر پہلے اپنی بیوی بچوں کو وہاں سے ہٹا دیا اور راجہ
کے پانچ سو آدمی محلہ گولا گنج میں امام باڑہ ملکہ زمانیہ کے قریب آ کر جمع ہوئے یہاں
ڈولیاں تیار کیں۔ اسباب بھی لد چکا فقط اسیروں کے سوار ہونے کی دیر تھی مگر
نیبجے خاں سپاہی ساکن خیر آباد نے کہا شاید راہ میں کوئی تلنگہ ٹوک دے اس لیے
میں ڈولیوں کے ساتھ نہ جاؤں گا اور اُس نے جا کر یہ کل ماجرا خفیہ طور پر ممو خاں
کے گوش گزار کیا کہ آر صاحب کو یہاں سے لے جانے کی تدبیر ہو چکی ہے۔ آپ سے
از راہ خیر خواہی عرض کیا ہے مگر ساتھ ہی اُس نے تلنگوں کو بھی اس راز سے مطلع
کر دیا۔ ممو خاں نے کہلا بھیجا یہ کیا کر رہے ہو۔ سب تلنگے جھلائے ہوئے ہیں ایسا نہ ہو
اسی حیلہ سے ہم سب کا قلع قمع کر ڈالیں۔ انھوں نے جواب دیا ہم نے تمھاری اجازت
سے انھیں قیصر باغ کے باہر علیحدہ رکھنا چاہا ہے۔ ممو خاں نے کہا آج ملتوی کر دو کل
لے جانا۔ بعد یہ خبر احمد اللہ شاہ معروف بہ نقارہ شاہ کو ۱۹ر نومبر ۵۷ء کو پورے طور سے پہنچ گئی
انھوں نے بول پلٹن کے تلنگے بھجوا دیئے انھوں نے آ کر ممو خاں اور شرف الدولہ
وزیر اعظم پر بندوقیں رکھ دیں اور دریافت کیا آر صاحب کہاں ہیں اس وقت
دارو غہ واجد علی اسی بند و بست کے لیے خود وہ محل کے پاس منصور نگر گئے ہوئے تھے
اس لیے اُن پر کوئی آنچ نہ آئی۔ حضرت محل مادر برجیس قدر اور نواب شرف الدولہ
نے بھی اس معاملہ میں بہت ہاتھ پیر مارے مگر شاہ جی نے ایک نہ سُنی اور کہا انھیں
مراعات سے معاملہ طول کھینچتا جاتا ہے اور فتح یابی میں دیر ہو رہی ہے اس روز
تلنگے صبح ہی کو آ گئے تھے۔ کپتان آر تاڑ گئے کہ تلنگے آ پہنچے۔ وہ اس مکان سے
بقول مصنف قیصر التواریخ از راہ تہوری خود باہر نکل آئے۔ تلنگے اُن کو شاہ جی کے

پاس لے گئے۔ شاہ جی نے آر صاحب سے سوال کیا تم بہت تندرست اور تیار ہو۔
قید میں اذیت نہیں اٹھائی۔ مکان بھی میز کرسی وغیرہ سے خوب آراستہ تھا
اس عیش و آرام سے تمھیں کون رکھتا تھا۔ اس کا نام بتاؤ۔ جواب دیا مجھے نام تو نہیں
معلوم مگر ایک جمعدار اور داروغہ اکثر میرے پاس آیا کرتے تھے۔ تلنگوں نے کہا بہتر یہی
ہے کہ سچ بتا دو ورنہ ہم سے کوئی امید نہ رکھو جب تارہ والی کوٹھی (حال امپیریل بینک)
کے قریب پہونچے اور شاہ جی بھی متواتر یہی دریافت کرتے رہے تو ایک تلنگے نے صاحب
کے بازو میں گولی مار کر کہا اب بھی خیریت ہے اگر اس کا نام بتا دو گے تو ہم تمہیں چھوڑ
دیں گے ورنہ جان سے مار ڈالیں گے چنانچہ چاروں انگریزوں کو کوٹھی کے سامنے
قصہ سر شارع عام ختم کر دیا۔ کپتان آر اس وقت بھی بڑی بیباکی سے کلمات
سخت و سست تلنگوں کو کہتے جاتے تھے مگر وہ ایک گولی مار کر ٹھہر جاتے تھے
تاکہ انھیں سخت اذیت پہونچے آخر کار آٹھ گولیاں کھا کر گر پڑے اور ٹھنڈے ہو گئے
اس کے بعد پانچ دن تک داروغہ واجد علی کی تلاش رہی مگر وہ روپوش ہو گئے
دیوان اننت رام بھی پوشیدہ طور پر اپنی جان بچا کر فرار ہو گئے، شہر میں گھومتے
گھومتے ایک دن عیش باغ پہونچے جہاں راجہ مان سنگھ کے جوانوں کا پڑا تھا۔
ورنہ یہ تدبیر ہو چکی تھی کہ بیک وقت خاص یہ سب لوگ کہاروں کی ڈاک میں شاہ گنج
روانہ ہو جائیں۔ وہاں تک کہاروں کی ڈاک بھی بٹھا دی تھی بلکہ اس سے زیادہ یہ
تدبیر کی تھی کہ پاسیوں سے عقب کوٹھی نواب روشن الدولہ سرنگ بھی دلوا دی تھی
تاکہ اس میں سے اسیروں کو بلا تکلف نکال لے جائیں مگر غدر گ اجل چل چکا تھا۔
سب بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔

داروغہ واجد علی نے پانچ سو روپے کی اشرفیاں اور ایک عرضی شاہ جی
کے پاس بھیجی کہ آپ کے تلنگے ناحق میری جان کے درپے ہو گئے ہیں۔ چاہتے ہیں

کسی حیلہ سے میرا کام تمام کر دیں، مجھ پر محض بہتان تراشی کرتے ہیں بغیر آپ کی نوازش کے میرا بچنا محال ہے اُمیدوار ہوں ایک پروانۂ امان عنایت ہو اُس کے وسیلے سے میری جان بچ جائے گی۔ شاہ جی نے پروانہ بھیج دیا۔ داروغہ صاحب اپنے کاروبار میں مشغول ہو گئے جب کپتان آر اور اُن کے ساتھی گولی سے اُڑا دیے گئے تو بقول مصنف قیصر التواریخ انگریزوں کا بچنا محض قدرت خدا سے ہوا ورنہ مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی لے جا کر ختم کر دیتے۔

آر صاحب کی بیوی وغیرہ قیصر باغ کے گوشۂ عافیت میں بچ رہی تھیں چنانچہ ایک روز میم صاحبوں نے کہا اس مکان سے ہمیں کسی اور دوسرے مکان میں لے جا کر رکھیے یہاں ہمیں بہت تکلیف ہوتی ہے۔ محمد بیگ کمیدان کے سپاہی انھیں کچھ اذیت دیتے تھے چنانچہ اُن کے بجائے پرتلے والوں کا پہرہ مقرر ہو گیا۔ بعد قتل آر صاحب انگریزنیں تین دن تک اسی کنج قفس میں بے آب و دانہ رہیں کسی نے خبر تک نہ لی کیونکہ جو اُن کے حامی و مددگار تھے اُن کو خود اپنی جان کے لالے پڑے تھے۔ ایک سپاہی نے اُن کے حالِ زار پر ترس کھا کر عیش باغ میں دیوان اننت رام سے کل قصّہ بیان کیا تو انھوں نے کچھ میوہ مصری اور زرِ نقد بھیج کر بہت تسلی اور تشفی کہلا بھیجی اور اُس سپاہی کو بھی کچھ انعام دیا اور پھر کمر ہمّت باندھ کر اُن کی رہائی کے لیے سرگرم عمل ہوئے۔ دربار میں داروغہ واجد علی کو ہمراز سمجھ کر یہ تدبیر کی کہ دختر آر صاحب کو بیمار خود ساختہ بنایا اور صحت الدولہ حکیم سید علی خاں کو بھی ہموار کر لیا۔ لڑکی کا نام "عباسی" رکھ کر داروغہ واجد علی نے اس کو سمجھا دیا کہ جب ممو خاں یا کوئی اور شخص یہاں آئے تو تم اُس وقت اپنی صورت اور حالت بیماروں کی ایسی بنا لینا چنانچہ حکیم صاحب نے حسب مشورہ ممو خاں سے جا کر کہا کہ عباسی ایسی بیمار ہے کہ کل تک مجھے بچتی نظر نہیں آتی ممو خاں نے علاج کو کہا داروغہ صاحب نے اننت رام سے کہا کہ

اسے کسی حکمت سے انگریزوں کے پڑاؤ میں عالم باغ بھجوانا مناسب ہے دوسرے روز
داروغہ صاحب نے معرفت حکیم صاحب ممو خاں سے کہلا بھیجا کہ جو لڑکی کل بیمار تھی وہ
آج چل بسی ہم نے اُسے دفن کرا دیا۔ جواب دیا اچھا کیا۔ جب انت رام اپنی حکمت عملی
سے اُس لڑکی کا جنازہ بنا کر قیصر باغ سے نکلے تو اُسے اپنے ہاتھی میں چھپا کر
خوشی خوشی اپنے ہمراہیوں سمیت لے چلے جب جنہٹ پر پہونچے تو دفعتاً پچاس سوار ولا
نے آکر گھیر لیا اور دریافت کیا تم کون ہو اور کہاں جاتے ہو اس وقت دیوان جی کے
اوسان خطا ہو گئے اور ہکا بکا ہو کر رہ گئے مگر فوراً ہی ہوش و حواس درست کر کے لڑکی
کو ہوشیاری سے اپنے لحاف میں لپیٹا اور مثل گاؤ تکیہ بنا کر اپنے معتمد کہار کو بھینکا کہ کر
دیدیا۔ کہار لڑکی کو بچھونے کے ساتھ بغل میں دبا کر چلتا بنا۔ دیوان جی نے ہاتھی سے اتر
کر بہت سی گفتگو کے بعد پچاس اشرفیاں اُن سواروں کو دے کر نجات حاصل کی
وہاں سے حیدر گڈھ کو روانہ ہوئے کہ اپنے علاقہ میں پہونچ جائیں۔ راستہ میں لڑکی کی
طرف سے خلجان ہوا حالت اُمید و بیم ہو گئی کہ میری کوششوں پر پانی پھرا جاتا ہے۔
معلوم نہیں اس پر کیا گذری زندہ ہے یا راہ میں نصیب اعدا ہو گئی۔

دوسرے دن وہ باوفا کہار حاضر ہوا۔ پہلے اپنی امانت کو پوچھا جواب دیا کہ
کوس بھر پر ایک گاؤں میں صحیح و سلامت چھوڑ آیا ہوں راہ میں خدا نے ہر آفت سے
بچایا۔ دیوان جی اُسی وقت جا کر لے آئے، کھانا کھلایا پھر جنرل اوٹرم کو کل حالات
کی اطلاع کی۔ جواب سے سرفراز ہوئے اور بہت نیک نامی حاصل ہوئی اور بعد تسلط
وہ لڑکی اپنی بچھڑی ہوئی ماں سے جا ملی۔

مس صوفیہ دختر مسٹر کرسچین کمشنر خیر آباد عمری چار سال بحالت اسیری قیصر باغ
میں ہیضہ وبائی کی نذر ہو گئی اُسے وہیں سپرد خاک کر دیا اب قیصر باغ میں صرف
کپتان آر کی بیوی اور مسٹر جیکسن کی دختر مس میری جیکسن رہ گئیں۔

بقول سید کمال الدین حیدر مصنف قیصر التواریخ پہلے داروغہ واجد علی کو بھی بسنت کی خبر نہ تھی۔ فی الحقیقت سبھوں کو اس ثروت و حکومت نا پائدار کا نشہ ہو گیا تھا ایک روز ایک خیر اندیش نے از راہ عاقبت اندیشی اُن کو سمجھایا کہ تم کس خیال خام میں مبتلا ہو اگر کسی صورت سے ان اسیروں کی جان بچاؤ گے تو صورت عافیت پیدا ہونے کے علاوہ سرکار انگریزی کے بڑے خیر خواہ قرار پاؤ گے۔ ہم نے تمھارے کان کھول دیے آگے تمھیں اختیار ہے۔ داروغہ صاحب نے یہ اشارہ پا کر اور دربار کا رنگ دیکھ کر ممو خاں اور جناب عالیہ والدہ مرزا برجیس قدر کو سب نشیب و فراز اس طرح سمجھانے کہ اگر یہ اسیر بچ جائیں گے تو کیا عجب ہے کہ بادشاہ کی بھی اسی حیلہ سے قلعہ کلکتہ سے رہائی ہو جائے بس یہ ہونا چاہیے کہ نواب شہنشاہ محل آپ سے ظاہرا طور پر لڑ کر شہر میں کسی مکان میں اُٹھ جائیں اور یہ بی بیاں بھی انھیں کے ساتھ چلی جائیں اس صورت سے افشائے راز نہ ہونے پائے گا ورنہ اُن کی اور ان کے حامیوں کی کسی طرح جان نہ بچے گی۔ چنانچہ ایک روز حسب قرارداد جناب عالیہ اور شہنشاہ محل میں خوب جنگ زرگری ہوئی جس کی خبر کوچہ و بازار تک پہونچ گئی۔ اسی روز صبح کو شہنشاہ محل، سلطان محل، خورد محل، دلربا محل، وغیرہ کا اسباب قیصر باغ سے اکبری دروازے کے قریب آغا مرزا کے مکان میں پہونچ گیا اور یہ سب بیگمیں وہاں جا کر کرایہ پر رہیں۔ وہ اسیر بی بیاں بھی انھیں کے ساتھ پردے میں صحیح سلامت چلی گئیں۔ داروغہ واجد علی نے خواتین سے عرض کیا کہ آیا ہمیں کوئی اُمید آپ سے رکھنی چاہیے یا نہیں۔ ہم نے اپنی جان کو جوکھم میں ڈال کر بامید صلہ آپ کا ساتھ دیا ہے انھوں نے جواب دیا ہم تمھارے اور ان بیگموں کے بہت احسان مند ہیں ہم اپنے مکان پھر تمھارے اور ان بیگموں کے لیے کوئی بات اٹھا نہ رکھیں گے لیکن اب مناسب یہ ہے کہ یہاں سے کسی اور مکان میں لے جا کر رکھیے۔ یہ مقام ناف شہر ہے

ایسا نہ ہو بلوائیوں کا شور و شر زیادہ ہو جائے چنانچہ وہاں سے منتقل ہو کر منصور نگر میں اکبر علی خاں کے مکان میں جا کر رہیں یہاں سے اُن خواتین نے اپنی سرگذشت لکھ کر جنرل اوٹرم کو ایک گوئندے کے ہاتھ بھیجی اور یہ ہدایت بھی کر دی کہ اس تھیلی کے ہلانے سے انگریزی مواجہ سے بہ سلامت گزر جائے گا وہ چٹھی جنرل مذکور کے ہاتھ میں پہونچ گئی تو اس گوئندہ کو رخصت کر دیا۔ رات کے وقت ایک دوسرا گوئندہ فقیر کے بھیس میں اُس کا جواب لایا۔ اس روز سے خیمہ نامہ و پیام دار وغہ واجد علی کی وجہ سے جاری ہوا انہوں نے دربار کی حاضری ناسازی مزاج کا حیلہ کر کے کم کر دی۔

اُدھر سے مایوسی ہوئی اِدھر سے اُمید بندھی۔ جب جنرل اوٹرم کو میم صاحبوں کی اسیری اور اُن کے ماحول کا مفصل حال معلوم ہوا تو دیوان اننت رام کی معرفت کہلا بھیجا کہ اگر یہ اسیر بچ جائیں گے تو تمہیں لاکھ روپیہ انعام میں ملے گا۔ اننت رام نے کہا اگر آپ کے ارشاد کا یقین نہ ہو۔ فرمایا اُن کی عرضی لاؤ ہم پروانہ دیں گے۔ غرض دار وغہ صاحب نے عرضی لکھی کہ محلات واجد علی شاہ مجھ سے متعلق ہیں اُمیدوار ہوں جو میرے ساتھ ہوں اُن سب کی جاں بخشی کی جائے اور انشاء اللہ آپ کی امانت آپ تک بسلامت پہونچے گی جب یہ عرضی پہنچ گئی تو حسب معروضہ پروانہ آگیا اور یہ بھی فرمایا کہ جاں بخشی کے علاوہ تم کو ایک لاکھ روپیہ انعام ملے گا اس کی ادائی میں ہرگز تساہل نہ ہوگا بشرطیکہ میم صاحبوں کی جان بچاؤ گے جب اننت رام نے پروانہ دیا تو دار وغہ صاحب کا دل فرط مسرت سے باغ باغ ہو گیا مگر پھر مرجھا بھی گئے کہ اگر تلنگوں کے کانوں میں بھنک پڑ گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے چنانچہ دیوان جی سے کہا تم اپنے پاس اس کو چھپا کر رکھو کل میرے مکان پر مجھے دیدینا۔

نواب خورد محل نے بہ نظر احتیاط دونوں خواتین کو کو ٹھے کے کمرے میں سب سے علیحدہ رکھا تھا اور کھانا وغیرہ بھی خود لے جا کر اُن کو کھلاتی تھیں تاکہ کسی خادمہ کو

کچھ کسی کو نہ ملنے پائے۔

جب احمد اللہ شاہ نے درگاہ حضرتِ عباس میں آکر مورچہ قائم کیا تو یہ مقام منصور نگر سے جہاں صاحباتِ محل مقیم تھیں بہت قریب تھا۔ چنانچہ داروغہ واجد علی نے دو لوں خواتین سے ایک چٹھی لکھوائی کہ ہم داروغہ واجد علی کے مکان میں ہیں۔ یہاں بھی شورش کنندہ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ یہ چٹھی جن صاحب کی نظر سے گزرے وہ فوراً مع فوج آکر ہم کو یہاں سے لے جائیں۔ داروغہ صاحب نے یہ چٹھی ایک شخص کو بیس روپے دے کر بھیجی، راستہ میں اکبری دروازے کے قریب دو نیپالی افسر ملے اُن کو چٹھی دے دی گئی وہ دو کمپنیاں لے کر آموجود ہوئے اور خواتین کو اپنی حفاظت میں لے گئے۔

میموں کو رخصت کرتے وقت خود محل نے ان کو بھاری پُر تکلف پوشاکوں اور سادے لباس و زیورات کی کشتیاں پیش کیں۔ اُنھوں نے سادہ لباس پہن لیا اور ایک مرصع طوق و بجلیاں و جہانگیریاں لے لیں اور داروغہ صاحب کی پینس میں سوار ہو کر روانہ ہو گئیں فقط ایک نیپالی گارڈ برائے حفاظت رہ گیا۔ اس کے بعد خبر پاکر بلوائیوں نے گھر کو گھیر لیا۔ داروغہ صاحب نے پھاٹک پر قفل لگا دیا کہ اگر یورپین کے مکان میں داخل ہو جائیں گے تو کسی کو زندہ نہ چھوڑیں گے۔ گارڈ کو کوٹھے پر چڑھا دیا کہ سب طرف گولیوں کی بھرمار کردو۔ بلوائی سمجھے کہ یہاں فوج مقیم ہے اسوجہ سے خاموش ہو کر بیٹھ رہے۔

جب انگریز خواتین لشکر راجہ جنگ بہادر والی نیپال میں پہنچیں تو اپنا کل ماجرا صاحب سے بیان کیا وہاں سے دو پلٹنیں اور کئی انگریز افسر اس مکان پر آکر اسی وقت صاحباتِ محل اور دوسری عورتوں کو سوار کرا کے لشکر میں لے گئے جہاں ولائتی خواتین فروکش تھیں جنگ بہادر نے سبھوں کو ایک علیحدہ خیمہ میں اُتار کر بہت

خاطر تواضع کی ہزار روپے دعوت کے بھیجے۔ ہم صاحبوں نے دارو غہ صاحب کی ملاقات راجہ جنگ بہادر سے کرا دی ما بعد کمانڈر انچیف سے ملاقات ہوئی انھوں نے محلات کی بہت تشفی کی تیسرے دن دار و غہ صاحب کی معرفت آر صاحب پسر کپتان آر صاحب مقتول جنرل اوٹرم ( ) کی خدمت میں حاضر ہوئے

صاحب نے کھڑے ہو کر اُن کی مزاج پرسی کی اور بہت دل دہی کے بعد فرمایا کہ سرکار سے لاکھ روپیہ تم کو انعام ملے گا اور ایسی پرورش ہوگی جو تمھارے وہم خیال سے باہر ہوگی۔ دار و غہ صاحب نے محلات کے واسطے عرض کیا کہ جاگیر و تنخواہ و نوٹ وغیرہ سب اُن کو ملیں اور اُن کی رعایت ہر صورت کی جائے پھر اوٹرم صاحب نے ایک چٹھی لکھ کر اُن کے حوالہ کی کہ بتا کیداً حکم دیا جاتا ہے کہ فرد سپاہ سے کوئی شخص دار و غہ واجد علی کے گھر پر نہ جائے اور اُن کے متعلقین کو بھی کوئی نہ ستائے یہ لوگ خیر خواہ اور متوسل سرکار انگریزی ہیں اور ایک چٹھی بنام افسران فوج انگریزی بھی تحریر کر دی کہ حسب ہدایت آر صاحب گوروں کا پہرہ مقرر کر دیں۔ آر صاحب نے گولا گنج میں محترم اور محبوب خواجہ سراؤں کے مکانات خالی کرائے اور محلات کو لشکر جنگ بہادر سے لے جا کر انھیں مکانوں میں ٹھہرایا اور گوروں کا پہرہ مقرر کر دیا تین دن کے بعد دار و غہ واجد علی قمر قدر مرزا محمد عابد علی عمری سات سال پسر سلطان عالم کو لے کر جنرل اوٹرم کے پاس گئے صاحب نے حسب معمول تعظیم و تکریم کی اور بہت سے کلمات تشفی ارشاد کر کے دار و غہ صاحب سے فرمایا کہ سب محلات اور ملکہ جہاں کو تمھارے سپرد کیا۔ سب کی دار و غگی تم کو دی جاتی ہے اور نواب خاص محل کی والدہ براتی خانم کو بھی تم اپنے پاس رکھو۔ شہزادہ کو گود میں بٹھا کر بہت پیار کیا اور وعدہ کیا کہ تمھاری تنخواہ بھی مقرر ہو جائے گی پھر رخصت کر دیا۔

دار و غہ واجد علی کے پاؤں میں گھوڑے سے گرنے کی وجہ سے چوٹ آگئی تھی

اس وجہ سے چیف کمشنر کے پاس نہ جا سکے اور موصوف کلکتہ روانہ ہو گئے اُن کے بجائے
مونٹ گمری صاحب (Mount Goamery) مقرر ہو کر آئے منشی رام
دیال تحصیلدار نے اُسی اتہام سے کارنیگی (Carnegy) صاحب سے کہا کہ داروغہ
نے اور محلات باغیہ کو بھی اپنے گھر میں پناہ دی ہے پس مناسب ہے کہ اُن کے گھر پر دوڑ
جائے اور سب اسباب لوٹ لائے۔ صاحب نے کہا تم دوڑ لے جاؤ مگر داروغہ کے گھر
پر نہ لے جانا اُن کے پاس اڈرم صاحب کی چٹھی موجود ہے۔ باعث بدنامی ہوگا۔ تحصیلدار
نے کہا اُسے کوئی نہ پوچھے گا میرا ذمہ ہے چنانچہ ایک دن ولیم صاحب کپتان ہاتھیس صاحب
اور خود تحصیلدار مع ایک کمپنی گورہ آئے اور داروغہ صاحب اور جتنے آدمی اس مکان میں
تھے سب کو قید کر لیا دوسرے دروازے سے گورے خورد محل و سلطان محل کے مکان میں
روانہ چلے گئے بہت سا اسباب اُس مکان کا لوٹ لیا کارنیگی صاحب نے آکر کہا چیف کمشنر
صاحب کا حکم یہ ہے کہ اُن کا اسباب کسی طرح نہ لٹنا چاہیے۔ اسباب پر مہر کرا دو ہم گورنر
جنرل کو لکھتے ہیں جیسا حکم ہوگا اس پر عمل کیا جائے گا۔ گوروں نے جو لوٹ رہے تھے
ان پر خفا ہو کر کچھ اسباب اُن سے چھین بھی لیا اور بیگموں سے تخلیہ مکان کرا لیا۔ وہ سب
احاطہ فقیر محمد خاں میں جا کر رہیں وہاں بھی پہرہ قائم ہو گیا۔ دوسرے دن کارنیگی صاحب
چیف کمشنر کی چٹھی لائے بہت دلاسا دے کر گوروں کا پہرہ اُٹھا دیا اور اسباب پر مہر
کر کے کوتوالی میں رکھوا دیا۔

جب داروغہ صاحب چیف کمشنر کے پاس گئے انھوں نے بڑی خاطر کی اور
گورنر جنرل کو چٹھی لکھی۔ وہاں سے اسباب کی واپسی کا حکم آیا۔ چیف کمشنر نے بھی ایسا ہی
حکم صادر کر دیا کہ اڈرم صاحب نے چٹھی دے کر معاف کر دیا ہے۔ یہ مال اسباب و اثاث
لوٹا نہیں ہے فوج نے دیں گی کہ یہ حق پناہ ہے ہم نہ دیں گے مگر یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو

کل اسباب محلات کو واپس کر دیا گیا۔ داروغہ صاحب کو سرکار سے لاکھ روپیہ بطور انعام ملا۔ انھوں نے ایک دوست کے سمجھانے سے گورنمنٹ پرامیسری نوٹ خرید کیے اس سبب سے زر اصل پر سات ہزار بابت فیر پڑھے کئی مواضعات خریدے اور بقول سید کمال الدین حیدر صاحب نصیب تھے ہر وقت میں اچھے رہے۔

سید محمد کاظم بھی اپنے خود نوشت حالات "موسومہ سوانح عمری محمد کاظم" میں داروغہ واجد علی کے انعام و اکرام کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"میر واجد علی نہایت دخیل کار و کارگزار بودند بعد رفع ایام غدر یک لکھ روپیہ و دیہات وغیرہ بہ میر واجد علی از سرکار انعام و در خیر خواہان سرکار محسوب شد"

یعنی داروغہ میر واجد علی سرکار انگریزی کے معاملات میں بہت دخیل اور سرگرم عمل تھے ہنگامہ غدر ختم ہونے کے بعد ایک لاکھ روپیہ اور مواضعات وغیرہ اُن کو سرکار انگلشیہ سے انعام میں ملے اور گورنمنٹ برطانیہ کے ہوا خواہوں میں اُن کا شمار ہوتا تھا مگر موصوف کے اہل خاندان راوی ہیں کہ مواضعات انھوں نے خود خریدے تھے عطیہ سرکار نہ تھے۔ بعد میں سرکار انگریزی کی عنایت و نوازش سے تعلقدار "اہا مئو" قرار پائے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے مراعات بھی اُس کے ساتھ کیے گئے بازار و دلی در اناج کے گنجوں اور شہ بازاری کے حقوق بھی اُن کو عطا کیے اُن کے بیٹے میر نظیر حسین نے اپنے نام پر امین آباد سے متصل محلہ نظیر آباد آباد کیا جواب لکھنؤ کا بہت آباد اور گلزار مقام ہے۔ حضرت واجد علی شاہ نے سلطان محل کو بزمانہ حکومت دو ہزار تین سو دو سو چھ کرہ آراضی مکتہ واقع خیالی گنج بھی بذریعہ فرمان شاہی عطا کی تھی۔ داروغہ صاحب اور سلطان محل گولا گنج میں یک ساتھ مقیم رہے۔ دونوں یک جان دو قالب ہو رہے تھے۔ ۱۹ شعبان ۱۲۷۵ھ کو موصوفہ نے پچاس ہزار روپے کے پانچ قطعہ

پرامیسری نوٹ اور جاگیر زمین داری جن کی آمدنی دو سو روپے ماہوار تھی اُسی کے ساتھ دس ہزار روپے کے جواہرات اور باغ و مکان مالیتی سات ہزار روپے "جلوس مہندی و مجالس و دیگر مذہبی اُمور کے لیے وقف کر کے ایک وقف نامہ باقاعدہ تحریر کر دیا۔ جس کی رو سے داروغہ میر واجد علی ولد میر عباس اور اُن کے بعد اُن کی اولاد وقف مذکور کی متولی قرار دی گئی۔ اپنی حیات بھر داروغہ صاحب خود مہندی اُٹھاتے رہے۔ موصوف نے ۱۴ دسمبر ۱۸۷۶ء کو انتقال کیا مگر مہندی ہر سال بموجب وقف نامہ ساتویں محرم کو بہت دھوم دھام سے سڑک نخاس سے اُٹھ کر گولا گنج کے امام باڑہ میں داروغہ صاحب کی ذریت کے زیر اہتمام جاتی ہے۔ داروغہ صاحب اور سلطان محل دونوں امام باڑہ گولا گنج میں مدفون ہیں۔ دیوان اننت رام کو بھی فیض آباد کی سرحدی پولیس کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ مسٹر آر کی دختر کی جان بچانے کے صلہ میں بارہ گاؤں بطور معافی عطا ہوئے۔ اور سرکار انگلشیہ کے ہواخواہوں کی فہرست میں اُن کا نام بھی شامل ہوا۔

جو بیگمیں دونوں انگریزوں کی جانیں بچانے میں معین و مددگار ہوئی تھیں سرکار انگلشیہ نے اُن کی بھی ہر صورت سے اعانت کی۔ ہنگامہ غدر فرد ہونے کے بعد داروغہ واجد علی نے ایک عرض داشت بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔ اُس میں مذکور تھا کہ "باغی مغلوب ہوئے انتظام سرکار انگلشیہ کما حقہ ہو گیا۔ میں نے جو کوششیں حفاظت متعلقان سرکار انگریزی کے لیے کیں اس کو خدا بہتر جانتا ہے۔ کمشنر صاحب نے میم صاحبوں اور بچوں کو اپنے پاس بلا لیا۔ آٹھ محل مبارک اس حفاظت میں میرے شریک حال رہے یعنی سلطان جہاں محل، شہنشاہ محل، امیر محل، فخر محل مع شہزادہ قمر قدر، اختر محل، مراد محل، سیدہ محل، خورد محل۔ کمشنر صاحب نے محلات متذکرہ کی آبادی کا حکم بھی دیدیا ہے۔ باقی محلات تباہ و پریشان اور دربدر سرگرداں و حیراں ہیں نہ پوشاک

ہے نہ سامان خوراک، مگر یہ سب بے قصور ہیں" گورنمنٹ آف انڈیا کے کاغذات محکمہ خارجہ کے (Foreign department) مطالعہ سے معلوم ہوا کہ سلطان عالم نے ایک جاگیر بھی جس کی تین سو چار اسی روپیہ سالانہ نواب فخر محل کو ۱۸۵۱ء میں عطا کی تھی اس کو بعد غدر چیف کمشنر نے سب سے پہلے اس بنا پر واگذار کر دیا کہ انھوں نے مسز آر اور مسز جیکسن کی جانیں بچانے میں بہت معاونت کی تھی اور سر چارلس ونگلفیڈ (Sir Charles Wingalfeild) کی خود نوشت چٹھی بھی اُن کے پاس موجود تھی جس میں اُن بیگمات کی بہت مدح و ثنا کی گئی تھی اور یہ بھی تحریر تھا کہ جب انگریز خواتین کی جانوں کے لالے پڑے تھے تو اُن بیگمات نے ان کی بہت حفاظت اور نگہداشت کی تھی۔

بعد وفات سلطان عالم بھی مسٹر پریڈاکس (W. F. Prideaux) ایجنٹ گورنر جنرل آف انڈیا نے اپنی پیش کردہ رپورٹ میں فخر محل کی نسبت لکھا تھا کہ یہ بیگم گورنمنٹ کی عنایت و نوازش کی بہت مستحق ہیں۔ شروع میں بادشاہ ان کو پانچسو روپیے اہوار دیتے تھے۔ پھر یہ رقم کم ہوتے ہوتے ڈیڑھ سو روپے تک آگئی تھی چنانچہ وہی ڈیڑھ سو روپیے ماہوار اُن کی پنشن کے مقرر ہوئے۔ اس میں کوئی کمی نہیں کی گئی اُن کے بیٹے قمر قدر پرنس عابد علی کو بھی جو شہزادوں میں باستثنا پرنس برجیس قدر سب سے بڑے تھے بادشاہ کا جانشین قرار دے کر اُن کی پنشن بھی سب سے زیادہ تین ہزار روپیہ ماہوار کی مقرر کی گئی۔

چتر محل

ایک شخص میر قربان علی نامی دھام پور ضلع بجنور کے رہنے والے آخری شاہ اودھ کی سرکار میں کسی ادنیٰ جگہ پر ملازم تھے۔ یہ شخص دروغ حلفی کا مرتکب ہوا۔ مزید بر آں شاہِ اودھ[1] کے خلاف جذباتِ نفرت و حقارت برانگیختہ کرتا رہتا تھا اور ہر قسم کی جھوٹی سچی خبریں ذاتِ شاہانہ کے متعلق خفیہ طور پر کرنیل سلیمن رزیڈنٹ اودھ کو پہونچایا کرتا تھا۔ اس لیے بادشاہ نے ناراض ہو کر ملک بدر کرنے کا حکم نافذ کر دیا مگر کرنیل سلیمن اس کی حمایت پر کمربستہ ہو گئے اور یکم فروری ۱۸۵۱ء کو بادشاہ کو لکھ بھیجا کہ منشی قربان علی ملاقات کی غرض سے میرے پاس آیا کرتے ہیں۔ آپ نے اُن کو ملک بدر کرنے کا حکم نافذ کیا ہے۔ اعلیٰ حضرت پر یہ امر روشن ہو جانا چاہیے کہ اگر آپ اپنے عزم پر قائم رہے تو میں بھی آپ کے وکیل سے ملاقات کرنے سے قطعی انکار کر دوں گا بلکہ گورنر جنرل کو بھی لکھ دوں گا کہ آپ کو یہ منظور نہیں ہے کہ آپ کا کوئی محکوم مجھ سے ملاقات کرنے آئے۔ ایسی صورت میں یہ بہتر ہوگا کہ رزیڈنسی توڑ دی جائے اور اودھ سے کل انگریزی فوج واپس بلا لی جائے۔ اس طرح منشی جی رزیڈنٹ کی عنایت و حمایت سے اپنی جگہ پر بدستور قائم رہے۔

صاحب قیصر التواریخ[2] ناقل ہیں کہ منشی قربان علی اور میجر کارنگی (۔ ۔۔۔ ۔۔۔) سٹی مجسٹریٹ ان دونوں نے لکھنؤ میں بالکل جھاڑو دیدی۔ غرض کہ جب منشی جی اور میجر صاحب نوٹوں کی خریداری میں بعلت جعل بعدالت ڈپٹی کمشنر دھرے گئے تو میجر صاحب با اطمینان ولایت تشریف لے گئے۔ جرمنی کے رہنے والے

۱؎ Dacity in Excelsis by Capt. Bird ص۳۳۲ جلد دوم ص۳۴۲۔

تھے منشی جی بعد روانگی میجر صاحب اپنے وطن مالوف میں بادشاہت کر رہے تھے۔ وہ بادشاہ کی ایک نوخیز اور دولت مند بیوی طاؤس بیگم مخاطب بہ "چتر محل"، کو اپنے ساتھ لکھنؤ سے لے گئے تھے۔ بعد ثبوت جرم منشی جی کو سات برس کی سزائے قید ہوئی الہ آباد کے جیل خانہ میں رکھے گئے۔ اپیل کرنے پر تین برس اور بڑھ گئے۔ اب پورے دس برس ہو گئے۔

میجر صاحب کی تحقیقات کے لیے کئی انگریز لکھنؤ آئے۔ اور طے پایا کہ اُن کے معاملات کی تحقیقات ولایت میں ہو۔ مگر ملازمت جاتی رہی۔

کمپنی صاحب کی رعایت دپرورش سے منشی جی کے لیے قید بھی تخفیف عذاب ہو گئی تھی۔ کپڑے بدلتے تھے۔ پلنگ پر سوتے تھے۔ فی الجملہ موافق جیل خانہ قیدیوں پر حکومت بھی تھی۔ جب سرکار سے اُن کے گھر میں نقد و جنس کی قرقی ہوئی تو بائیس لاکھ کا تخمینہ ہوا۔ اسی حساب سے اُن کے منیب کی دولت کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔

بعد غدر میجر کارنگی لکھنؤ کے سٹی مجسٹریٹ مقرر ہوئے۔ منشی قربان علی حسب سابق بحال ہوئے۔

مسٹر ٹی، ڈبلو، بیل (T. W. Beale) نے چتر محل کے حالات بالتفصیل لکھے ہیں وہ تحریر کرتے ہیں:۔

"چتر محل واجد علی شاہ کی ایک بیگم تھیں۔ قربان علی نام کا ایک شخص ایک معمولی جگہ پر ملازم تھا اور آخر میں برٹش گورنمنٹ کا رشتہ دار ہو گیا تھا۔ یہ شخص چتر محل سے شادی رچانے کے بعد دفعتًا امیر کبیر ہو گیا۔ اس نے پہلے اس نازنین اور کمسن بیگم سے محبت کے پینگ بڑھائے۔ پھر دونوں نکاح پر کمر بستہ ہو گئے مگر بیگم ایسے مقام پر جہاں بچہ بچہ اُن سے واقف تھا زربفت میں ٹاٹ کا پیوند لگانا پسند نہ کرتی تھیں اس لیے انھوں نے

پہلے چیف کمشنر سے زیارت بیت اللہ کی اجازت حاصل کی اس طرح جب وہ حدود لکھنؤ کے باہر ہو گئیں تو قربان علی بھی اُن سے جا ملے اور اپنے مکان بجنور لیجا کر دونوں سلک نکاح میں منسلک ہو گئے۔

ممتاز محل ثالث

تیسری بیگم جن کو ممتاز محل یا ملکہ تخت ممتاز محل کا خطاب عطا ہوا۔ وہ جانِ عالم واجد علی شاہ کی بیوی تھیں۔ اُن کا نام عالیہ بیگم تھا اور کشمیری محلہ لکھنؤ کی رہنے والی تھیں، اُن کے والد کا نام احمد علی خاں بتایا جاتا ہے۔ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد اُن کی ماں اُن کو اپنے ہمراہ بوجوہ کلکتہ لے گئیں۔ جہاں شاہ معزول نے اُن سے متعہ کر کے داخل حرم کر لیا۔ پھر صاحب اولاد ہونے پر ملکہ ممتاز محل کے خطاب سے ممتاز فرمایا۔ موصوفہ سے صرف ایک ہی صاحبزادے پیدا ہوئے۔ جن کا نام پرنس اکرم حسین تھا۔

بقول مصنف "صحیفہ زریں" شہزادہ موصوف ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے اور شاہ مرحوم کے بائیسویں فرزند تھے۔ آپ کا پورا نام مع خطاب فخر الملوک پرنس مرزا اکرم حسین بہادر تھا۔ ۱۸۹۰ء میں گورنمنٹ ہند نے آپ کو پرنس کا خطاب عطا فرمایا۔ شکل و شباہت میں آپ اپنے پدر نامدار سے بہت ملتے تھے مگر ایک بات میں آپ اُن کی بالکل ضد تھے۔ یعنی باپ نے تو سیکڑوں محل کیے مگر انھوں نے ایک شادی بھی نہ کی اسی وجہ سے لاولد تھے۔ ۱۸۸۷ء میں جب حضرت واجد

علی شاہ نے انتقال فرمایا تو گورنمنٹ نے آپ کے گزارہ کے لیے اٹھارہ سال
کی عمر تک کے لیے مبلغ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار اور اس کے بعد کے لیے مبلغ پانچسو
روپیہ ماہوار مقرر کیے۔ مگر تخمیناً ۱۹۳۰ء سے بجائے پانچ سو روپیہ ماہوار کے
پندرہ سو روپیہ ماہوار کر دیے گئے تھے۔ بوقت انتقال سلطان عالم آپ کی
عمر صرف چھ برس کی تھی۔ تخمیناً ۱۹۳۲ء میں موصوف شیعہ پولیٹیکل کانفرنس کے
صدر ہو کر لکھنؤ تشریف لائے تھے۔ آپ نہایت ہی منکسر المزاج، صاحب اخلاق
نیک نفس و بے تعصب بزرگ تھے۔ اور شیرف ([illegible]) کلکتے
اور وائسرائے ہند کی کونسل کے نامزد شدہ ممبر بھی رہ چکے تھے۔ کلکتہ میں اپنی عالی
شان کوٹھی افسر منزل نامی میں بمقام بالی گنج سرکلر روڈ تشریف رکھتے تھے۔ انگریزی
بولنے میں آپ کو بہت مہارت تھی اور لہجہ بھی بہت عمدہ تھا۔

سلطان عالم کی وفات کے بعد بموجب اخبار ایڈوکیٹ مورخہ ۵ اگست ۱۸۸۷ء
گورنمنٹ نے واجد علی شاہ مرحوم کی بیگموں کو بلحاظ خاندانی مراتب آٹھ درجوں میں
تقسیم کر کے مبلغ گیارہ ہزار پچاس روپیہ ماہوار کی پنشن مقرر کی۔ ان میں سے آٹھ
بیگمات (۱) ملکہ تخت ممتاز محل (۲) نواب صنوبر محل (۳) نواب عیش محل
(۴) نور افروز محل (۵) خوش حال محل (۶) ہمایوں محل (۷) ملکہ شاہ نواب
افروز محل (۸) و ملکۂ عالم ماہ افروز محل کو درجہ سوم میں جگہ دی گئی جن کے لیے
مختلف رقموں کے گزارے مقرر ہوئے ملکہ ممتاز محل کو ایک سو تیس روپیہ ماہوار
عطا ہوئے۔

تخمیناً ۱۸۸۹ء میں موصوفہ نے منشی عبد اللطیف دبیر الدولہ مرحوم کے
منجھلے پسر عبد الحق اخلاص الدولہ سے عقد ثانی کر لیا جن سے دو صاحبزادے

سے بمقام مارسڈن اسٹریٹ (Marsden Street)، کلکتہ ہوا۔ لاش مٹیا برج میں دفن کی گئی، وہیں ان کی والدہ کی قبر بھی ہے۔ پرنس اکرم حسین نے بھی بمقام کلکتہ سنہ ۱۹۴۰ء میں اس سرائے فانی کو خیرباد کہا۔

—— : —— : ——

پبلشر

کتاب نگر، دین دیال روڈ

لکھنؤ

سنہ ۱۹۵۶ء

مطبوعہ

سرفراز پریس لکھنؤ

قیمت

(تین روپے)